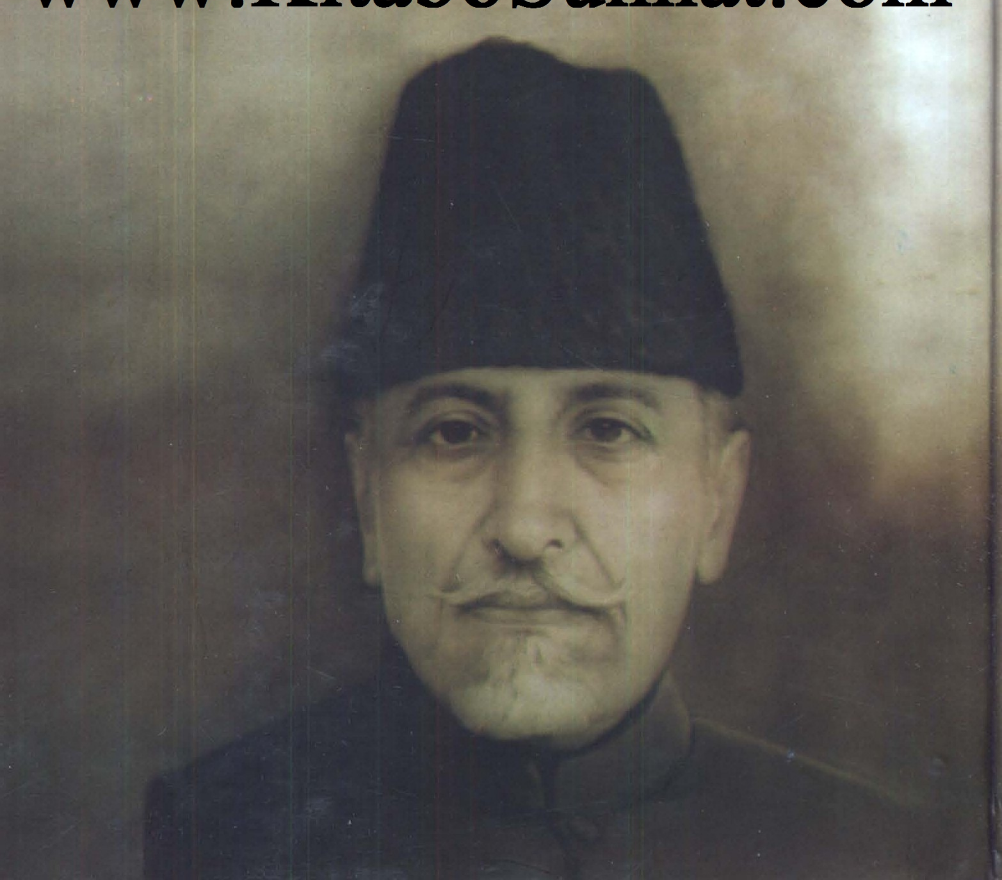
ذکرِ آزادؒ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رفاقت میں (۳۸) اڑتیس سال

عبدالرزاق ملیح آبادی



ذکرِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت میں اڑتیس ۳۸ سال

بتعاون جمعیت اہل حق (رجسٹرڈ)

مرتبہ

عبدالرزاق ملیح آبادی

مکتبۂ جمال
تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 7232731 Mob: 0300-8834610
Email: maktabajamal@yahoo.co.uk
maktaba_ jamal@email.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: .... ذکر آزاد

مصنف : .... مولانا ابوالکلام آزادؒ

مرتبہ : .... مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

اہتمام : .... میاں غلام مرتضیٰ کھٹانہ

ناشر: .... مکتبہ جمال ٥ لاہور

مطبع: .... تایا سنز پرنٹرز ٥ لاہور

سن اشاعت: 2010ء

قیمت: .... 320 روپے

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جمال

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Cell: 0300-8834616/ Ph: 042-37232731

maktabajamal@yahoo.co.uk

mjamal66@gmail.com

فہرست

عرض ناشر

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی دلچسپ کتاب ذکر آزاد میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے احباب کا ذکر جوش وخروش سے کیا اور خوب کیا لیکن کتاب میں ان کا اپنا ذکر اس قدر کم کم ہے کہ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے ایسے لگتا ہے جیسے آزاد کا ذکر ہی ان کا ذکر ہو، ایسے میں جی چاہا کہ بارے ان کے کچھ ذکر الگ سے ہو جائے تا کہ قارئین کو پتا چلے کہ آزاد کی کہانی سنانے والا خود بھی کیسا آزاد منش ادیب تھا، جس نے علمی اور عملی طور پر ایک بھر پور اور مشکل زندگی گزاری اگر کہا جائے کہ وہ آزاد کے سب سے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھا تو ''ذکر آزاد'' کو ایک نظر دیکھنے والے گواہی دیں گے کہ دریں چہ شک مولانا ملیح آبادی کا تعلق ایک علمی اور دینی گھرانے سے تھا اس لیے وہ عمر بھر ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہے ثبوت کے لیے عرض ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خلوت اور جلوت کے ساتھی تھے۔ یہاں ایک قدر اور مشترک وہ یہ کہ مولانا آزاد کے والد گرامی کا شمار برصغیر کے مشہور ومعروف صوفیاء میں ہوتا تھا اور ادھر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے والد محترم عبدالحمید خان حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی راہ خود الگ نکالی اور آزاد بن کر دین مبین کی ترویج واشاعت کا محبت بھرا رس عوام کے دلوں میں گھولتے رہے ایسے میں عبدالرزاق ملیح آبادی کی مرشد کے لیے نگاہ انتخاب مولانا آزاد پر پڑی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اس دور کی روایات کے مطابق آپ کے بزرگوں نے آپ کی پرورش دینی تعلیم ہی سے شروع کی۔ باقاعدہ تعلیم کے لیے ندوۃ العلماء میں داخل کرائے گئے۔ آپ ندوۃ العلماء لکھنو کے ہونہار اور ہوشیار طالب علم تھے۔ ندوہ سے فراغت کے بعد مصر گئے جہاں انہیں وہاں علامہ رشید رضا کی صحبت صالح کا شرف بھی حاصل ہوا بلکہ دارالدعوۃ والا رشاد میں پڑھنے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔ اسی علمی اور تعلیمی مہم کے دوران ایک دن ترکی جا پہنچے۔ وہاں بھی پڑھتے لکھتے اور سوچتے رہے۔ اسی دوران حجاز بھی گئے، ۱۹۱۸ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ مولانا نے شروع

ہی سے ایک سیمابی طبیعت پائی تھی۔ اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں شامل جاں فروشوں اور سوختہ جانوں کے لشکر میں پیش پیش رہے، مولانا آزاد سے محبت اور نسبت کی استواری اسی جذبہ محکم کی پیداوار تھی جب وہ ان کے قریب آ گئے تو پھر عمر بھر یک جان، یک قالب رہے خصوصاً ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۸ء کا عرصہ تو اس رفاقت کا ایک یادگار عرصہ ہے۔

۱۹۲۸ء کے بعد جب وہ مولانا آزاد سے الگ ہوئے اور ایک نئی اور خودمختار زندگی شروع کی تو وہ ایک کامیاب قلم کار کی حیثیت سے ہندوستان کے علم وادب اور صحافت کے افق پر ایک قطبی ستارے کے طور پر نمودار ہوئے اور دیر تک چھائے رہے۔

دینی اور ادبی محافل کا یہ خورشید کینسر کے حملے سے جانبر نہ ہو سکا اور ۱۹۵۴ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

(میاں مختار احمد کھٹانہ)

اپنی بات

"ذکر آزاد" .... میرے مرحوم والد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی آخری کتاب ہے۔ یہ کتاب پوری کر کے ان کا قلم ہمیشہ کے لیے رک گیا۔ ۲۴ جون ۱۹۵۹ء کی صبح کو بمبئی کے ٹاٹا میموریل ہسپتال میں کینسر نے ان کی جان لے لی۔ وہ ۶۴ سال کی عمر میں ہم سے جدا ہو گئے اور زندہ رہتے تو ان کے قلم سے اور کئی مفید کتابیں نکلتیں، ان کے علم و فضل سے ملک کو اور فائدہ پہنچتا۔ بستر مرگ پر ان کی یہی حسرت تھی کہ موت سے تھوڑی مہلت اور مل جاتی تو دو خاص کام انجام دے دیتے۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید سے مرتب کر دیتے اور مولانا آزاد کے "ترجمان القرآن" کی تیسری جلد خود مکمل کر دیتے۔ قرآن مجید سے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب شروع بھی کر دی تھی۔ ہسپتال کے بستر پر آخری نیند سونے سے چھ گھنٹے پہلے تک قرآن کا مطالعہ کرتے رہے اور نوٹ تیار کرتے جا رہے تھے لیکن افسوس، کام پورا نہ ہو سکا!

مرحوم باپ کی آخری تصنیف کی اشاعت پر ایک ساتھ دو کیفیتیں دل پر چھا رہی ہیں۔ اس کی خوشی ہے کہ مرحوم باپ کی آخری تصنیف کو قارئین تک پہنچانے کی ذمہ داری اللہ نے پوری کرا دی اور یہ سوچ کر دل رو رہا ہے کہ والد نے جان لیوا بیماری کینسر کی ناقابل بیان تکلیف میں اس کتاب پر دن رات جتنی محنت کی اور جان کھپائی، اسے اپنی آنکھوں سے شائع ہوتے نہ دیکھ سکے۔ انہیں بڑی عجلت تھی کہ کتاب جلد شائع ہو جائے مگر والد کی لگاتار بیماری اور تشویش ناک حالت سے میرے حواس ٹھکانے نہیں تھے۔ ذرا بھی اطمینان و مہلت کا موقع میسر نہ آیا کہ اس وقت کتاب کی اشاعت پر توجہ کی جاتی۔ میری اپنی حالت تو یہ تھی کہ کتاب کا مسودہ بھی والد کی وفات کے بعد ہی پڑھ سکا۔ ایک پل کے لیے بھی بیمار باپ کی خدمت سے ہٹنے اور دوسری طرف توجہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

"ذکر آزاد" .... مولانا ابوالکلام آزادؔ کی دوسری برسی پر شائع ہوئی ہے۔ یہ موقع میرے لیے دُہرے غم کا ہے۔ مولانا اور والد کے تعلقات کیسے تھے، یہ کتاب سے معلوم ہوگا۔ اس

تعلق سے مولانا میرے مربی، شفیق بزرگ تھے۔ ان کی محبت و شفقت کی اَنمِٹ یادیں دل پر نقش ہیں۔ کتاب کی اشاعت پر باپ کی جدائی کے غم کے ساتھ مولانا کے سایہ بزرگی سے محرومی کا صدمہ بھی تازہ ہوگیا ہے۔

یہ کتاب میں نے اپنا فرض سمجھ کر شائع کی ہے جو اپنے والد کا مجھ پر تھا لیکن کیسے کہوں یہ فرض کما حقہ ادا ہوگیا۔ کتابیں شائع کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ یہ پہلی کتاب میرے اہتمام میں شائع ہوئی ہے۔ طباعت میں کوئی نقص اور کتاب کے ظاہری حسن میں کوئی کمی نظر آئے تو میری ناتجربہ کاری کا نتیجہ ہے۔ ارادہ ہے کہ والد مرحوم کی اور کتابیں بھی شائع کی جائیں جو پہلے شائع ہوئی تھیں اور اب نایاب ہیں۔

آج ہمارے درمیان نہ مولانا ملیح آبادی موجود ہیں، نہ مولانا آزاد۔ ایک سال کے آگے پیچھے علم و ادب کی یہ دونوں شمعیں گل ہوگئیں۔ دونوں کا زندگی بھر اٹوٹ ساتھ رہا تھا، وہ سفر آخرت میں بھی جاری رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ حق رفاقت ادا ہوگیا۔ مگر ہمارے لیے ان دو ہستیوں کا اُٹھ جانا بڑا قومی نقصان ہے۔ اب اس نقصان کی کچھ تلافی اسی طرح ہوسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے پیچھے علم و ادب کے جو خزانے چھوڑے ہیں انہیں تلف ہونے سے بچائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلا کر لازوال بنائیں۔ علم ایسی دولت ہے کہ جمع کرنے سے گھٹتی اور مٹ جاتی ہے۔ پھیلانے سے بڑھتی ہے "ذکرآزاد" کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

احمد سعید ملیح آبادی

کلکتہ ۱۵ فروری ۱۹۶۰ء

پہلا بول

صبا، یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے، یہاں صبح و شام بھی نہ ہوئی!

مولانا ابوالکلام آزاد سے میرے تعلقات ۱۹۲۰ء میں استوار ہوئے اور آخر تک برقرار رہے۔ رفاقت کی عمر پورے اڑتیس سال ہے۔ تقریباً دس برس تو خود مولانا کے گھر میں رہا۔ خلوت میں رہا، جلوت میں رہا۔ سفر میں رفاقت کی۔ جیل میں ساتھ ہوا۔ ان کے اخبار ایڈیٹ کرنے کی وجہ سے وقت بے وقت ملنا جلنا ہوتا تھا، اس لیے ہر رنگ میں، ہر حال میں انہیں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

لیکن میرے دیکھنے اور سمجھنے کی حقیقت کیا ہے؟

فاتح مصر، عمر بن العاص رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ بستر مرگ پر دراز تھے۔ عرض کیا گیا، آپ کو حضرت رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں مدتوں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا تو بیان فرمائیے۔ ابن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، ہاں بے شک اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں برابر حاضر رہا لیکن کچھ ایسا جلال تھا کچھ ایسی ہیبت تھی کہ جمال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نگاہ بھر کے کبھی دیکھ ہی نہ سکا۔ بتاؤ، سراپا کیوں کر بیان کروں؟

بلا تشبیہ مولانا کے ساتھ میرا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہو گیا تھا۔ لگاؤ اس قدر بڑھا، محبت اس قدر چھائی کہ سچ مچ "اَلْحُبُّ یُعْمِی وَیُصِمُّ" کا مصداق بن کر میں رہ گیا۔ برائیاں تو کیا دیکھتا......اور برائیاں تھیں کہاں؟ کچھ ہوں بھی، تو بہر حال بشر تھے۔

اچھائیاں بھی تو لنے پرکھنے کا موڈ باقی نہ رہا تھا لیکن ایک مجموعی مگر پختہ یقین دل میں بیٹھا ہوا ہے کہ مولانا تھے بلند، بہت ہی بلند انسان:

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے!

مولانا سے میرا رشتہ سطحی اور رسمی نہ تھا۔ کچھ ایسا تھا کہ بیان کرنا چاہوں تو بیان نہ کر سکوں۔ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ سے بہت مانوس تھے۔ بہت بے تکلف تھے۔ میں بھی بہت مانوس تھا

بہت بے تکلف تھا۔ میری بے تکلفی کبھی کبھی شوخی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ مذاق بھی کرتے تھے۔ بناتے بھی تھے۔ میں بھی مذاق کرتا تھا بناتا تھا مگر ادب کے ساتھ اور وہ بھی تنہائی میں۔ لوگوں کے سامنے میرا برتاؤ ویسا ہو جاتا، جیسا ایک معتقد کا ہوتا ہے اور مولانا بھی بزرگانہ انداز اختیار کر لیتے۔ بگڑنا بھی ہوتا تھا، روٹھنا بھی۔ منّا بھی ہوتا تھا، منانا بھی۔ سب کچھ ہوتا تھا مگر دل کی چاہت میں فرق آنے نہیں پاتا تھا۔

انہی تعلقات کی بنا پر احباب کا اصرار شروع ہوا کہ مولانا کے سلسلے میں کوئی کتاب لکھوں لیکن جدائی سے ایسا دھکا لگا ہے کہ ابھی تک دل و دماغ قابو میں نہیں۔ مولانا کی شخصیت بڑی ہمہ گیر شخصیت تھی۔ محرم اسرار دین تھے۔ مفسر قرآن تھے، محدث تھے، فقیہ تھے، فلسفی تھے، مورخ تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، انشا پرداز تھے، اخبار نویس تھے۔ سیاسی مدبر تھے، قومی لیڈر تھے، مجاہد حریت تھے:

ہے رنگ لالہٗ و گل و نسرین جدا جدا!

سب حیثیتیں ایسی ہیں کہ ہر حیثیت پر ریسرچ ہوگی۔ کتابیں لکھی جائیں گی۔ توفیق شامل حال ہوئی تو میں بھی لکھوں گا لیکن فی الحال وہ اطمینان قلب و نشاط ذہن میسر نہیں۔ جو ٹھوس تالیفات کے لیے مطلوب ہے۔ مجبوراً میں نے سہل راہ اختیار کی اور زیر نظر اوراق لکھنا شروع کر دیے کہ ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے!

ایک بدنصیبی یہ بھی ہوئی کہ مولانا کی موجودگی ہی میں ایک ضخیم کتاب اپنے ان کے تعلقات پر لکھ رکھی تھی مگر مولانا کے بعد دہلی سے دل برداشتہ ہو گیا اور اس طرح بھاگا کہ کئی مسودے ضائع ہو گئے۔ ان میں یہ کتاب بھی تھی لیکن ضائع نہ ہوتی، تو بھی شائع نہ کی جاتی۔ وہ تو اس بنیاد پر لکھی گئی تھی کہ دنیا سے پہلے میں رخصت ہوں گا اور مولانا کتاب پڑھیں گے، البتہ باقی رہتی، تو یہ آسانی ضرور ہوتی کہ بہت سے واقعات تاریخ وار جمع مل جاتے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو کچھ یاد آتا جائے، حوالہ قلم کرتا چلا جاؤں۔

یاد رہے، یہ کتاب مولانا کی سوانح حیات نہیں ہے۔ ان کے کارناموں کی داستان بھی نہیں ہے۔ یہ تو بس میری رفاقت کی بے جوڑ سرسری کہانی ہے۔ اس کہانی میں مولانا کے اخلاق و عادات کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی اور بے تکلف صحبتیں بھی۔ ظرافت کے چھینٹے بھی ملیں گے اور مسکراہٹیں بھی۔

کتاب کا طرزِ تحریر کیسا ہے؟ فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔ مگر میں اور کوئی طرز اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

کتاب کا یہ عیب خود مجھے بھی بہت کھٹک رہا ہے کہ مولانا کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ میرا تذکرہ بھی چل رہا ہے لیکن اس سے مفر بھی نہ تھا، کتاب لکھی ہی نہ جاتی اور لکھی گئی تو اسی طور سے لکھی جا سکتی تھی۔ خیال رہے، کتاب میں نے اپنے اور مولانا کے تعلقات پر لکھی ہے اور بات تو اصل میں یہ ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کتاب میں کہیں کہیں یہ بھی نظر آئے گا کہ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے اور مولانا سے بظاہر اس کا تعلق نہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ واقعہ بے تعلق نہیں ہے، بلکہ مولانا کی طبیعت کے کسی نہ کسی گوشے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہ بھی کہہ دوں کہ میں نے مولانا کو کہیں "مرحوم" نہیں لکھا ہے۔ میں اور مولانا کو مرحوم لکھوں؟ میرے لیے تو وہ زندہ ہیں، زندہ جاوید۔ یہاں تک کہ خود ان سے جا ملوں:

اے مرگ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟

کتاب میں مولانا کے بکثرت رقعوں، خطوں کے علاوہ فتوے، مضمون اور دو عظیم الشان خطبے بھی آپ ملاحظہ کریں گے۔

ملیح آبادی
کلکتہ دسمبر ۱۹۵۸ء

پہلی واقفیت

۱۹۱۳ء میں "الہلال" نکلا۔ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں پڑھتا تھا۔ پہلا پرچہ دیکھتے ہی "الہلال" کو دل دے بیٹھا۔ اس زمانے میں والد مرحوم سیاسیات سے بے خبر تھے اور اخباروں سے بے نیاز۔ طبعاً میں خوددار تھا اور والد پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا، جسے غیر ضروری سمجھیں مگر "الہلال" نے ایسا موہ لیا تھا کہ خودداری بھول کر اصرار کیا کہ پرچہ میرے نام جاری ہو جائے اور انہوں نے جاری کرا دیا۔

میں "الہلال" پڑھتا رہا۔ چھٹیوں میں لکھنو سے گھر آتا، تو والد کو بھی سناتا۔ مگر جلد ہی "الہلال" کے ایڈیٹر سے ایک طرح کی جلن مجھ میں پیدا ہوگئی۔ مولانا کی تحریروں میں پیغمبرانہ انداز تھا۔ بہت "دون" کی لیتے تھے اور میں جَل جَل جاتا تھا۔ آخر ایک دن والد سے کہہ دیا، معلوم ہوتا ہے یہ شخص پیغمبر یا مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہے اور میں اس شخص کا سب سے پہلا، سب سے بڑا مخالف بنوں گا۔ چاہے جان ہی دینا پڑے!

میں دیکھتا تھا کہ "الہلال" میں مولانا کی "لن ترانیاں" لوگوں کو متاثر کرتی ہیں اور وہ مولانا کو بہت بڑی ہستی سمجھنے لگے ہیں۔ مگر یہی چیز مجھے نہیں بھاتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا نے لکھا تھا کہ خبر ملی ہے راجہ محمود آباد نے ان پر حملہ کرنے کے لیے آدمی چھوڑ رکھے ہیں اور مولانا کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ فلاں دن فلاں ٹرین سے لکھنؤ پہنچیں گے اور دیکھیں گے کہ راجہ صاحب کے کرایہ کے ٹٹو کیا کرتے ہیں!

اس اعلان کا مدرسے میں میرے دوست لڑکوں پر گہرا اثر پڑا تھا اور وہ مولانا کی شجاعت پر عَش عَش کرنے لگے تھے مگر خود میں جل بھن گیا تھا اور کہتا پھرتا تھا، یہ سب جھوٹ ہے۔ "الہلال" کا ایڈیٹر خود اپنے جی سے بسنت بناتا اور سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دراصل میری جلن کا سبب خود میرے دل کے اندر کا چور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دلیری اور بہادری کے کام میرے سوا کسی اور سے منسوب ہوں!

لڑکپن ہی تو تھا۔ اتنی سمجھ کہاں تھی کہ دل کا محاسبہ کرتا۔ وہم بھی نہ تھا کہ مستقبل مجھے مولانا کے پاس کھینچ لے جائے گا۔ ان کے ساتھ سالہا سال کام کروں گا ان کے رنج و راحت، دکھ سکھ میں شریک رہوں گا اور انہی کی رفاقت میں میری جوانی و توانائی کا بہترین زمانہ بیت جائے گا۔

پہلی نظر

میں نے مولانا کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء ہی میں دیکھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا۔ علامہ سید محمد رشید رضا مرحوم، جو بعد میں میرے استاد ہوئے۔ مصر سے اجلاس کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر لڑکوں کی انجمن نے غریب طالب علموں کی مدد کے لیے چائے پانی کی دُکان ایک تنبو میں کھولی تھی۔ اس دُکان میں ایک ''بوائے'' میں بھی تھا۔

مولانا بھی اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور اُنہی کے ذمہ تھا کہ علامہ کی عربی تقریر کا ترجمہ سنائیں۔ علامہ کی تقریر کیا تھی؟ موجیں مارتا ہوا بے پناہ سیلاب تھا۔ دو گھنٹے سے زیادہ جاری رہی۔ مولانا نے تقریر چند ہی منٹ سنی اور اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اب علامہ شبلی نعمانی اور دوسرے منتظمین بدحواس تھے کہ ''آزاد'' کہاں غائب ہو گئے۔ مگر ترجمہ کا وقت آیا، تو مولانا نے ترجمے کے طور پر اردو میں ایسی تقریر کی، جو علامہ کی عربی تقریر سے روانی، زور، جوش، درازی میں کچھ سوا ہی تھی اور تمام مطالب پر پوری طرح حاوی۔ سامعین میں کوئی نہ تھا جو فرطِ حیرت سے مبہوت نہ رہ گیا ہو۔ بعد میں مولانا سے میں نے پوچھا تھا کہ بغیر سنے آپ نے علامہ کی تقریر کا ترجمہ کیسے کر دیا تھا؟ ہنس کر فرمایا۔ ابتدائی تقریر سن کر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہیں گے، اس لیے پوری تقریر سننے کی ضرورت نہ تھی! بات یہ ہے کہ علامہ کا رسالہ ''المنار'' اور ان کی تصانیف مولانا کے مطالعے میں برابر رہتی تھیں، اس لیے ان کے افکار و خیالات سے بخوبی واقف تھے۔ تاہم اس طرح ترجمہ کر دینا واقعی حیرت انگیز ذہانت و فطانت اور کمال درجے کی خطابت کا بین ثبوت ہے۔ خود سید رشید رضا صاحب بھی نہایت متاثر ہوئے تھے اور بارہا انہوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا۔

تو ہاں، میں چائے کی دکان میں ڈیوٹی پر تھا۔ اتفاق سے مولانا میری ہی باری پر چائے پینے آ گئے۔ میں نے ٹرے لا کر سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اطمینان سے چائے پی اور بیٹھے سگریٹوں پر سگریٹ جلاتے رہے۔ ایک پیالی کی قیمت شاید ایک آنہ تھی مگر مولانا نے میز پر ایک روپیہ رکھ دیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں دہقانی اور اناڑی۔ ایسے معاملات سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ لپک کر

مولانا کو روک لیا اور کہا "ٹھہریئے، باقی ریزگی لاتا ہوں" مگر وہ عجیب انداز سے مسکرائے اور کچھ کہے بغیر چلے گئے!

حیرت ہے، مصر سے واپسی کے بعد جب کلکتے میں مولانا سے پہلی ملاقات ہوئی، تو صورت دیکھتے ہی پہچان گئے۔ حالانکہ اب آٹھ سال بعد شکل بالکل بدل چکی تھی۔ پہلے بے ریش لڑکا تھا۔ اب چہرے پر داڑھی نہیں، داڑھا چھایا ہوا تھا۔ دیکھ کر ہنسے اور فرمایا "وہ ندوے میں چائے والی ریزگی بھی آپ کو یاد ہے؟" مجھے تو واقعہ یاد ہی تھا' کیونکہ میرے لیے انوکھا تھا مگر مولانا کی قوت حافظہ کا قائل ہو جانا پڑا کہ ایسی معمولی بات بھی یاد رہی!

پہلی ملاقات

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم آخری سانسیں لے رہی تھی کہ میں مصر سے ہندوستان واپس آیا۔ مصر اور حجاز میں ریکارڈ بہت "سیاہ" رہا تھا، اس لیے حکومت نظر بند کرنا چاہتی تھی مگر والد کے بعض دوستوں کے بیچ میں پڑ جانے سے اس شرط پر بچ گیا کہ لکھنؤ میں قیام کروں تاکہ پولیس باآسانی نگرانی کر سکے۔ میں نے حدیث نہیں پڑھی تھی۔ یہ شرط غیبی نعمت معلوم ہوئی، دوبارہ دارالعلوم ندوہ میں بھرتی ہو گیا اور تکمیل حدیث کر لی لیکن مدرسے کی مشغولیت سیاسیات سے غافل نہ رکھ سکی۔ ہر وقت یہی فکر رہتی کہ ملک میں آزادی کے لیے ہلچل کیونکر پیدا کی جائے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ جنگ کی وجہ سے جو سیاسی مردنی چھائی ہوئی ہے، اسے دور کرنے اور مسلمانوں کو ابھارنے کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ خلافت کے نام پر تحریک جاری کی جائے۔ حال ہی میں انگریزوں نے دارالخلافہ قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور خلیفہ ان کا قیدی بن چکا تھا۔

اسی زمانے میں مولانا محمد علی و شوکت علی کو، جو چھنڈواڑے میں نظر بند تھے، رام پور جانے کی اجازت ملی تھی اور وہ لکھنؤ اسٹیشن سے گزرنے والے تھے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور دونوں سے ملنے پہنچ گیا۔ مولانا محمد علی غسل خانے میں تھے۔ شوکت صاحب نے پوری اسکیم سنی بھی نہیں اور خفا ہونے لگے مگر مولانا محمد علی کے کانوں تک میری آواز پہنچ چکی تھی۔ غسل خانے ہی سے چلائے "تجویز بالکل صحیح ہے' ٹھہرو میں آتا ہوں۔"

وہ آئے تو میں نے تفصیل سے اپنے خیالات پیش کیے۔ وہ متفق ہو گئے مگر کہنے لگے ہم نظر بند ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔ عرض کیا، مولانا عبدالباری سے کہیے کہ تحریک شروع کریں۔ اس بیچ میں مولانا بھی آ گئے اور محمد علی مرحوم نے انہیں راضی کر لیا۔

غرضیکہ خلافت تحریک کی کھچڑی پکی اور جلد ہی اس نے طاقت حاصل کر لی۔ اسی زمانے میں نظر بند چھوڑ دیئے گئے۔ امرتسر میں کانگریس کے ساتھ دوسری قومی جماعتوں کے بھی اجلاس ہوئے اور طے پایا کہ کلکتہ میں پہلی خلافت کانفرنس مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہو۔

مرحوم مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کے ساتھ میں بھی پہلی دفعہ کلکتہ آیا اور محض اتفاق سے خلافت کانفرنس[1] میں مجھے غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔

ہوا یہ کہ جب مولانا عبدالباری تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو حسب عادت جوش سے بالکل بے خود ہو گئے اور کہنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کو جہاں پاؤ، مار ڈالو۔ مٹی کا تیل چھڑک چھڑک کر زندہ جلا دو...... یہ سن کر تمام لیڈر سخت پریشان ہوئے اور مولانا ابوالکلام نے محمد علی و شوکت سے کہا کہ مولانا کو روکو، ورنہ تحریک برباد ہو جائے گی مگر دونوں بھائیوں کی ہمت نہ پڑی کہ منبر کے پاس جائیں، جو ڈائس سے دور بیچ ہال میں تھا اور بپھرے ہوئے شیر کا منہ بند کریں۔ اس پر میں نے کہا کہ ابھی جا کر مولانا کو روکے دیتا ہوں! مولانا آزاد کو اور ڈائس پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوئی۔ مگر انہوں نے دیکھ لیا کہ میرے پہنچتے ہی مولانا دفعتاً خاموش ہو گئے اور سیدھے میرے ساتھ ڈائس پر چلے آئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ مولانا عبدالباری مرحوم نہایت نیک نفس اور بے لوث بزرگ تھے اور مجھ سے عہد کر چکے تھے کہ جب کبھی دیکھوں کہ تقریر میں بہک رہے ہیں، تو بے تکلف روک دوں اور وہ بے چوں وچرا میرا کہا مان لیں گے۔ اس موقع پر بھی یہی ہوا میں نے مولانا کے پاؤں پر ہاتھ رکھا کیوں کہ منبر بہت اونچا تھا اور کہا، بس کیجئے، تو وہ فوراً اُتر آئے!

کانفرنس کے بعد مولوی منیر الزماں اسلام آبادی کے ساتھ مولانا آزاد سے ملنے ان کے گھر گیا۔ رپن لین کی ایک چھوٹی سی بوسیدہ عمارت میں رہتے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مجھ سے انجان نہیں ہیں۔ پہلے تو وہی اجلاس ندوے والی چائے کی ریزگی یاد دلائی۔ پھر بتایا کہ مصر کے حالات پر میرے مضامین ان کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ ایک مضمون مصری کھانوں پر تھا۔ اس کا خاص طور پر ذکر کیا۔ مُلوُخِیّہ، فسیخ اور مش پر جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کا تذکرہ کر کے خوب ہنسے۔ پھر تعجب ظاہر کرنے لگے کہ کانفرنس کے ہال میں مولانا عبدالباری صاحب کی مشکل تم نے کس آسانی سے ختم کر دی۔

چلتے وقت دوبارہ ملاقات کا اصرار کیا اور وقت بھی مقرر کر دیا۔ میں پہنچ گیا آج تنہائی تھی۔ ایسا معلوم ہوا گویا ہم عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ دل کھول کے ملے۔ مولانا نے تفصیل سے اپنی اسکیم بتائی کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں اور مجھے شریک ہو جانے کی دعوت دی۔ میں بلا کسی پس و پیش کے فوراً راضی ہو گیا۔ حیرت انگیز طور پر ہمارے خیالات میں یکسانی تھی۔

مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے ۔مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں ۔مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو سکتی ہے، اگر قرآن و حدیث سے انھیں بتا دیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، امام کو مان لے،تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کر دے اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست دے دی جائے ۔مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لیے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چُنا ہوگا، ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوش مند اور حالات زمانہ سے کما حقہ واقف ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ اُنہی کو یہ منصب ملنا چاہیے۔

بیعت جہاد

اس کے بعد طے پا گیا کہ امامت کا مسئلہ پبلک میں لانے سے پہلے اندر اندر مولانا کی امامت کے لیے ملک بھر میں بیعت لینا شروع کر دی جائے۔ تا کہ جب یہ معاملہ سامنے آئے، تو امام کی بیعت واقعہ بن چکی ہو۔ اس طرح لوگوں میں رشک و رقابت کا سد باب ہو جائے گا اور مسلمان ایک امام پر متفق ہو کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکیں گے۔

اسکیم سے میں نے اتفاق ظاہر کیا، تو مولانا نے بتایا، دوسرے صوبوں میں بیعت کا کام جاری ہو چکا ہے۔ یوپی کا صوبہ تم اپنے ذمہ لے لو۔ میں راضی ہو گیا، تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک تحریر دی۔ جس میں مجھے اپنا خلیفہ مقرر کیا اور لکھا کہ ان کے لیے بیعت لینے کا مجاز ہوں۔ تحریر حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم و ارشاد سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِين۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

۴ شعبان ۱۳۳۸ھ

الفاظ بیعت کا مسودہ بھی لکھ دیا۔ نیچے نقل کرتا ہوں:

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ بِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَاٰمَنْتُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ وَبِمَا جَـاءَ مِنْ عِـنْـدِ رَسُـوْلِ الـلّٰـه، وَاَسْـلَمْتُ وَاَقُوْلُ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، لَاشَرِیْکَ لَهٗ، بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ.

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء اور نائبین کے، اس بات پر کہ:

۱۔ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لا الٰہ الاّ اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کے اعتقاد اور عمل پر قائم رہوں گا، اگر استطاعت پائی۔

۲۔ پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا۔ رمضان کے روزے رکھوں گا۔ زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا، اگر استطاعت پائی۔

۳۔ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا۔ بُرائی کو روکوں گا، صبر کی وصیت کروں گا۔

۴۔ میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵۔ اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے، اپنے مال سے، اپنے اہل وعیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھوں گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب وسنت کے مطابق دیا جائے، سمع والطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

اس موقع پر مسکرا کے میں نے عرض کیا اور حضرت اگر میں سی آئی ڈی ہوں؟ دل کھول کے ہنسے اور فرمایا "میری نگاہ کو جاسوس کے پہچاننے میں کبھی چوک نہیں ہوئی۔"

یہ مرحلہ ختم ہوا تو شائستہ پیرائے میں میری مالی حالت کے بارے میں استفسار کیا۔ یہاں اللہ کے نام کے سوا کیا تھا؟ صاف صاف عرض کیا کہ والد خوش حال زمیندار تو ہیں اور میرا بوجھ خوشی خوشی اٹھا سکتے ہیں لیکن میں ان پر نہ بوجھ ہوں، نہ ہونا چاہتا ہوں۔ اپنی روزی قلم ہلا کر کماتا ہوں اور مگن رہتا ہوں۔

اس پر مولانا نے کہا اس قسم کے کام انجام دینے کے لیے دلجمعی کی ضرورت ہوتی ہے اور دلجمعی کی صورت یہ ہے کہ آدمی معیشت کی طرف سے بے فکر ہو۔ پھر فرمایا، ایک رقم مقرر ہو جائے گی اور ہر ماہ لکھنؤ میں پہنچتی رہے گی۔ یہ بات مجھے ناپسند ہوئی۔ فوراً سمجھ گئے کہنے لگے، مولوی

صاحب یہ رقم میری طرف سے نہیں ہوگی۔ میں خود فقیر ہوں۔ کسی کو کیا دوں گا لیکن ایک نیک دل مسلمان نے ایک بڑی رقم میرے ہاتھ میں انہی کاموں کے لیے ڈال رکھی ہے اسی میں سے پچاس روپے ماہوار آپ کو بھی پہنچا کریں گے۔ فی الحال لکھنؤ کو اپنا مرکز بنایئے اور پورے صوبے میں کام شروع کر دیجئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رقم جس کا مولانا نے حوالہ دیا تھا، مولانا عبدالقادر صاحب قصوری مرحوم کے لڑکے، مرحوم مولانا محمد علی ایم اے نے ایک لاکھ روپیہ کی شکل میں دی تھی۔ یہ صاحب بمبئی میں کاروبار کرتے تھے۔

گُر کی بات

بہر حال مولانا کی تجویز ماننا پڑی۔ اس کے بعد فرمایا، ایک گُر کی بات سُن لیجئے۔ عمل کیجئے گا تو کامیابی کی راہیں کھل جائیں گی اور تفصیل اس طرح بیان کی:

لوگوں پر اثر جمانے، ان میں اپنے لیے مروت پیدا کرنے، انہیں اپنی رائے پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً دعوتیں دی جائیں۔ کبھی چائے پر بلا لیا۔ کبھی کھانے کا سامان کر دیا۔ آج انھیں، کل انھیں، اس طرح ہوتے ہوتے بہت آدمی اثر میں آجاتے ہیں۔ دس آدمیوں کی دعوت پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ دس ہزار آدمیوں کے جلسے پر خرچ ہو جاتا ہے مگر اس جلسے سے ایک آدمی بھی قبضے میں نہیں آتا لیکن ایک دعوت کے مختصر خرچ سے دس کے دس آدمی اپنا خیال تو ضرور ہی کرنے لگتے ہیں۔

لکھنؤ لوٹ کر تجربہ کیا، تو واقعی مولانا کی بات ٹھیک ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں لکھنؤ سستا شہر تھا۔ مولوی گنج میں ایک پورا دو منزلہ مکان، صرف سولہ روپیہ کرایہ پر میرے پاس تھا۔ میں نے ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور جلد ہی شہر میں اچھا خاصہ رسوخ پیدا کر لیا۔ ایک ہی دو مہینے میں کئی سو آدمی بیعت میں داخل ہو گئے۔ اب چھوٹا موٹا امام، خود میں بھی تھا!

دیوانہ شیدائی!

مولانا سے خط و کتابت رہتی تھی اور میرے کام سے مطمئن تھے مگر اس سنجیدگی کی خشکی کو کم کرنے کے لیے غیب سے ایک عجیب بندوبست ہو گیا۔ بیعت کرنے والوں میں کاکوری کے ایک

شخص، مولوی شفاعت علی مرحوم بھی تھے۔ مولوی اسحاق علی مرحوم عرف ظفر الملک ایڈیٹر ''الناظر'' کے یہ بڑے بھائی تھے۔ منشی احتشام علی صاحب مرحوم کے رشتہ دار تھے اور لکھنؤ میں اُنہی کی کوٹھی پر قیام تھا۔ سنک شروع سے تھی، بڑھتی چلی گئی اور یقین کر بیٹھے کہ منشی احتشام علی ان کے دشمن ہیں اور مسمریزم کے ذریعہ دیوانہ بنا کر قتل کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسی خبط میں ایک دن منشی صاحب کو چھری سے ذبح کرنے پر تُل گئے۔ اتفاق سے میرے والد مرحوم موجود تھے۔ ورنہ خاتمہ ہی کر ڈالتے۔

اس واقعہ کے بعد شفاعت علی مرحوم کو منشی صاحب کی کوٹھی چھوڑنا پڑی اب وہ میرے ساتھ رہنے لگے۔ بیعت تو کر ہی چکے تھے۔ مولانا آزاد سے عقیدت نہیں، عشق ہو گیا تھا، حالانکہ مجھے یاد ہے کئی سال پہلے مولانا کی تقریر قیصر باغ لکھنؤ کی بارہ دری میں ہو رہی تھی اور مولانا اپنی عادت کے خلاف ایک جگہ اٹک کر ایک ہی بات بار بار دہرا رہے تھے۔ اس پر انہی شفاعت علی نے چلا کر کہا تھا ''ایک ہی بات کب تک رٹی جائے گی۔ اڑیل ٹٹو کو آگے بڑھاؤ!''

ایک دفعہ مولانا سے اس واقعے کا تذکرہ ہوا، تو ہنس کر کہنے لگے، انہی حضرت نے اسی قیصر باغ کی بارہ دری میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کو بھی تقریر میں ٹوکا تھا۔ ڈپٹی صاحب بہت بڑے مقرر ہی نہ تھے، بہت بڑے پھکڑ بھی تھے۔ اپنی تقریر میں لکھنؤ والوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ شفاعت علی بگڑ گئے اور چلا اٹھے باہر نکلو گے، تو مزہ چکھا دوں گا! اس وقت شفاعت علی نوجوان تھے اور مرحوم ڈپٹی صاحب رنگین مزاج۔ ''میاں صاحب زادے'' کہہ کر فرمانا شروع کیا۔ ''اخاہ! آپ ہیں۔ بڑے چکنے چکنے گال ہیں! خاص لکھنؤ کا تحفہ ہے۔ بھلا اکھڑ دہلی میں ایسا چوزہ کہاں نصیب؟ میاں ذرا قریب تو آؤ۔ ایک ہی چٹخارا......'' آخر شفاعت علی صاحب ساری شیخی بھول گئے!

بہر حال شفاعت علی صاحب مولانا کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ پھر مولانا کا خط آیا کہ لکھنؤ آ رہے ہیں۔ شفاعت علی کی خوشی بے حساب تھی۔ کہنے لگے، دعوت ضرور کروں گا۔ میں نے دبی زبان سے منع کیا مگر کب ماننے والے تھے۔ مولانا آئے اور محمد جان کے ہوٹل حضرت گنج میں ٹھہر گئے۔ دوسرے دن صبح میرے یہاں آنے کا پروگرام تھا تاکہ معتقدوں اور مریدوں سے ملیں۔ کئی سو آدمی جمع تھے۔ ان میں ایک قریبی رشتہ دار سردار محمد خاں مرحوم بھی تھے۔ مولانا جیسا کہ ان کا دستور تھا۔ ہر ایک سے اس طرح پیش آئے کہ وہ سمجھا سب سے زیادہ میں ہی مقبول ہوا ہوں لیکن مولانا کی نظر میں صرف ایک سردار محمد خاں جچے۔ خاں صاحب واقعی ایسے کلے ٹھلے کے آدمی تھے کہ سب سے ممتاز دکھائی دیتے تھے۔ بڑے طاقتور تھے۔ ہندوستان بھر میں ان

کی ٹکر کا پنجہ کش کوئی نہ تھا۔ مدتوں اخباروں میں پانچ سو انعام کے ساتھ چیلنج نکلتا رہا مگر کبھی کوئی آدمی ان سے پیش نہ پا سکا۔ بعد میں مولانا ہمیشہ خان صاحب کا تذکرہ کرتے رہے اور جب میں نے ان کے انتقال کی خبر سنائی، تو نہایت افسوس کے ساتھ کہا، بہادر، اولوالعزم آدمی تھا!

اِدھر مولانا لوگوں سے باتوں میں مصروف تھے، اُدھر شفاعت علی بار بار میرے کان پر منہ رکھ کے کہتے تھے، مولانا سے دعوت طے کرا دو، میں جز بز ہوتا تھا۔ آخر مولانا نے یہ کانا پھوسی دیکھ لی، پوچھا، کیا بات ہے؟ شفاعت علی ہاتھ جوڑ کے ہمہ تن التجا بن گئے! ''اس ناچیز کی دعوت قبول فرمائی جائے'' مولانا نے خندہ پیشانی سے کہا، کب؟ شفاعت علی صاحب نے دوسرے دن دوپہر کا کھانا تجویز کیا۔

عجیب دعوت

دوسرے دن مولانا صبح سے آ گئے۔ آج بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ باتوں میں ساڑھے بارہ بج گئے مگر شفاعت علی کی دعوت کا کہیں پتہ نہیں، حالانکہ تاکید کر دی گئی تھی کہ مولانا، گیارہ اور بارہ کے درمیان کھانا کھا لیتے ہیں۔ آخر مولانا نے میرے کان میں کہا، دعوت کیا ہوئی؟ میں کیا جواب دیتا۔ عرض کیا، دیوانہ ہے۔ پوچھتے ڈر لگتا ہے۔ مسکرا کر تانگہ بلانے کا حکم دیا۔ تانگہ آ گیا۔ مولانا کے ساتھ میں بھی سوار ہو گیا اور شفاعت علی بھی کوچوان کی بغل میں ڈٹ گئے، تانگہ حضرت گنج میں ہوٹل پہنچا۔ سب اُتر پڑے۔ اندر پہنچ کر مولانا نے تین آدمیوں کے لیے کھانا لانے کا حکم دیا: اپنے لیے، میرے لیے اور شفاعت علی کے لیے۔ کھانا آ گیا۔ ہم ہاتھ دھو کے بیٹھ گئے۔ شفاعت علی بھی مستعدی سے آستینیں چڑھائے آ بیٹھے۔ ابھی تک دعوت کا نام تک نہیں لیکن جوں ہی مولانا نے نوالہ بنا کے اٹھایا۔ شفاعت علی نے جھٹ ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگے ''اور مولانا، میری دعوت؟'' مولانا جھنجھلائے اور خشکی سے کہنے لگے ''میرے بھائی، اتنا سب ہو گیا اور آپ کو یاد نہ آیا، اب کہتے ہیں دعوت!''

شفاعت علی ہاتھ جوڑنے لگے ''کھانا تیار رکھا ہے ابھی آیا جاتا ہے'' اسی وقت ''صدیق بک ڈپو'' کے مالک سے کہا، تیز اِکا لو اور منشی جی کی کوٹھی سے کھانا لے آؤ۔ معلوم نہیں، کوٹھی سے الگ ہو جانے کے بعد انہوں نے وہاں کیوں کر انتظام کیا تھا۔

ہوٹل کا کھانا سامنے رکھا تھا۔ مولانا بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے اور میں بھی مگر شفاعت علی چہچہا رہے تھے۔ قربان ہوئے جا رہے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد دعوت کا کھانا آیا۔ بہت اچھا بھنا

گوشت تھا۔ پراٹھے تھے، شیر مالیں تھیں۔ ہم سب کھانے لگے مگر جب مولانا سیر ہو کر اٹھنے لگے تو شفاعت علی نے سنے ہاتھ سے ان کی کلائی پکڑ لی اور زور سے نعرہ مارا" اور مولانا، پلاؤ!"

اب مولانا کے لیے تحمل ناممکن تھا۔ نازک مزاج تو تھے ہی۔ ایسی حرکت سے شاید کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ خفا ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے مگر شفاعت علی نے مجھے اُٹھنے نہ دیا۔ اسی سنے ہوئے ہاتھ سے میری شیروانی کی آستین بھی سان دی۔"صدیق بک ڈپو" والے پھر بیٹھ گئے۔ پلاؤ کسی اور جگہ پکا تھا۔ بڑی دیر کے بعد آیا مگر اب کھانے کی ہمت کس میں تھی۔ میں بیٹھا ٹونگتا رہا۔ شفاعت علی اور صدیق بک ڈپو والے چھپے مارتے رہے۔

خدا خدا کر کے یہ مصیبت بھی ختم ہوئی اور میں اُٹھنے لگا۔ بڑی جلدی تھی۔ مولانا کو ضروری باتیں کرنا تھیں مگر شفاعت علی نے پھر اپنے سَنے ہوئے ہاتھ سے کلائی پکڑ لی اور جوش سے کہنے لگے۔"فرنی باقی ہے"! میں نے بہت اُکھاڑ پچھاڑ کی مگر مردِ خدا کب چھوڑنے والا تھا۔ آخر راضی ہونا پڑا کہ فرنی بھی کھاؤں گا مگر اس شرط سے کہ جانے دو، مولانا کو اپنی غیر حاضری کا سبب بتا آؤں۔ شفاعت علی مان گئے۔ میں نے جا کر مولانا سے واقعہ بیان کیا۔ دیر تک لطف لیتے رہے۔ آستین، سالن سے لہولہان تھی۔ کہنے لگے"مولوی صاحب، آج ہی پھنسے ہو!" میں شفاعت علی کے پاس لوٹ آیا۔ خالی دسترخوان پر جلا بھنا بیٹھا رہا۔ فرنی کسی تیسری جگہ پکی تھی۔ کوئی پانچ بجے کے قریب آئی اور اِس عذاب سے بہ ہزار خرابی چھٹکارا پایا!

مولانا نے فرمایا۔ اس شخص نے بہت سا قیمتی وقت ضائع کر دیا ہے۔ میں بھی ہلکان ہو چکا ہوں۔ تم بھی پریشان ہو گئے ہو۔ بہتر ہے کل صبح سات بجے چلے آؤ۔

ناشتے کا لطیفہ

صبح کو مولانا نے چاہا کہ امین آباد سے ٹوپی خریدیں۔ ابھی تک ایرانی وضع کی بالدار ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ لاٹوش روڈ کے چوراہے پر تانگہ پہنچا تو کیا دیکھتے ہیں، شفاعت علی اِکے پر سوار آرہے ہیں اور بہت بڑا ناشتے دان ہاتھ میں ہے مولانا پر نظر پڑی تو ہاتھ اٹھا کر زور زور سے ناشتے دان ہلایا اور کھیسیں نکال دیں، گویا کہہ رہے ہیں کہ میں ناشتہ لیے اسٹیشن جا رہا ہوں! انہیں معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد مولانا، بمبئی جا رہے ہیں۔

مولانا کے ذوق پر یہ حملہ بہت سخت تھا۔ نہایت برہم ہوئے۔ کہنے لگے، ''کوئی ایسی صورت نکالنا ہوگی کہ اس دیوانے سے محفوظ رہوں!'' میں نے وعدہ تو کر لیا مگر جانتا تھا بچاؤ مشکل ہے۔

بازار سے اسٹیشن پہنچے تو دیکھا شفاعت علی، مولانا کے ڈبے میں گھسے ہوئے ہیں۔ ٹفن بکس کھلا ہوا ہے اور اپنا عظیم الشان ناشتے دان اس میں خالی کر رہے ہیں۔ مولانا بہت بگڑے، ڈبے میں گئے۔ ٹفن بکس کے سب برتن بھر چکے تھے مگر مولوی صاحب کا ناشتے دان ابھی تک وزنی تھا۔ مولانا نے کہا۔ بس کیجئے مگر کون سنتا ہے۔ آخر جھلا کے نوکر کو حکم دیا بند کرو بکس! مگر شفاعت نے فوراً سر آگے بڑھا کر اَڑا دیا۔ اب نوکر ڈھکنا بند کرنا چاہتا ہے مگر ان کا سر بیچ میں اڑا ہوا ہے۔ مولانا نے بڑی خفگی سے کہا، میرے بھائی، آپ بہت پریشان کرتے ہیں! سر ہٹائے بغیر کہنے لگے ''ناشتہ بھر ہی کے رہیں گے'' اور یہی کیا بھی!

اِس کے بعد ایک دفعہ مولانا کہیں جاتے ہوئے لکھنؤ سے گزرے۔ مجھے لکھ دیا کہ شاہجہانپور تک ساتھ چلنے کے لیے تیار رہنا مگر شفاعت علی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ میں چپ چاپ اسٹیشن پہنچ گیا اور شاہجہان پور تک گیا۔ رات وہیں گزاری۔ دوسرے دن واپس آیا تو شفاعت علی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر کسی نے مولانا کو دیکھ لیا تھا اور شفاعت علی کو خبر ہوگئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں سے رنج دور کرنا چاہا مگر عجیب لہجے میں کہنے لگے ''آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ مولانا کے ساتھ رات بھر سفر کیا اور ہمیں خبر تک نہ کی، جیسے ہم آپ کے مولانا کو کھا جاتے!'' میں طبیعت سے واقف تھا۔ کہہ دیا، مولانا کو آپ سے بڑی محبت ہے۔ آپ کا ذکر خیر برابر کرتے رہے مگر پچھلی دفعہ آپ نے ایسی خاطر کی تھی کہ پھر آپ کو تکلیف دینا نامناسب سمجھا گیا۔ یہ سن کر باچھیں کھِل گئیں۔ کہنے لگے، واقعی، مولانا کو میرا اتنا خیال ہے؟ اور اِسی خیال میں مگن رہنے لگے لیکن پھر کبھی مولانا سے ملاقات نہ ہوسکی۔

امامت کے امیدوار

اِسی زمانے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم و مغفور، مالٹے کی نظر بندی سے چھٹ کر پہلی دفعہ لکھنؤ تشریف لائے اور فرنگی محل میں ٹھہرے۔ خبر ملی کہ فرنگی محل والے اِس کوشش میں ہیں کہ مولانا عبدالباری صاحب کی امامت پر انہیں راضی کر لیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خود شیخ الہند کے بعض رفیق شیخ کے لیے یہ منصب چاہتے ہیں۔ مجھے تشویش ہوئی۔ شیخ الہند کے لیے میں انجان

نہ تھا۔ منیٰ میں اور مکے میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور بڑی شفقت سے پیش آئے تھے لیکن اب جو مسئلہ درپیش تھا، نازک بھی تھا اور اہم بھی۔ خود شیخ کی ذات سے بھی تعلق رکھتا تھا اور بڑے سلیقے کا طالب تھا۔ میں نے شیخ الہند سے تنہائی میں ملاقات کی۔ رسمی باتوں کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی امامت کا تذکرہ چھیڑا۔ شیخ نے فرمایا، امامت کی ضرورت مسلم ہے۔ عرض کیا۔ حضرت سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اس منصب کے لیے وہی شخص موزوں ہوسکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ہوشمند، مدبر اور ڈپلومیٹ ہو۔ مسلمانوں کا امام ایسا شخص ہونا چاہیے جس کی استقامت کو نہ کوئی تشویش متزلزل کر سکے، نہ کوئی ترہیب۔ مثال کے طور پر میں نے پاپائے روم کا تذکرہ کیا، جو ڈپلومیسی میں فرد اور سیاسیات کا شاطر ہوتا ہے۔

شیخ الہند نے اتفاق ظاہر کیا، تو عرض کیا، آپ کی رائے میں اِس وقت امامت کا اہل کون ہے؟ یہ بھی اشارۃً کہہ دیا کہ بعض لوگ اِس منصب کے لیے خود آپ کا نام لے رہے ہیں اور آپ بحمد اللہ اہل بھی ہیں۔ شیخ بڑی معصومیت سے مسکرائے اور فرمایا، میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا امام بنوں۔ عرض کیا، کچھ لوگ مولانا عبدالباری صاحب کا نام لے رہے ہیں۔ موصوف کا تقویٰ و استقامت مسلم ہے مگر مزاج کی کیفیت سے آپ بھی واقف ہیں۔ شیخ نے سادگی سے جواب دیا، مولانا عبدالباری کے بہترین آدمی ہونے میں شبہ نہیں مگر منصب کی ذمہ داریاں کچھ اور ہی ہیں، عرض کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ شیخ نے متانت سے فرمایا، میرا انتخاب بھی یہی ہے۔ اس وقت مولانا آزاد کے سوا کوئی شخص، امام الہند نہیں ہوسکتا۔ ان میں وہ سب اوصاف جمع ہیں، جو اس زمانے میں ہندوستان کے امام میں ہونا ضروری ہیں!

میں اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا۔ شیخ سے عرض کیا، اس گفتگو کو پبلک میں لا سکتا ہوں؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ سب سے پہلے میں نے مولانا آزاد کو تار پر خلاصہ بھیجا۔ پھر زبانی شہرت دینا شروع کیا۔ بعض اخباروں میں بھی مبہم لفظوں میں تذکرہ آ گیا۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی

اب مولانا عبدالباری صاحب سے نپٹنا تھا۔ مولانا سے میرے گہرے تعلقات تھے اور اندیشہ تھا کہ میری اس مہم کا حال معلوم ہوگا، تو مجھے نہ جانے کتنا برا سمجھیں گے مگر جب بات چیت

ہوئی تو خندہ پیشانی سے کہنے لگے، مولانا آزاد کے سوا کسی اور کا نام امامت کے لیے لینا، قوم سے غداری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے شیخ الہند سے معاملہ صاف کرلیا اور میں پہلا آدمی ہوں جو مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ ہمیں ہندوستان آزاد کرانا ہے اور اسلامی دنیا کو انگریز کے چنگل سے نکالنا ہے۔ میں ایک نکٹے بچے حبشی غلام کو بھی سردار مان لوں گا، اگر انگریز پر جہاد کرے اور انگریز سے لڑے۔

مگر میں اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ جانتا تھا، مولانا آزاد سے بڑی چشمک ہے، گو ظاہری محبت و خلوص کی کمی نہیں۔ میں نے درخواست کی کہ اپنا جواب تحریر کی صورت میں لے آئیں۔ اتفاق سے پرانے کاغذوں میں اس تحریر کی نقل مل گئی ہے۔ یہاں درج کرتا ہوں:

بسم اللہ الرَّحمن الرَّحیم

حَامِدً اوَّ مُصَلِّیاًوَّ مُسْلِمًا۔ کرمی دام مجدہٗ۔ السلام علیکم۔

مسئلہ امامت یا شیخ الاسلامی کے متعلق مجھے جمہور کی موافقت کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ جو اندیشہ ہے وہ بارہا اہل الرائے سے ظاہر کر چکا ہوں، باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی تجویز کو بسر و چشم قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خود مجھ سے بارہا اس منصب کے قبول کرنے کی بعض اہل الرائے نے خواہش کی مگر میں نے اپنی عدم اہلیت کے باعث اس امانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا، نہ آئندہ قبول کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب سے دریافت کیا تو وہ بھی اِس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب، اسبق و آمادہ ہیں۔ ان کی امامت سے بھی مجھے استنکاف نہیں ہے۔ بسر و چشم قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں، بشرطیکہ تفریق جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں۔ اگر کسی نااہل کو تمام یا اکثر اہلِ اسلام قبول کرلیں گے، تو مجھے وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گذار و فرمانبردار پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تحریک دیانتاً میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا۔ نہ کسی کو منتخب کرکے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں۔ اِس سے زائد مجھے اِس تحریک سے تعرض نہیں ہے۔ والسلام

''بندہ فقیر محمد عبدالباری''

خط کی نقل میں نے مولانا آزاد کو بھیج دی تھی۔ خط جیسا کچھ ہے، ہر آدمی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مولانا نے مجھے جو جواب لکھا، اس میں اِس خط کے متعلق صرف یہ لفظ لکھے تھے:

مولوی عبدالباری کا خط دیکھا:

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم!

سر دست اِس قصے کو تہہ کیجئے اور کام کیے جائیے، پنجاب، سندھ، بنگال میں تنظیم قریب مکمل ہے۔
(۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء)

مولانا کے کچھ نجی خط

جس زمانے کا تذکرہ ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست کا سب سے بڑا مسئلہ، یہی امامت کا مسئلہ تھا۔ مولانا محمود حسن صاحب فرنگی محل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس معاملے میں گہری سازشیں ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک مفصل خط میں مولانا آزاد کو ان سازشوں سے آگاہ کیا۔ جواب میں انہوں نے ۱۳ جولائی ۲۰ء کو خط لکھا:

"حُبیَ فِی اللّٰہ" السلام علیکم۔ آپ کے تمام خطوط یک جا ملے۔ گزشتہ ماہ کے اواخر میں بمبئ گیا تھا تاکہ تمام معاملات ایک قطعی اور مختتم صورت اختیار کر لیں لیکن وہاں پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا۔ ایک ہفتہ سے زائد عرصہ اس میں ضائع ہو گیا۔ چونکہ ارادہ زیادہ قیام کا نہ تھا، اس لیے ڈاک کلکتہ سے نہ منگوائی۔ کل یہاں (کلکتہ) پہنچا اور آج ڈاک میں آپ کے خطوط ملے۔ بحمد اللہ معاملہ تنظیم و جماعت مِنْ کُلِّ الوجوہ اتمام کو پہنچا۔ جزئیات و تفصیلات بھی طے پا گئیں۔ اب بجز توسیع دائرۂ عمل کے کوئی مرحلہ باقی نہیں اور وہ توفیقِ الٰہی پر موقوف ہے۔

"حسرت صاحب سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی وہ رائے و فکر کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کا اصلی جوہر استقامت عمل ہے۔ پس ان امور میں ان کی رائے پر اعتماد بے سود ہوگا" (امامت کے سلسلے میں مولانا حسرت موہانی مرحوم سے بھی میں نے بات چیت کی تھی اور اس کی رپورٹ مولانا کو بھیج دی تھی)۔

"آپ نے لکھنؤ کے جو حالات لکھے ہیں، ان کو پڑھ کر سخت قلق ہوا۔ افسوس بہتر سے بہتر نیکی کو بھی یہ لوگ بلا آمیزش بدی کے نہیں انجام دے سکتے۔ ان لوگوں میں ایک شخص بھی نہیں جو اس مسئلے کی اہمیت و حقیقت اور منصب ریاست کے فرائض و مہمات اور پھر موجودہ حالات کی بنا پر مشکلات و صعوبات راہ کا نکتہ شناس ہو۔ مع ہذا۔ اگر یہ لوگ اصول کو تسلیم کر لیں اور کسی نہ کسی شخص کو متفقہ طور پر منتخب کر لیں، تو بہر حال موجودہ طوائف الملوکی سے تو بہتر ہوگا"۔

''بہرحال ہمارا دائرہ عمل منظم ہو چکا ہے۔ پنجاب، سندھ، بنگال بالکل متفق و متحد ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے۔ اِن لوگوں کے فیصلے کا انتظار بے سود تھا اور بے سود ہے۔''

اس کے بعد مسئلہ امامت سے ہٹ کر کچھ اور باتیں بھی لکھی ہیں۔ مناسب ہے پورا خط نقل کر دیا جائے۔

''مفصل خط کل یا پرسوں لکھوں گا۔ روپیہ کے لیے بمبئی لکھ دیا ہے۔ وہاں سے بذریعہ تار وصول ہو جائے گا۔ بمبئی سے مقصود خلافت کمیٹی نہیں ہے۔ دوسرا انتظام ہے اور چونکہ پوری طرح تنظیم ہو گئی ہے۔ اس لیے انشاء اللہ آئندہ مالی مشکلات پیش نہ آئیں گی۔ پوری طرح مطمئن فارغ البال رہیں۔

''اب میں اس کے قطعاً خلاف ہوں کہ آپ ''عالم اسلامی'' وغیرہ اخبارات کی اشاعت کی فکر کریں۔ اخبار اگر اعلیٰ پیمانے پر نکلے تو مفید ہوگا اور وہ نہ بحالت موجودہ ممکن اور نہ بصورت تہیہ اسباب مفید۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ایک دو ماہ صرف ایک ہی کام میں مشغول رہیں، یعنی دعوت و تبلیغ۔ اس کے بعد ان شاء اللہ ایک دوسری زندگی کو اپنے لیے آمادہ پائیں گے۔ آپ کے لیے جو امور پیش نظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا وقت جلد لائے۔ یاد رکھیے کہ کام ایک ہی مرتبہ کرنا چاہیے اور اعلیٰ پیمانے پر کرنا چاہیے، بے سروسامانی میں متعدد چھوٹے چھوٹے کاموں کو شروع کرنا اپنے مستقبل کو نقصان پہنچاتا ہے۔ مولوی عثمان صاحب آج کل کن اشغال میں ہیں؟''

خط کے آخری حصہ کا تعلق اس سے ہے کہ میں ''عالم اسلامی'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا چاہتا تھا۔ اسی وقت ''البیان'' نام کا ایک رسالہ عربی اور اردو میں میرے قلم سے نکل رہا تھا اور اسلامی ممالک میں مقبول ہو گیا تھا۔ رسالہ میری ملکیت نہیں تھا۔ آسی پریس والوں کا تھا۔ پہلے مولانا عبداللہ عمادی مرحوم اور پھر مولانا سلیمان ندوی مرحوم اس کے ایڈیٹر رہے تھے۔ مدت سے بند تھا اور میں نے بغیر کسی معاوضے کے اسے ایڈٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مالکوں کے پاس روپیہ نہیں تھا، یا خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں ہی دوڑ دھوپ کر کے اس کا خرچ مہیا کرتا تھا۔ زیادہ تر بوجھ مولانا عبدالباری صاحب مرحوم پر تھا۔ انہی حالت نے مجھے آمادہ کیا تھا کہ اردو ہفتہ وار بھی نکال دوں، تاکہ اس رسالے کے مصارف آسانی سے مہیا ہو سکیں۔

خربوزے

لکھنؤ میں کام جاری تھا اور مولانا سے خط وکتابت رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ غیر متعلق کاموں کے لیے بھی لکھا کرتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:

"برادر عزیز، السلام علیکم۔ کل مفصل خط آپ کو لکھوں گا۔ سردست ایک کام کر دیجئے۔ حکیم صاحب (اجمل خاں صاحب مرحوم) کو لکھنؤ کے خربوزے مطلوب ہیں۔ کسی واقف کار سے مدد لیجئے اور ایک من عمدہ سفیدہ لے کر اور اچھی طرح ٹوکرے میں رکھ کر بذریعہ ریلوے پارسل بھیج دیجئے۔ بلٹی پوسٹ ماسٹر کاٹھ گدام کے نام بھیجی جائے اور ساتھ لکھ دیا جائے کہ ٹوکرا وصول کر کے حکیم صاحب کے یہاں بھجوا دیا جائے۔ ٹوکرے میں خربوزوں کو عمدہ طور پر رکھنا چاہیے وہاں لوگ اس سے واقف ہیں لیکن آپ خاص طور پر تاکید کر دیجئے گا۔ لکھنؤ میں بعض تاجر باہر بھیجنے کا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص ہو، تو اسے کہہ دیا جائے۔ قیمت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو لیکن پھل عمدہ ہوں۔ روپیہ آپ دے دیں۔ آپ کو ضرورت ہوگی تو میں یہاں سے بھیج دوں گا۔"

رضائی

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ براہ عنایت لکھنؤ میں کسی کارداں شخص سے کہہ دیں کہ رضائی تیار کرا کے کلکتے بھیج دے۔ رضائی لکھنؤ سے باہر اچھی تیار نہیں ہوسکتی اور جگہ کے دھنیے ہلکی روئی بچھا ہی نہیں سکتے۔ فرد، صوفیانہ مگر عمدہ قسم کی ہو۔ استر صندلی رنگ کا۔ سُرخ نہ ہو۔ کنارے کی مغزی اودی ریشمی۔ ایک عزیز کی فرمائش ہے اور تحفہ دینا مقصود ہے۔ بیس پچیس روپیہ تک کی لاگت آئے تو مضائقہ نہیں بلکہ دو چار اور سہی لیکن عمدہ اور خوشنما ہو۔ روئی اتنی دی جائے جتنی کہ عموماً رضائی میں دی جاتی ہے۔ تاخیر نہ ہو۔"

مولانا کے ذوقِ سلیم کا ملک بھر قائل ہے۔ اوپر کے دونوں خطوں سے یہ بات ثابت ہے۔

ایک نجی خط میں لکھتے ہیں، جس پر ۱۱ مئی ۱۹۲۰ء کی تاریخ ہے۔

"حَبِّیْ فِی اللّٰہ ۔ السلام علیکم! وَفَّقَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکُم کَمَا یُحِبّہ وَیَرْضَا خط پہنچا۔ باوجود عزم مصمم فیض آباد نہ پہنچ سکا۔ عین وقت پر موانع پیش آئے۔ قلب کی شکایت کی وجہ

سے اس موسم میں سفر نہایت دشوار ہو گیا ہے، تاہم ضرورتیں ناگزیر اور ان شاء اللہ ۱۳ یا ۱۴ مئی کو پنجاب میل سے روانگی ضروری۔ بصورت ثانی ۱۵ کو پہنچوں گا۔"

۲۵۔اپریل ۲۱ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"صدیقی العزیز، السلام علیکم۔ لکھنؤ میں شیعہ کانفرنس ہے۔ بعض مصالح کی بنا پر ارادہ کر رہا تھا کہ اس میں شریک ہوؤں لیکن اب وہ خود بلا رہے ہیں اور شرکت ضروری ہے۔ میں بدھ ۲۸ کو روانہ ہوں گا اور جمعرات ۲۹ کی سہ پہر کو میل ٹرین سے پہنچوں گا۔ امید ہے آپ سے ملاقات ہو۔ خط اس لیے لکھتا ہوں کہ آپ ملیح آباد نہ چلے جائیں۔ لکھنؤ میں موجود رہیں۔ اگر کانفرنس والے مصر ہوئے، تو میں وہیں ٹھہروں گا، ورنہ فرنگی محل یا علی میاں[1] کے یہاں۔"

مدرسہ اسلامیہ کلکتہ

امامت کے معاملے کی اہمیت دفعتاً مولانا کے ذہن میں کم ہو گئی۔ اس کا سبب انہوں نے کبھی نہیں بتایا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حالات سازگار نہ دیکھے۔ مولانا محمد علی مرحوم نہایت مستعد لیڈر تھے اور طوفانی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا اثر بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور وہ مولانا کی امامت ہی کے نہیں، خود مولانا کی ذات کے بھی سخت مخالف تھے۔ دونوں میں عمر بھر رقابت رہی۔ قدرتی طور پر مولانا نے جواز حد معاملہ فہم اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے، محسوس کر لیا کہ علی بھائیوں سے تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے گا۔ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی انہی بھائیوں کے ساتھ تھا۔ پھر فرنگی محل بھی مخالف تھا اور گو شیخ الہند کی طرف سے مخالفت نہ تھی مگر دیوبند کا طاقتور حلقہ بھی مولانا کا طرفدار نہ تھا۔ اس صورت میں معاملہ امامت کو آخر تک پہنچانا، دانشمندی کے خلاف تھا۔

چنانچہ ادھر سے ہٹ گئے اور یہ تحریک جاری کر دی کہ سرکاری عربی مدارس کا بائیکاٹ کر کے نئے قومی مدرسے قائم کیے جائیں اور ایسے علماء تیار ہوں جو ضروریات زمانہ سے باخبر اور آزادی کے داعی و مجاہد ہوں۔

رانچی میں جب نظر بند تھے تو ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اب اسے بھی چلانے اور بڑھانے کی فکر تھی۔ کلکتے میں مدرسہ عالیہ سرکاری مدرسہ تھا اور بنگال کے مسلمانوں پر اس کا بڑا اثر تھا۔ اس مدرسہ کو توڑنا اور کلکتے میں ایک قومی مدرسہ قائم کرنا تھا۔ اس بارے میں مجھ سے خط و کتابت رہی۔ جو خط تلف ہونے سے بچ گئے ہیں۔ نقل کرتا ہوں۔

۱۲ ستمبر ۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

حَبِیّ فی اللّٰہ ۔ السلام علیکم۔ اِدھر عرصے سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ مولوی عثمان صاحب بھی رانچی کے لیے نہیں آئے۔ بالفعل مدارس کا معاملہ ایک نئی فوری شکل اختیار کر رہا ہے۔ ترک موالات کے سلسلے میں سرکاری مدارس سے علیحدگی، علی الخصوص عربی سرکاری مدارس سے نہایت ضروری ہے۔ بنگال میں اس کا مواد بالکل مہیا ہے لیکن ضرورت نئی تعلیم گاہوں کے انتظام کی ہے۔

''بالفعل ارادہ ہے کہ مدرسہ جامع مسجد کلکتہ جلد سے جلد کھول دیا جائے۔ روپے کا انتظام ہو چکا ہے۔ دو سو طلباء تیار ہیں۔ صرف ضرورت اساتذہ و معلمین کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس بارے میں سعی کیجئے اور تمام کاموں پر اس کو مقدم رکھیے۔

بالفعل دو جگہوں کے لیے مدرسین کا پورا اسٹاف مطلوب ہے۔ کلکتے کے لیے اور رانچی کے لیے۔ آٹھ مدرسین یہاں ہوں گے اور اتنے ہی رانچی میں''۔

''عربی ادب کی ابتدائی کتابوں سے لے کر درجہ تکمیل کے علوم تک کے لیے مدرس مطلوب ہیں۔ ابتدائی درجوں کے لیے چنداں فکر نہیں ہے لیکن کم از کم دو بہتر مدرس، کلکتے کے لیے اور دو رانچی کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سے دو شخص پرنسپل ہونے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں''۔

''وقت و ضرورت اور کام کا مقتضا تو یہ تھا کہ علماء ہندوستان کی پوری تاریخ میں کم از کم ایک نمونہ تو ایثار نفسی کا دکھاتے اور اس کام کو ایک عظیم و جلیل خدمت دینی سمجھ کر بلا معاوضہ وقت دینے کے لیے تیار ہو جاتے لیکن اس امید کو تو وہم و گمان میں بھی جگہ نہیں مل سکتی، کاش اتنا ہی ہو جائے کہ مناسب تنخواہیں لیں مگر دوسری جگہوں پر اس کو ترجیح دیں۔ بالفعل طے پایا ہے کہ تیس سے سو روپے تک تنخواہیں دی جائیں''۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ علماء کی جستجو کی جاتی ہے تو ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔ آپ کہیے کہ لکھنؤ میں کتنے آدمی مل سکتے ہیں؟ اور مقامات میں کون کون؟ علماء میں جن لوگوں کو وقت کی خدمات کا ذوق ہو ان کے لیے بہترین موقع ہے۔ قیام وغیرہ کے تمام انتظامات بہ احسن وجوہ کر دے جائیں گے، تقرر عارضی نہ ہوگا۔ ان شاء اللہ ہر طرح قابل اطمینان۔ میں کسی ایسے معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالتا جو عارضی ہو، ضرورت ہو تو آپ لکھنؤ سے باہر بھی چلے جائیں اور زبانی گفتگو کر کے انتظام کریں۔ روپیہ کی ضرورت ہو تو تار دے کر مجھ سے منگوا لیں۔

''دارالعلوم ندوہ سے کچھ لوگ مل سکیں، تو کوشش کیجیے، ضرورت ہوئی تو عارضی طور پر آپ کو بھی آ جانا پڑے گا۔ بالفعل خیال یہ ہے کہ یہاں کے تمام طلبہ میں آمادگی پیدا ہوگئی ہے، اس کو فوراً کام میں لایا جائے۔ بنگال میں نہایت کثرت سے عربی مدارس ہیں اور سب سرکاری ہیں۔ بنگال کے علاوہ اور کہیں عربی تعلیم، گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کم سے کم دو ہزار طلبہ، مشغول تعلیم ہیں۔ اتنی بڑی جماعت نے اگر عملاً اقدام کیا، تو تمام ملک پر اس کا بہت بڑا اثر پڑے گا۔ علاوہ بریں وہ مدت کی تمنائیں بر آئیں گی، جو اصلاح تعلیم کے بارے میں آج تک ناکام رہیں۔''

جواب میں اپنے خیالات میں نے تفصیل سے لکھے کہ اس اسکیم میں کس قسم کے علماء کو لینا چاہیے۔ خلاصہ یہ تھا کہ اچھے مولوی، جن میں اصلاح قبول کرنے کی صلاحیت ہو، دیوبند، ندوہ، فرنگی محل وغیرہ سے لیے جائیں اور انہیں ایک ہی جگہ رکھا جائے، تاکہ آپس میں ہر وقت ٹکرائیں اور نئے افکار اور تقاضوں کا احساس پیدا ہو۔ تنگ خیالی دور ہو اور اصلاح کی طرف رجحان بڑھے۔ دیوبند سے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا نام پیش کیا تھا۔ دارالعلوم ندوہ سے مولانا سید علی زینبی مرحوم اور مولانا عبدالرحمان نگرامی مرحوم کا اور فرنگی محل سے مولانا محمد شفیع اور مولانا محمد ایوب صاحبان کا۔

مولانا انور شاہ صاحب

مگر شروع شروع مولانا میری رائے سے پوری طرح متفق نہ ہوئے:۔

۳۰ ستمبر ۲۰ء کے خط میں اختلاف ظاہر کیے بغیر لکھتے ہیں:

حَبِیْ فی اللہ۔ السلام علیکم۔ خط پہنچا۔ مولوی سید علی صاحب کو ضرور آمادہ کیجیے۔ جو رقم وہاں مل رہی ہے اس سے اس قدر زیادہ کا انتظام ہو جائے گا کہ کلکتہ و لکھنؤ کے مخارج کا فرق پورا ہو جائے۔

''مولوی ناظر حسن چھتاری کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ مولوی انور صاحب دیوبند سے آنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے، اگر معقول مشاہرہ ہو۔ پس بہتر ہے کہ آپ فوراً دیوبند چلے جائیں۔ مولانا محمود حسن صاحب سے بھی زور دلوائیں اور مدرسہ جامع مسجد کلکتہ کی صدارت کے لیے انہیں آمادہ کریں۔ اگر یہ آ جائیں تو، کلکتے میں رہیں۔ مولوی سید علی رانچی کے صدر مدرس کر دیے جائیں، اگرچہ مولوی سید علی کے مذاق علمی کا حال معلوم نہیں۔ ادب سے تو انہیں ذوق ہے۔

''خط میں قیام کی نسبت جو لکھا تھا، اس سے مقصود یہ تھا کہ اگر تمام مدرسین آ گئے، تو ان کے قیام وغیرہ کے لیے مکان کا انتظام ہم خود کریں گے۔ ایک دو شخصوں کے لیے دقت ہوتی ہے۔

جماعت ہو تو آسانی ہے۔ بہر حال قیام کی نسبت آپ وعدہ کرلیں۔ جو تنخواہیں مل رہی ہیں، ان سے زیادہ رقوم منظور کر لیجئے۔ دیو بند آپ فوراً جائیں اور مولانا محمود حسن صاحب سے طالب اعانت ہوں۔ ان سے مشورہ لیجئے اور خطوط۔ متعدد آدمی دیو بندی حلقے کے ہاتھ آ جائیں گے۔ مقصود تعجیل ہے۔ زیادہ تاخیر میں اتلاف کار کا خوف ہے۔ ممکن ہے کہ طلبہ کی مستعدی ضعیف پڑ جائے"۔

اس خط سے مجھے کوفت ہوئی اور میں نے ذرا تند خط لکھا کہ مولانا انور شاہ صاحب کے لیے یہ بے قراری کیوں ہے؟ اور تفصیل سے وہ سب لکھ دیا، جو مرحوم مولانا انور شاہ کے بارے میں دل میں تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ مرحوم شاہ سے کبھی تفصیلی ملاقات ہوئی نہیں۔ ان کا درس بھی کبھی دیکھا نہیں، ان کی علمیت کا اندازہ بھی ہوا نہیں مگر ایک اتفاقی واقعہ نے ان سے ایک طرح کا سوءِ ظن پیدا کر دیا تھا، اگرچہ بعد میں جب حالات معلوم ہوئے، تو ان کی عظمت سے دل لبریز ہو گیا۔

ہوا یہ کہ جب میں مصر سے لوٹا، تو علم حدیث سے بالکل نا آشنا تھا۔ مصر میں حدیث کی تعلیم کا رواج ہی نہ تھا اور مجھے بڑی طلب تھی۔ ہندوستان کے رسمی مولویوں پر بھروسہ نہ تھا اور کسی واقعی محدث کی جستجو تھی۔ اسی حالت میں مرحوم و مغفور مولانا عین القضاۃ صاحب (لکھنؤ) کا رقعہ والد مرحوم کے پاس پہنچا کہ ہونے والی دعوت میں شریک ہوں اور مجھے بھی ساتھ لائیں۔ رقعے نے مجھے تعجب میں ڈال دیا کہ مولانا کو میری کیسے خبر ہوگئی؟ وہ "پیر" اور میں "وہابی" مجھے بلانے کا مطلب؟

مرحوم مولانا عین القضاۃ فرنگی محل ہی کے علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ درویش ہو گئے تھے۔ عام لوگوں کو ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ معلوم نہ تھا بظاہر کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں مگر سالانہ کئی عام دعوتیں کرتے تھے۔ شہر کا ہر آدمی ان کی دعوت میں بے روک ٹوک جا سکتا تھا اور دعوت بھی کیسی؟ اعلیٰ درجے کا پلاؤ، لکھنؤ کے نامی باورچیوں کا پکوان! سنا ہے دعوتوں پر سالانہ ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوتا تھا، مولانا یہ خرچ برداشت کرتے تھے اور مشہور ہو گیا تھا کہ انھیں دست غیب حاصل ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا آزاد نے مقبولیت حاصل کرنے کا ایک نسخہ یہ بتایا تھا کہ دعوتیں کی جائیں۔ مولانا عین القضاۃ کو بھی ان دعوتوں نے بہت مقبول بنا دیا تھا، حالانکہ مسلمانوں کو عقل ہوتی، تو سوچتے کہ پلاؤ کی یہ دعوتیں آخر کیوں؟ سالانہ ایک ایک لاکھ روپیہ کی بربادی کس لیے؟ اس ایک لاکھ سالانہ سے تو امت مسلمہ کے ہزاروں کام بن سکتے ہیں، زبان کے چٹخارے پر اس اسراف کا مقصد کیا ہے؟ مگر سوچتا کون؟

بہر حال والد کے ساتھ دعوت میں گیا۔ مولانا نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور فرمایا ''سنا ہے آپ نئے نئے مصر سے لوٹے ہیں!'' مولانا نہایت سادہ وضع میں تھے محض معمولی آدمی دکھائی دیتے تھے مگر ان کی روشن آنکھوں سے ایک بڑی روح جھانک رہی تھی۔ ان کے پاس ایک اور مقطع شکل کے مولوی صاحب بیٹھے تھے، میں نے مولانا سے عرض کیا کہ علم حدیث سے محروم ہوں۔ فرمائیے کہاں اور کس سے یہ نعمت مل سکتی ہے؟ مولانا نے کوئی جواب نہیں دیا، مسکراتے رہے لیکن مولوی صاحب بول اٹھے ''حدیث کی طلب ہے، تو دیو بند جائیے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب وہاں موجود ہیں''۔

ندوے میں بچپن گزرا تھا، اس لیے دیو بند کے خلاف طبیعت میں تعصب موجود تھا، پھر علامہ سید رشید رضا مرحوم کے درس نے مسلک سلف کا قائل کر دیا تھا اس لیے سوال کیا ''مولانا انور شاہ صاحب کا طریق درس کیا ہے؟'' مولوی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ ''میاں کیا کہنا ان کے درس کا۔ فقہ حنفی کو حدیث سے اس طرح ثابت کر دیتے ہیں کہ بس عش عش کرتے رہو!''

یہ سن کر میں سناٹے میں پڑ گیا اور مولانا عین القضاۃ صاحب کو طالب رحم نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر مولوی صاحب سے عرض کیا ''اگر حدیث اسی لیے ہے کہ فقہ حنفی کو ثابت کیا جائے، تو حدیث پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ فقہ حنفی پڑھ لینا کافی ہے'' مولوی صاحب جز بز تو ہوئے مگر کچھ بولے نہیں۔ مولانا سے پھر عرض کیا، کوئی حکم دیجئے۔ فرمایا ''آپ نے ابھی جو کچھ کہا ہے، اس کے بعد کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود ہی اپنی راہ نکال لیں گے'' پھر شاید مزید گفتگو سے بچنے کے لیے کہا ''کھانا آپ صاحبان کا منتظر ہے''۔

بس اسی بات نے شاہ صاحب مرحوم سے دل کھٹا کر دیا تھا اور اسی لیے کلکتے کے مجوزہ مدرسے کے لیے میں انھیں ناموزوں سمجھتا تھا۔ یہ مدرسہ لازمی طور پر اس لیے قائم ہو رہا تھا کہ جمود وتقلید توڑ کر روشن خیالی پیدا کرے۔ ہر چند مولانا حسین احمد کی قابلیت اور علمی مسلک سے بھی میں واقف نہ تھا مگر انھیں ترجیح دیتا تھا۔ جانتا تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب کی رفاقت انھیں مرد مجاہد بنا چکی ہے۔ وہ ضروریات زمانہ سے بھی بے خبر نہ ہوں گے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

مگر خود مولانا آزاد ایک مدت تک مولانا حسین احمد صاحب کے بارے میں متردد رہے اور مولانا انور شاہ صاحب نہ آئیں، تو مرحوم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو ترجیح دیتے رہے، جیسا

کہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہے۔ یہ خط اس زمانے کا ہے، جب میں کلکتے منتقل ہو چکا تھا اور وہ درج ذیل ہے:

الہٰ آباد۔۲۹ نومبر ۲۰ء

اخ العزیز۔ السلام علیکم۔ امید ہے کہ باطمینان مشغول کار ہوں گے۔ دہلی میں مولانا محمود حسن صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ مولوی شبیر احمد اور مولوی حسین احمد، دونوں کو اجازت دے چکے ہیں۔ مولوی شبیر بالکل تیار ہو گئے تھے لیکن بعد کو انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں سے علیحدگی ان کے بعض خاص مقاصد کے لیے مضر ہے۔ مولانا کے ساتھ ایک پوری جماعت اصحاب اغراض کی لگی ہوئی ہے۔ غرض ایک ہے اور غرض مند متعدد، اس لیے رقیبانہ کشمکش ہو رہی ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہی تنہا رہے اور دوسرا الگ ہو جائے اور اس طرح ذاتی اغراض و مفاد بلا مزاحمت حاصل ہوں۔ اس کشمکش میں ایک فریق، مولوی شبیر احمد بھی ہیں۔ پہلے انہوں نے خیال کیا تھا کہ مدرسے کی ریاست ان کے قبضے میں آتی ہے، اس لیے بلا تامل آمادہ ہو گئے۔ اب سوچتے ہیں کہ یہ علیحدگی ، مولانا حسین احمد کے حلقے کے منافع و مفاد سے انہیں کہیں الگ نہ کر دے اور دوسرے اس پر قابض نہ ہو جائیں، اس لیے متردد ہو رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی حسین احمد صاحب لے لئے جائیں۔ مولوی شبیر سے زیادہ متین و سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں اور درس تدریس میں بھی کم نہ ہوں گے۔ وہ بخوشی تیار ہو گئے ہیں۔ صرف ایک ہفتہ کی مہلت چاہی تھی۔ مولوی عبداللہ مصری کو کہہ آیا تھا کہ انتظار کریں اور پھر اپنے ساتھ کلکتہ لے جائیں۔ غالباً اب وہ روانہ ہو گئے ہوں گے یا روانگی کے لیے آمادہ ہوں گے۔ آپ طلبہ میں اعلان کر دیں کہ جمعیت العلماء کے جلسے اور مولوی محمود حسن صاحب کی علالت کی وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ اب مولوی حسین احمد آ رہے ہیں، جو پندرہ سال تک مدینہ منورہ میں درس حدیث دیتے رہے ہیں اور تمام حلقہ دیو بند میں مولانا کے بعد ہر طرح بہتر و افضل ہیں۔

"جیسا کہ پہلے سے خیال تھا، جمعیت العلماء سے بجز اس کے کوئی فائدہ نہ ہوا کہ ترک موالات پر ایک فتویٰ تیار ہو گیا اور یہ بہر حال ایک مفید اور ضروری کام ہوا"۔

"امید ہے کہ آپ مطمئن اور خوش حال ہوں گے۔ اگر مولوی حسین احمد صاحب اب تک نہ آئے ہوں، تو ایک تار، مولانا محمود حسن صاحب بذریعہ ڈاکٹر انصاری، دریا گنج، دہلی کے نام بھیج دیجئے کہ مولوی حسین احمد صاحب جلد آئیں۔ میں ان شاء اللہ ہفتہ عشرہ میں کلکتہ پہنچتا ہوں۔ خط کا جواب آپ بانکی پور کے پتے سے بذریعہ مسٹر مظہر الحق روانہ کریں۔"

کلکتہ میں میری آمد

لکھنؤ میں مولانا کی ہدایت کے مطابق کام جاری تھا کہ تار پہنچا، کلکتہ چلے آؤ اور میں فوراً کلکتہ پہنچ گیا۔ اس زمانے میں مولانا، رپن لین کے ایک چھوٹے سے بوسیدہ دو منزلہ مکان میں کرایہ پر رہتے تھے۔ اوپر کی منزل میں بھی مکانیت کم تھی اور نیچے کی منزل تو اتنی تاریک اور مرطوب تھی کہ ہر وقت پانی رِسا کرتا تھا۔

میں پہنچا تو مولانا نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی غربت کا اظہار کیا۔ پھر کمال شرافت سے فرمایا، مولوی صاحب آپ کا قیام میرے ساتھ اوپر رہے گا۔ نیچے کی منزل آدمی کے رہنے کے لائق نہیں ہے۔ یہ سن کر میں نے حیرت سے مولانا کا منہ دیکھا اور اِس اعلیٰ ظرفی اور رفیقوں پر کمال اعتماد کا دل پر گہرا اثر ہوا۔

اوپر کی منزل میں مولانا کی بیگم صاحبہ اور بیگم صاحبہ کی ایک دو بہنیں رہتی تھیں۔ میرے قیام کا مطلب یہ تھا کہ ہم سب ساتھ رہیں۔ بھلا میں یہ کیسے منظور کر سکتا تھا۔ عرض کیا، نیچے کی منزل دیکھ چکا ہوں۔ وہاں اپنی جگہ خود بنا لوں گا۔

مولانا کو تعجب ہوا مگر صبح ہی میں نے پارٹیشن کا سامان منگا کر نچلی منزل کے برآمدے کے ایک حصے کو گھیر کر اپنے لیے خاص کر لیا۔ چاروں طرف ٹاٹ لگا دیا گیا اور ٹاٹ پر سبز رنگ کی پالش کر دی گئی۔ اب یہ پورا ایک ننھا سا کمرہ تھا۔ ایک طرف میری پتلی سی چارپائی بچھ گئی۔ دوسری طرف چھوٹی سی میز اور دو کرسیاں رکھ دی گئیں۔ بس اس سے زیادہ اس شاندار صالون میں جگہ نہ تھی! مگر کمرہ دھوپ کی زد پر دن بھر رہتا تھا۔ تدارک اس طرح کیا گیا کہ میں اِدھر اُدھر سے بیلیں لے آیا اور ہر طرف بٹھا کر مالی بھی بن گیا۔ جلد بیلیں کمرے پر چھا گئیں اور کمرہ اب ٹھنڈا رہنے لگا۔

مگر ایک مصیبت لاعلاج تھی۔ میرے خود ساختہ کمرے سے ملی ہوئی دو چھاپے کی بڑی بڑی مشینیں لگی ہوئی تھیں اور جب چلتی تھیں، تو معلوم ہوتا تھا زلزلہ آ گیا ہے لیکن چند روز میں عادت پڑ گئی اور کوئی تکلیف باقی نہ رہی۔ دل کو لگی ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ مولانا اِس عجیب و غریب کمرے میں روز آکر ضرور بیٹھتے تھے۔ محض میری خاطر سے۔ مولانا کا احساس دیکھنا چاہیے۔

مدرسہ اسلامیہ کا قیام

خلافت تحریک شباب پر تھی اور مولانا کی فصاحت و بلاغت کا طوفان سمندر کی موجوں کو شرما رہا تھا۔ مدرسہ عالیہ (کلکتہ) کے طالب علم، ایک ہی تقریر سے مسحور ہو گئے اور دو ڈھائی سو لڑکے فوراً نکل آئے۔ یہاں پہلے سے انتظام تھا۔ عارضی طور پر جامع مسجد (مسجد ناخدا) کی بالائی منزل کے کمرے اور بڑا ہال لے لیا گیا تھا۔ مدرسہ شروع کرنے کے لیے فی الحال یہ جگہ کافی تھی۔

۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی نے مدرسے کا افتتاح کیا۔ افتتاح سے پہلے میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ مدرسے کا اہتمام و انتظام کس کے ہاتھ میں رہے گا۔ ان کے جواب سے مجھے حیرت ہوئی کہنے لگے، بالفعل اہتمام اپنے ہاتھ میں رکھیے۔ حیرت اس پر تھی کہ اس کم عمری میں ایسے مدرسے کا مہتمم بنوں، جس کے صدر مدرس، مولانا حسین احمد صاحب مدنی قرار پائے تھے۔ (اس زمانے میں میری عمر کم تھی)۔

ان دنوں چہرے پر داڑھی تو تھی مگر مدرسے میں پڑھنے کے لیے جو لڑکے آئے تھے، ان میں بہت سے مجھ سے بھی بڑی داڑھیوں کے مالک تھے، بلکہ بچ بچ دڑھیل تھے، میں نے ابھی تک عمامہ استعمال نہیں کیا تھا اور میرا ذوق گوارا نہ کرتا تھا کہ سر پر پگڑ لپیٹ کر مولویت کی نمائش کروں۔ ہمیشہ کھلنڈرا رہا تھا تصنع سے فطرتاً نفرت تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو کام سپرد ہو رہا ہے، اسے کیونکر انجام دے سکوں گا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ مولانا حسین احمد صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے اور مولویانہ نمائش اکیلے مجھی کو کرنا تھی!

مدرسے کے انتظام کے سلسلے میں مجھے کئی دفعہ جامع مسجد جانا پڑا مگر میری وضع ایسی تھی، کہ طالب علموں کو وہم نہ ہو سکا کہ مہتمم میں ہی ہوں۔ ۱۳۔ دسمبر کو جب افتتاح ہوا، تو بڑی بھیڑ تھی۔ گاندھی جی بھی آئے تھے اور علی بھائی بھی۔ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح بالائی منزل پر پہنچا، جہاں مدرسہ تھا مگر یہاں بھی طالب علم ایسے ہو رہے تھے، جیسے نشے میں ہوں۔ کسی نے میری پروا نہ کی۔ لڑکوں نے دھکے بھی کھائے اور سخت سست بھی سننا پڑا مگر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ کل جب معلوم ہو گا، میں کون ہوں، تو کیسے تعجب میں پڑ جاؤ گے!

گاندھی جی نے چار بجے دن کو افتتاح کیا اور چلے گئے۔ ساڑھے چار بجے پھر واپس آئے اور مدرسے کا معائنہ کیا۔ مولانا آزاد ساتھ تھے۔ بڑا پر اثر نظارہ تھا مسجد میں اور مسجد کے اوپر مدرسے میں ان گنت ہندو مسلمان پرے جمائے کھڑے تھے۔

مولانا کی تقریر

اس موقع پر مولانا نے مہاتما کو مخاطب کر کے جو تقریر کی، اس کی رپورٹ خود انہی کے قلم سے لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے۔ نقل کرتا ہوں:

مہاتما جی! آپ نے ہندوستان کے مختلف مقامات میں ترکِ موالات کا جوش دیکھا ہے۔ بہت سے کالجوں اور اسکولوں سے طلبہ کا مقاطعہ ملاحظہ کیا ہے اور پھر بہت سی افسوسناک عہد شکنیاں بھی دیکھی ہیں۔ میں ان رنج دہ واقعات کا ذکر نہ کروں گا، جو جھانسی اور علی گڑھ میں ہو چکے ہیں، تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ اس وقت طلبا کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جس کی آنکھیں آپ کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں، یہ وہ جماعت ہے، جس نے جو عہد اوّل دن کیا تھا، اب تک اس پر پوری طرح قائم ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے دین کو دنیا پر ترجیح دی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شاندار عمارت اور اس کے عالی شان ہوسٹل کو، جس میں بہترین سامان آرائش و آسائش مہیا تھا، محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا ہے اور اس طرح وہاں سے نکلی ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہی ہے اور کہاں رہے گی! یہ وہ جماعت ہے جس نے ترکِ موالات کی راہ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کی ہیں۔ بھوک پیاس کی سختی جھیلی ہے اور جاڑے کی یہ طویل راتیں، ٹھنڈی زمین پر گزاری ہیں اور اب تک گزار رہی ہے، کیونکہ سونے کے لیے اب تک اس کے پاس چار پائیاں نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جس مدرسے میں آپ اس وقت موجود ہیں، اس کی تاسیس بالفعل ترکِ موالات کے سلسلے میں ہوئی ہے مگر اس کا خیال عرصے سے میرے ذہن میں تھا اور میں مدت سے خیال کر رہا تھا کہ عربی تعلیم کو جو صرف صوبہ بنگال ہی میں سرکاری غلامی میں ہے، آزاد کراؤں۔ چنانچہ اس کے متعلق اس کے متولیوں سے بارہا گفتگو ہوئی، یہاں تک کہ بالآخر یکم ربیع الاول کو اس کی تجدید ہوگئی۔ میں نے تجدید کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ مدرسہ اس وقت سے قائم ہے، جب سے جامع مسجد بنی ہے۔ البتہ اپنی اِس نئی زندگی میں اسے مکتب کے درجے سے ہٹا کر اعلیٰ تعلیم گاہ کی حیثیت میں کر دیا گیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اِس موقع پر آپ کو اِس جماعت کی ایک ممتاز خصوصیت کی طرف توجہ دلاؤں۔ ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائص و اعمال کو پہنچائے

ہیں، ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ، ہماری نظروں سے محجوب ہوگیا ہے۔ علم، اللہ کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلاتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی، پس اب ہندوستان میں علم کو، علم کے لیے نہیں، بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں، جو انگریزی تعلیم کی نوآبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟ مشتاقان علم اور شیفتگان حقیقت سے؟ نہیں، ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالا چاول کے پرستاروں سے، جن کو یقین دلا دیا گیا ہے کہ بلا حصولِ تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کرسکتے!''

لیکن میں آپ کے علم میں یہ حقیقت لانی چاہتا ہوں کہ علم کی اس عام توہین و تذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی ایک روشنی برابر چمکتی رہی ہے۔ یہ ہندوستان کے طالبین علم کی وہ جماعتیں ہیں، جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون، مختلف عربی مدرسوں میں حاصل کررہی ہیں۔ آپ یقین کیجیے کہ بجا طور پر آج صرف یہی ایک جماعت، علم کی سچی پرستار کہی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ انگریزی تعلیم، وسیلہ رزق ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کی ڈگریاں لے کر بڑے بڑے عہدوں اور نوکریوں کے دروازوں میں قدم رکھ سکتے ہیں اور ایک کلرک سے لے کر لارڈ سنہا کی نوکری تک صرف انگریزی تعلیم ہی سے مل سکتی ہے۔ ان کو پوری طرح یقین ہے کہ عربی تعلیم کو آج کوئی نہیں پوچھتا، حتیٰ کہ روٹی بھی اس کے ذریعہ نہیں مل سکتی۔ پھر بھی ان کے دلوں میں ایک مخفی مگر طاقت ور جذبہ موجود ہے، جو انگریزی تعلیم کی طرف جانے نہیں دیتا اور اس کسمپرسی میں عربی تعلیم ہی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردیتے ہیں!''

یہ جذبہ، بجز علم پرستی اور رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتا اور اس لیے ہندوستان بھر میں علم کو علم کے لیے اگر کوئی پڑھنے والی جماعت ہے، تو وہ عربی مدارس ہی کی جماعت ہوسکتی ہے۔ علی گڑھ کے کسی طالب نے کالج نہیں چھوڑا جب تک دو دو گھنٹے تک مجھ سے ردوکد کر کے اطمینان نہیں کرالیا کہ سرکاری تعلیم چھوڑنے کے بعد بھی وہ روپیہ کما سکیں گے، حتیٰ کہ بعضوں نے مجھ سے اِس کی ذمہ داری بھی طلب کی لیکن میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ ان طلبہ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے یہ سوال کیا ہو بلکہ جس وقت ان کو احکام شرع بتلا دیئے گیے، فوراً اطاعت کا سر جھکا دیا اور سب کچھ چھوڑ دینے کے لیے تیار ہوگئے۔

میں نے اس چیز کی طرف آپ کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جوہر شناس، صرف جوہری ہی ہوسکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ اخلاص اور ایثار کے جوہر شناس ہیں!

آخر میں مولانا نے میرا بھی تذکرہ کیا، جسے قلم انداز کرتا ہوں۔

گاندھی جی کی تقریر

مولانا کی تقریر کے بعد گاندھی جی نے طالب علموں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"میں آپ لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ آپ نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔ آپ اپنے ارادوں میں مستقل رہیے۔ جو پاؤں آگے اٹھ چکا ہے، اسے پیچھے نہ ہٹائیے۔ اس وقت اسلام خطرے میں ہے۔ خلافت تباہ کر دی گئی ہے۔ مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کر لیا گیا ہے اور ہندوستان کی قومی خودداری کو پنجاب میں شکست کر دیا گیا ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمربستہ ہوں اور جو فرائض آپ کے ذمے اسلام اور ہندوستان کے ہیں انھیں ادا کریں"۔

پھر اساتذہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"طلبہ کے بجائے میں اساتذہ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنے شاگردوں کو ایسی تعلیم دیں جو انہیں سچا مسلمان اور سچا ہندوستانی بنا دے۔ قومی مدرسوں کے جاری کرنے سے صرف یہی مقصد ہے کہ ان میں ایسے لوگ تیار کیے جائیں، جو غلامی سے گریز کریں اور آزادی پر جان دیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام، بنی نوعِ انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے پس اس مدرسے کے اساتذہ، طلبہ میں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ پیدا کریں کہ جس پر مسئلہ خلافت اور سوراج کا دارومدار ہے اور میں ایک چست ہندو ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ اسلام کی سلامتی بھی میرے پیشِ نظر اتنی ہی ہے، جتنی ہندوازم کی ہے۔"

معائنے کے رجسٹر میں مہاتما نے اپنے قلم سے اردو میں یہ لفظ لکھے:

میں اِس مدرسے کی ترقی کے لیے دُآ (دعا) کرتا ہوں۔

مولانا حسین احمد صاحب

مدرسہ کھل گیا، صدر مدرس مولانا حسین احمد ابھی تک نہیں آئے تھے۔ مولانا کے مزاج سے میں واقف نہ تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں بدمزاج سمجھے بیٹھا تھا کیونکہ حج کے موقع پر منیٰ میں جب

حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پہلی دفعہ حاضری ہوئی اور معلوم ہوا کہ علامہ سید رشید رضا میرے استاد ہیں، تو مولانا حسین احمد صاحب کی زبان سے سخت ترین لفظ میرے استاد کی شان میں نکل گئے تھے اور میں لڑنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ حضرت شیخ الہند، خلق کریم کا نمونہ تھے۔ اپنے شاگرد عزیز کو سختی سے ڈانٹ دیا تھا، حالانکہ میں اس شاگرد کی گرد پا کے برابر بھی نہ تھا۔ اسی واقعہ کی وجہ سے مجھے کچھ تشویش تھی کہ دیکھا چاہیے مولانا کے آنے کے بعد کیا ہو؟ ان سے نبھتی بھی ہے؟ عمر میں، مرتبے میں مجھ سے بلند ہیں مگر مجھے ان کا افسر بنا دیا گیا ہے۔ کئی دفعہ مولانا آزاد سے اپنی پریشانی کا تذکرہ بھی کیا اور ہر دفعہ انہوں نے ہمت افزائی کی۔

آخر مولانا تشریف لے آئے اور موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے میں ٹھہر گئے۔ میری پہلی ملاقات ہوئی اور ایسی حالت میں ہوئی کہ مراد آباد کے ایک مولوی صاحب جو مدرس مقرر ہو چکے تھے اور جن کا نام نعمت اللہ تھا، مولانا کے سامنے حاضر تھے اور چاپلوسی کر رہے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی مولانا کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ''یہ صاحب مدرسے کے مہتمم بنائے گئے ہیں اور آپ صدر مدرس ہوں گے۔ اختیارات طے پا جائیں تو اچھا ہے!''

اس شرارت سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ بے موقع بات تھی مگر میں نے مولانا کے جواب سے پہلے ہی عرض کر دیا ''مدرسے میں جملہ اختیارات مولانا کے ہوں گے اور میری پوزیشن محض ایک کلرک کی ہوگی!'' اس پر معلوم ہو گیا کہ مولانا حسین احمد، واقعی شیخ الہند کے سچے جانشین ہیں۔ فرمایا ''یہ عاجز آپ کا ہر جائز حکم ہمیشہ بجا لاتا رہے گا!''

مولوی نعمت اللہ کی شرارت کا تذکرہ مولانا آزاد سے کیا، تو مولویوں کے چھچھورپن اور فسادی طبیعت پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔

قرنطینہ!

مولانا سے بے تکلفی ہو چکی تھی۔ خود انہوں نے زبردستی پیدا کر لی تھی۔ چائے پر اور کھانے پر ہنساتے ہنساتے پیٹ پھلا دیتے اور چھیڑ چھیڑ کر ایسے سوال کرتے کہ میں بھی کھل کر چہچہانا شروع کر دیتا۔ خود بھی خوب ہنستے اور لطف اٹھاتے۔ مدرسے کے سلسلے میں ہمارا ایک مذاق یہ بھی تھا کہ مدرسے کو ''قرنطینہ'' کہتے اور اس سلسلے میں ایسے ایسے لطیفے ہوتے کہ نوٹ کر لیے جاتے، تو دلچسپ کتاب بن جاتی۔

بات یہ تھی، جیسا کہ اوپر گزر چکا، مولانا سے طے پایا تھا کہ مدرسے میں مختلف خیال کے صلاحیت رکھنے والے علماء جمع کیے جائیں۔ ساتھ رہیں اور آپس میں بحثا بحثی میں مصروف رہا کریں۔ خیال تھا، اس طرح ان کے ذہنوں پر کا زنگ اتر جائے گا اور وہ روشن خیال بن کر ضروریات زمانہ کے مطابق نئے علماء ڈھال سکیں گے۔

اس لحاظ سے مدرسے کو واقعی علماء کے لیے ذہنی قرنطینہ کہنا درست تھا، سب مولوی، موسیٰ جی کے مسافر خانے میں ٹھہرائے گئے تھے اور ان میں برابر چونچیں چلا کرتی تھیں۔ میں افسر تھا اور میرے لیے نامناسب تھا کہ بحث میں شریک ہوں۔ میرا کام بس یہ تھا کہ کوئی معاملہ، مسئلہ، ایک مستفہم کی طرح سامنے رکھ دیتا اور مولوی صاحبان کئی کئی دن بحث کرتے رہتے۔

آج بھی مولویوں کی بڑی ٹکسالیں چار ہیں: دیوبند، مراد آباد، ندوہ، فرنگی محل۔ ان ٹکسالوں کے اچھے اچھے سکے، مدرسے میں جمع کر لیے گئے تھے۔ ندوے سے مولانا عبدالرحمان نگرامی چنے گئے تھے۔ مرحوم جوانی ہی میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ زندہ رہتے تو بڑے آدمی بنتے۔ پرہیز گاری اور حسن اخلاق کا نمونہ تھے۔ علمی کمالات سے آراستہ تھے۔ تقریر و تحریر میں فرد تھے اور روشن خیالی؟ تو سبحان اللہ، مولانا نگرامی سے بڑھ کر کون روشن خیال ہوگا۔ اور سادگی؟ تو سادگی میں گاندھی جی سے بھی بہت آگے تھے۔ تکیے تک کی ضرورت نہ تھی۔ تن کے لیے سستے سے سستے کپڑے کا کُرتا پائجامہ اور پیٹ کے لیے گھٹیا سے گھٹیا کھانا۔ اس کے علاوہ مرحوم کی اور کوئی ضرورت نہ تھی۔ ذاکر دائم، شب بیدار، حالانکہ عنفوان شباب تھا!

مرحوم کو مجھ سے گویا عشق تھا اور مولانا آزاد سے گہری عقیدت۔ یہ زندہ دل زاہد اور صوفی با صفا بھی اس ''سازش'' میں شریک تھا۔ مولانا آزاد، نگرامی مرحوم سے بے تکلف نہ تھے مگر اکثر خود مولانا ہی ''پالی'' کے لیے ''دانہ'' تجویز کر دیتے تھے اور بارہا میں یہ ''دانہ'' مولانا عبدالرحمان کی مٹھی میں پہنچا دیتا تھا اور مولویوں کی ''پالی'' شروع ہو جاتی تھی۔ یوں تو ''پالی'' دن بھر جاری رہتی تھی مگر عروج دوپہر کو ہوتا تھا، جب ایک گھنٹے کی چھٹی میں مولوی صاحبان، دسترخوان پر براجتے تھے۔ رات کی چونچوں کی تفصیل مولوی نگرامی سے معلوم ہو جاتی تھی اور میں سہ پہر کی چائے پر مولانا کو روداد سناتا اور وہ بہت محظوظ ہوتے۔

سنجیدگی سے ان کا اور میرا خیال تھا اور میرے خیال میں ابھی تک تبدیلی نہیں ہوئی کہ مختلف الخیال مولویوں کو ایک مدت ساتھ رکھنا چاہیے۔ آپس کی دوستانہ بحث سے ان میں اعتدال پیدا ہو

جائے گا۔ ذہن کی خشکی دور ہوگی، جمود و تقلید کی سلیں پاش پاش ہو جائیں گی اور اس طرح اصلاح امت کی راہ صاف ہو جائے گی۔ مگر ضروری ہے کہ روشن خیال آدمی اس ''قرنطینے'' کے انچارج ہوں اور لطف و حکمت سے مولویوں کی تربیت کریں، ورنہ یہ لوگ بے مہار چھوڑ دیئے گئے تو لاطائل دقیانوسی بحثوں ہی میں الجھے رہیں گے، بلکہ عجب نہیں خون خرابے پر بھی اُتر آئیں۔

کام کی مشکلات

مدرسے میں تعلیم شروع ہوگئی۔ ابتدا سے تکمیل تک سب درجے کھل گئے۔ میرا کام ذرا مشکل تھا، پڑھانے والے، مولوی صاحبان تھے اور پڑھنے والے، زیادہ تر بنگالی لڑکے۔ مولوی صاحبان بس یہ کافی سمجھتے تھے کہ اپنی درسی تقریر جاری رکھیں: کچھ پروا نہیں کہ لڑکے سن رہے ہیں یا کسی اور شغل میں پڑے ہوئے ہیں۔

بنگالی طالب علموں میں دو عادتیں عام تھیں: تھوکنے کے لیے بار بار اٹھنے اور سبق میں دوسرے لڑکوں کے پیچھے لیٹ کر سو جانا۔ یہ حرکتیں میرے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ میں نے استادوں کو مجبور کیا کہ لڑکوں پر کڑی نظر رکھیں اور خود بھی بڑی سختی سے نگرانی کرنے لگا۔ تھوکنے کا بہانہ اس طرح ختم ہوگیا کہ تمام درجوں میں اگالدان رکھ دیے گئے اور سو جانے کی عادت اس طرح چھڑائی کہ گھنٹے میں کئی کئی بار پورے مدرسے کی گشت کرتا اور جو لڑکا سوتا یا اونگھتا نظر آ جاتا، اسے فوراً اٹھا دیتا کہ جاؤ اور سو رہو۔ اس حال میں تمہارا درجے میں رہنا بے فائدہ ہے۔

لیکن ایک اور مشکل بھی تھی۔ میں مدرسے کا مہتمم تھا۔ قدرتی طور پر لڑکے میری قابلیت جانچنا چاہتے تھے، یا واقعی انھیں کتاب میں کوئی اشکال نظر آتا تھا اور مجھ سے رجوع کرتے تھے۔ پہلی دفعہ جب یہ معاملہ پیش آیا، تو میں نے صاف کہہ دیا کہ عجمی ملاؤں کی عبارتوں کا مطلب مجھ سے نہ پوچھو۔ ان ملاؤں نے جس ''عربی'' میں کتابیں لکھی ہیں، اسے خود ہی سمجھتے ہیں یا وہ لوگ جو نسلاً بعد نسلِ ان کے شاگرد چلے آئے ہیں۔ البتہ مسائل دریافت کر سکتے ہو مگر وہ مسائل بھی نہیں جو فقہا نے اپنی کج فہمی سے گڑھے ہیں۔ اس صاف بیانی نے مجھے بڑی مصیبتوں سے بچا لیا۔ شام کو یہ واقعہ مولانا سے بیان کیا، تو بہت ہنسے اور داد دی کہ آپ نے یہ بہت اچھا کیا۔ اسی طرح ان ملاؤں کا ذہنی تنقیہ ہوگا۔ شاید ایسی کتابوں سے خود بھی شرمانے لگیں اور اس خرافات کے سمجھنے پر فخر کرنا چھوڑ دیں۔

مدرسہ تو جاری ہو چکا تھا، مگر مدرسے کا کوئی فنڈ نہ تھا۔ اسی وقف پر بھروسہ تھا، جو جامع مسجد (مسجد ناخدا) کے قدیم مدرسے کے لیے چلا آتا تھا۔ وقف کی آمدنی کم نہ تھی، مگر متولیوں نے

مدرسے کو مکتب بنا ڈالا تھا اور وقف کی آمدنی مال مفت سمجھ لی تھی۔ اب مدرسہ قائم ہوا تو متولی بہت پریشان ہوئے تحریک زور پر تھی، مولانا آزاد مدرسے کے بانی تھے، اس لیے روپیہ دینے سے صاف انکار نہیں کر سکتے تھے، مگر دینا بھی نہیں چاہتے تھے۔

اسی وجہ سے مالی مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ روپوں کے معاملہ میں بڑے کچے دل کا آدمی ہوں۔ کسی سے روپیہ مانگنا، چاہے خود میرا ہی ہو، مجھ سے بن نہیں پڑتا۔

ایک دفعہ مدرسے کے لیے روپے کی سخت ضرورت پڑی۔ مولانا نے حکم دیا کہ متولی، سیٹھ احمد زکریا سے لے آؤ۔ میں نے اس معاملے میں اپنی بزدلی بیان کی تو ہنسے اور کہنے لگے ''مولوی صاحب، آپ بھی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ زکریا کوئی شیر نہیں کہ آپ کو کھا جائے گا۔ شیر بھی ہو، تو آپ ملیح آباد کے پٹھان ہیں جبڑوں میں انگلیاں ڈال کے کلّے چیر ڈالئے گا!'' مجبوراً جانا پڑا، مگر نتیجہ جو کچھ ہوا، نیچے کے رقعے سے معلوم ہوگا، جو میں نے لوٹ کر مولانا کو لکھا:

''مسٹر احمد زکریا کے یہاں گیا تھا، دربان سے اطلاع کرائی۔ جواب آیا، اس وقت نہیں مل سکتے۔ کسی اور دن ذرا سویرے آنا۔ مجبوراً جناب کا خط بھیج دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا، خط رکھ لیا ہے۔ اس وقت نہیں ملیں گے۔ ارادہ ہوا کم سے کم رجسٹر (مدرسے کے حساب کا رجسٹر) طلب کر لوں، مگر دربان نے تیسری دفعہ جانے سے بڑی ترش روئی کے ساتھ انکار کر دیا۔ انتہائی خفت کے ساتھ واپس آیا ہوں[3]''۔ (۱۳ جنوری ۱۹۲۱ء)

مولانا نے رقعہ ہی پر یہ جواب لکھا:

''افسوس ہے کہ اس نالائق کے یہاں جا کر آپ کو یہ ناگوار واقعہ پیش آیا۔ خیر آئندہ آپ کو جانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ آج صبح میں نے متولیوں سے احتیاطاً کہہ دیا تھا کہ اوقاف مدرسہ کی وصولی کا تعلق آئندہ عبداللطیف یا احمد سے ہم نہیں رکھ سکتے۔ وہ بطور خود انتظام کر لیں۔ حاجی محمد زکریا نے اس غرض سے کل چار بجے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ انشاءاللہ یہ تمام مشکلات اب دور ہو جائیں گی۔''

مولانا کے قلم برداشتہ رقعے

اردو دنیا مولانا کے قلم سے مسحور ہے، مگر اردو دنیا کو مولانا کے قلم کے وہی معجزے پہنچے ہیں، جو خود مولانا نے بڑی محنت سے سنوارے تھے۔ اردو دنیا کی بڑی طلب یہ بھی ہے کہ مولانا کی بالکل

قلم برداشتہ تحریریں دیکھیے کہ اسی سے ادیب کو اچھی طرح پرکھا جاسکتا ہے۔خوش قسمتی سے میں اردو دنیا کی یہ مانگ کچھ نہ کچھ پوری کرسکتا ہوں۔

سالہا سال ہر وقت حاضر باش رہنے کی وجہ سے پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مولانا اپنے نج کے خطوں میں کوئی انشا پردازی نہیں برتتے تھے۔ان کا یہی دستور ہمیشہ دیکھا کہ قلم اٹھایا اور خط لکھ دیا۔اس تیزی سے لکھتے تھے کہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ صنائع وبدائع یا انشاء پردازی کا دل میں خیال بھی ہوگا۔

پچھلے صفحوں میں مولانا کے کئی قلم برداشتہ خط نقل کر چکا ہوں، مگر اس چیز کا زیادہ صاف مظاہرہ ان رقعوں سے ہوگا، جو میں انھیں لکھتا اور وہ انہی رقعوں پر فوراً جواب دے دیتے۔مولانا کی یہ تحریریں یقیناً قلم برداشتہ ہیں اس لیے قابل توجہ ہیں۔

اب میرے رقعے اور ان کے جواب پڑھیے:

''مدرسے کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔کتابوں کی تجلید ہونی ہے۔دفتر کے لیے دو کرسیاں اور ایک اسٹول لینا ہے۔مولانا شفیع (فرنگی محل) کے لیے لال ٹین کی ضرورت ہے''۔

جواب

''لیکن بالفعل روپیہ بالکل نہیں ہے۔آج سہ پہر کو خود اسی غرض سے جانے والا ہوں''۔

''کل یکم ربیع الثانی ہے۔اساتذہ کو اور ان طلبہ کو، جن کے وظائف ہیں، روپیہ دینا ہوگا۔ ایک مہینہ پورا ہوگیا۔مسٹر احمد نے ۱۵ دسمبر کو بلایا ہے۔ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟ کس طرح کام چلایا جائے؟ بعض طلبہ تو اس درجہ قابل رحم ہیں کہ ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔بعض خوشحال ہیں، مگر والدین ان سے ترک موالات کر چکے ہیں۔سخت پریشانی ہے۔سمجھ کام نہیں کرتی۔غالباً متولیوں سے ملاقات نہ ہوسکی ہوگی''۔

جواب

''کل صبح مجھے اندازاً بتا دیجیے گا کہ بالفعل ان طلبہ کی ناگزیر اعانت کے لیے کس قدر چاہیے تاکہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔پھر ان شاءاللہ جنوری میں تمام انتظامات ہوجائیں گے۔آج متولی سے بھی اس بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔وظائف کی نسبت وعدہ لے لیا ہے''۔

مدرسے کے لڑکوں نے ضد شروع کی کہ چرخے منگائے جائیں۔ سوت کاتیں گے۔ میں بھی اس ضد میں لڑکوں کے ساتھ تھا، ان دنوں چرخہ چلانے میں مجھے بھی بہت غلو تھا، حتیٰ کہ ٹریم وغیرہ میں بھی تکلی ساتھ رکھتا اور سوت کاتا کرتا۔ ذیل کے رقعے میں چرخے کے علاوہ اور باتوں کا بھی تذکرہ ہے:

''چرخے کے لیے طالب علم بہت مصر ہیں۔ کہتے ہیں نیشنل کالج ہمارے بعد قائم ہوا اور اس کے لڑکے چرخہ چلانا سیکھ گئے، مگر ہمارے یہاں ابھی تک اس کا کوئی انتظام نہیں۔ اس وقت بارہ چرخے مولوی منیر الزماں کے یہاں موجود ہیں۔ ہر چرخے کی قیمت چار روپیہ ہے۔ لگ بھگ اتنے ہی چرخے، راجپوتانہ سودیشی اسٹور میں بھی ہیں۔ یہ پنجاب کے بنے ہوئے ہیں اور مہنگے ہیں، گیارہ بارہ روپیہ قیمت ہے۔ سردست پانچ چرخے بھی مل جائیں، تو مدرسے کا کام چل جائے اور لڑکوں کے لیے نئی مشغولیت بھی نکل آئے۔

فی الحال میں اور دو اور مدرس رہ گئے ہیں۔ مولوی شفیع بھی سلہٹ چلے گئے ہیں۔ خلافت کے کاموں کی وجہ سے مدرسے کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ طلبہ کہتے ہیں کہ دو ہفتے امتحان کی تیاری کے لیے کافی نہیں۔ کم سے کم ایک مہینہ ملنا چاہیے۔ اساتذہ بھی نہیں ہیں۔ کیا حرج ہے اگر یکم رجب سے امتحان کی تیاری کے لیے موقعہ دے دیا جائے اور یکم شعبان سے امتحان شروع ہو کر ۸ شعبان کو ختم ہو جائے، تا کہ دو ہفتے تو رمضان سے پہلے طلبہ تبلیغ کا کام کر سکیں۔ جو حکم ہو، وہی کیا جائے''۔

جواب

''مجھے صبح چار بجے سے سخت پیچش ہو گئی ہے اور طبیعت معطل ہے۔ اگر مولوی منیر الزماں صاحب کے یہاں چرخے عمدہ ہیں تو آج ہی پانچ چرخے وہاں سے منگوا لیے جائیں۔ قیمت ان کو دے دی جائے گی، یا یوں کہیے کہ جس قدر ان کے پاس ہوں، خلافت کمیٹی خرید لے اور کمیٹی سے حسب ضرورت مدرسے کے لیے لے لیے جائیں۔ فضل دین کو کہہ دیجئے۔ امتحان کی مدت بڑھا دی جا سکتی ہے۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔''

''کل آٹھ چرخے آ گئے ہیں۔ ماہ جمادی الثانی ختم ہے۔ آج ۲۷ ہے۔ ایک طالب علم، جو مدرسے کا سب سے اچھا طالب علم ہے، ترک موالات کے سلسلے میں پچاس روپے کا مقروض ہو گیا تھا۔ تیس ادا کر چکا ہے۔ بیس رہ گئے ہیں، مگر قرض خواہ اسے ذلیل کر ڈالنے پر تلا ہوا ہے۔ غریب طالب علم بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ وہ بس اتنی ہی رقم قرض چاہتا ہے۔ بارہ روپیہ اسے وظیفہ ملتا

ہے۔ چاہتا ہے کہ جو رقم اسے قرض دی جائے گی، پانچ روپیہ مہینہ کر کے کاٹ لی جائے اور اس کی عزت بچالی جائے، مگر میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔ جو حکم ہو کروں۔"

جواب

کل میں اسی غرض سے ملنا چاہتا تھا، مگر آپ موجود نہ تھے۔ مہینہ اگر ختم ہو گیا ہے تو تنخواہ کی حسب معمول فہرست لکھنی چاہیے۔ اور تنخواہیں بانٹ دینی چاہئیں پرسوں (سے) متولین سے گفتگو ہو گئی۔ عارضی طور پر وہ ابھی روپیہ دیتے رہیں گے اور مستقل انتظام اپنی کمیٹی کی منظوری کے بعد کریں گے۔ پس اگر تنخواہ کا بل بن جائے، تو وہاں بھیج دیا جائے۔ باقی رہی آپ کی رقم، تو اس کو بھی ماہ گزشتہ کے قرض میں دکھلا دیجئے۔ طالب علم کو آپ ماہ آئندہ کی رقم وظائف سے دے سکتے ہیں، جو بل میں مجموعی درج ہوگی۔"

مولانا کے اس جواب میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک (سے) کو میں نے قوسین میں لکھا ہے۔ یہ سے، مولانا جلدی میں لکھ گئے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کی ہزاروں قلم برداشتہ سلپیں نظر سے گزر چکی ہیں، مگر کبھی ان کی تحریر میں اس قسم کا سہو نہیں دیکھا۔ ان کے لکھنے میں نہ کوئی لفظ چھوٹتا تھا نہ بڑھ جاتا تھا۔ یہ مثال بالکل مستثنیٰ ہے۔

جبہ

میں مدرسے کا مہتمم تھا، مگر چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی ہونے پر بھی کوئی مجھے مولوی نہیں سمجھتا تھا۔ لڑکوں پر بھی اثر نہیں ہوتا تھا، طبیعت کو تصنع سے سخت بے زاری تھی پھر بھی ایک کام کی ذمہ داری آپڑی تھی اور چاہتا تھا کہ حتی الوسع بہتر سے بہتر طریقے پر نباہوں۔ مولانا سے اپنی مشکل بیان کی۔ خوب ہنسے اور لوگوں کی وضع قطع پر، خصوصاً مولویوں کی ہیئت پر ایک پورا ظریفانہ لیکچر دے ڈالا۔ پھر فرمانے لگے "مولوی صاحب، آپ کی اس ناقابل برداشت مصیبت میں کیا کام آسکتا ہوں؟" عرض کیا، اپنا جبہ کچھ دنوں کے لیے دے دیجئے۔ جبہ کچھ نہ کچھ مولوی بنا دے گا کہنے لگے "مگر مولوی صاحب، آپ کا سراپا، مولویت کی ضد ہے۔ یہ سوانگ آپ کے بس سے باہر ہے لیکن جبہ لیتے جائیے۔"

مدرسے میں جبہ میں نے پہننا شروع کر دیا لیکن جلد ہی بھانپ لیا کہ لڑکے اس بہروپیے پن پر ہنستے ہیں! وہ مجھے مولوی ماننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ میں مولوی تھا بھی نہیں لیکن اس مہم میں ناکامی کے بعد جبہ، مولانا کو واپس کیسے کیا جائے؟ جانتا تھا بناتے بناتے اتو کر ڈالیں گے۔

بہت سوچ کے میں نے جبے کے ساتھ یہ رقعہ بھیجا:

''جبہ واپس ہے۔ غالباً خود آپ کو ضرورت ہوگی۔ جناب کا نیا جبہ جب سل جائے گا، تو یہ پرانا خالی ہو جائے گا اور میرے کام آئے گا۔''

مگر مولانا تو اڑتی چڑیا کے پر کاٹتے تھے۔ معاملہ بھانپ گئے۔ دیکھیے کیا جواب لکھتے ہیں:

''اس محبت کے لیے شکر گزار ہوں! سردست ایک گرم جبہ تو میرے پاس ہے۔ البتہ اس وضع کا سلوانا چاہتا ہوں۔ آپ کے پاس رہے۔ جب کپڑا لے لیا جائے گا، تو نمونے کے لیے درزی کو دے دیں گے۔''

رقعہ کے ساتھ جبہ بھی آ گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ صبح میں جبہ لیے پہنچا اور عرض کیا اس نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ میں باز آیا! مولانا بہت ہنسے اور عادت کے مطابق پھبتے کی مناسبت سے دیر تک ایسے ایسے لطیفے سناتے رہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ پھول گیا۔

ایک دفعہ لڑکوں نے آخری چہار شنبہ کی چھٹی کے لیے ضد کی۔ میں نے مولانا کو لکھا تو جواب آیا:

''آخری چہار شنبے کا تخیل، مشرکین جاہلیت کے خیالات کا بقایا ہے۔ جس کی نسبت حدیث ہے کہ **لَاھُولَ وَ لَا صَفَرَ** لیکن اگر تعطیل کی رسم ہے، تو بلا اقرار تعطیل کر دیجیے''۔

مدرسے کی مشغولیت کے علاوہ مجھے اور کام بھی کرنا پڑتے تھے، جیسے مولانا سے لوگوں کو مرید کرانا (بیعت جہاد ہوتی تھی) ایک شام کچھ لوگ مرید ہونے آ پہنچے۔ میں نے اطلاع دی، تو جواب آیا:

''میں ایک بجے سے نکلا ہوا اب واپس آیا ہوں۔ مٹیا برج کے جلسے میں نہایت پریشانی پیش آئی۔ اس کے بعد بھی تمام وقت مغز پاشی میں صرف ہوا، اسی لیے اور لوگوں سے بھی نہ مل سکا اور بیعت کے لیے کل شام کو بلایا۔ اگر یہ بھی کل بعد مغرب آ جائیں، تو اطمینان کے ساتھ یہ معاملہ انجام پائے''۔

یاد نہیں مولانا حسین احمد صاحب تھے یا کوئی اور صاحب، غالباً اول الذکر ہی تھے، شام کو ملنے آ گئے۔ کسی کو نوکری دلانے کی سفارش لائے تھے اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ پیدل چل کر آ رہے ہیں، میں نے اطلاع دی، تو ذرا ترش جواب آیا:

"سردست کون سی ملازمت ہے، جس کا انتظام کیا جا سکتا ہے؟ ملاقات کے لیے جب انہوں نے کہا تھا، تو آپ کم سے کم میرے اوقات کا لحاظ رکھتے۔ مدرسے میں بالفعل کوئی گنجائش نہیں۔ اور کوئی مدرسہ میرے ہاتھ میں بھی نہیں۔ کاش اس وقت پیدل آنے کی زحمت ان کو نہ دی گئی ہوتی۔ اس وقت اس درجہ پریشان خاطر ہوں کہ فضل دین صاحب سے حساب کے چند الفاظ سننے سے بھی اُکتا گیا۔ آپ ان کو گاڑی منگوا دیجئے اور کرایہ بدرالدین سے گاڑی والے کو دلا دیجئے تاکہ واپسی میں زحمت نہ ہو اور میری طرف سے معذرت کر دیجئے"۔

ایک سرحدی صاحب تشریف لائے۔ بڑی بڑی انقلابی اسکیموں کے مصنف تھے، مگر تھے حقیقت میں ٹھگ۔ مولانا دیکھتے ہی تاڑ گئے اور ٹرکا دیا لیکن دوسرے دن وہ پھر آ دھمکے اور اپنی مالی پریشانیوں کا حال مولانا کو لکھ بھیجا۔ جواب میں مولانا نے مجھے لکھا:

"نیچے وہ سرحدی شخص آیا ہے، جو کل بھی آیا تھا۔ آپ اسے تنہائی میں یہ پندرہ روپے دے دیں اور میری جانب سے کہہ دیں کہ آپ کے مصارف کے لیے دیئے گئے ہیں، قبول کیجئے اور روانہ ہو جایئے۔ باقی اور کوئی انتظام بالفعل نہیں ہو سکتا۔ ان "امور کا خیال ترک کر دیں"۔

اُنہی دنوں جامع مسجد (مسجد ناخدا) کلکتہ کا مقدمہ درپیش تھا۔ پبلک اور متولی دونوں فریق نے مولانا کو پنچ بنا دیا تھا۔ مقدمے کی تفصیلات یاد نہیں لیکن مولانا کا فیصلہ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اس سے تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں۔

مولانا کی عادت تھی کہ جس کام کو فوراً کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ چاہے ایک ہی دو گھنٹے کا ہو، ہفتوں، مہینوں، بلکہ برسوں لگا دیتے تھے اور ٹال مٹول کے بھی دلچسپ طریقے اختیار کرتے تھے۔ اس مقدمے میں بھی یہی ہوا۔ فیصلہ نہ آج ہوتا ہے نہ کل۔ آخر پبلک بھی چیخ اُٹھی اور متولی بھی سر پیٹنے لگے۔ اب مولانا کو معاملہ ختم کر دینے کی مجبوری تھی مگر دیکھئے ٹالنے کی کیسی راہ اختیار کی ہے۔ مجھے لکھتے ہیں:

"مدرسے میں انگریزی و حساب جو شخص پڑھاتے ہیں، غالباً محمد یوسف نام ہے، ان سے آج کہہ دیجئے گا کہ متولیان مسجد، فیصلہ مقدمہ کے لیے متقاضی ہیں، اس لیے جمعرات کے دن نو بجے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ تمام مدعیان مقدمہ کو بھی وہ اطلاع دے دیں۔ اگر کسی وجہ سے مدعی تاخیر چاہتے ہیں، تو اب میں خود آور تاخیر نہیں کر سکتا۔ ان کو چاہیے کہ خود حاجی محمد زکریا سے مل کر کوئی عذر کر دیں اور چند دنوں کی تاخیر کے طلب گار ہوں، مثلاً وہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام مدعی موجود نہیں، یا اس دن نہیں آ سکتے۔ دوسرا دن مقرر کیا جائے"!

ایک ایرانی مسافر انہی دنوں آ گئے۔ مولانا سے ملے اور متاثر کیا۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''السلام علیکم۔ مسافر ایرانی کے لیے خلافت کمیٹی والوں سے کہہ دیا ہے۔ وہاں سے ساٹھ روپیہ آج سہ پہر تک ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہ آج شام کی گاڑی سے لاہور روانہ ہو جائیں اور وہاں آغا صفدر صاحب سکریٹری خلافت کمیٹی سے ملیں۔ وہ آگے کے لیے ان کا انتظام کر دیں گے اور کسی طرح کی زحمت پیش نہ آئے گی۔ آغا صفدر سے ان کو اپنے تمام حالات بیان کر دینے چاہئیں۔ مزید اعتماد کے لیے خلافت کمیٹی بنگال کی جانب سے ایک خط بھی روپیہ کے ساتھ ان کو مل جائے گا۔''

مدرسے کے لیے روپیہ کی بڑی حیرانی رہتی تھی۔ متولی ہزاروں بہانوں سے کام لے رہے تھے۔ ایک دن حالت بہت بگڑ گئی۔ روپیہ کی فوری اور اشد ضرورت تھی۔ مولانا کو اطلاع دی تو روپیہ کے ساتھ یہ پرزہ پہنچا:

''السلام علیکم ۸۰ مرسل ہیں۔ آپ مختار ہیں، جس طرح مناسب سمجھیں، طلبا کو اس سے مدد دیں اور اس رقم کو درج حساب کر لیں۔ یہ میں نے اپنے پاس سے دی ہے۔ فنڈ سے مطلوب ہو گی۔'' رقعہ ملنے کی تاریخ ۱۰ نومبر ۱۹۲۰ء ہے۔ میرے یا بدرالدین مرحوم کے قلم سے پڑی ہے۔

''پیغام''

مدرسہ کامیابی سے چل رہا تھا، مگر خلافت اور سوراج کی تحریک کا زور بہت بڑھ چکا تھا اور مدرسے جیسے ٹھنڈے کام کو میں اپنے مزاج کے مطابق نہیں پاتا تھا۔ آخر مولانا پر زور دینا شروع کیا کہ وقت کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ کلکتے سے فوراً ایک اخبار جاری کر دیا جائے، روزانہ نہ سہی، ہفتہ وار سہی۔ مولانا کے ذہن میں اخبار کا تصور ''الہلال'' کا جیسا تھا لیکن میں اس تصور کی مخالفت کرتا رہا۔ آخر مولانا مان گئے کہ ہفتہ وار سستا اخبار نکالا جائے جو عوام کو سادہ بول چال میں مخاطب کرے۔ اخبار کا نام ''پیغام'' تجویز ہوا اور میں اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ میری رائے تھی کہ اخبار کا نام ''پیغام'' نہیں جو ثقیل ہے ''پیام'' رکھا جائے، مگر مولانا اس وقت تک بھاری بھر کم الفاظ پسند کرتے تھے۔

اخبار کی رائے پکی ہو گئی، مگر میری پریشانی بڑھ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مولانا کا اخبار کیسے ایڈٹ کر سکوں گا؟ ابھی تک میرا اخباری تجربہ گویا کچھ بھی نہ تھا۔ مضمون نویسی کی مشق تو بہت پرانی تھی۔ مصر میں بھی برابر مضامین لکھا کرتا تھا، جو جنگ کی وجہ سے کہیں چھپتے نہ تھے۔ قسطنطنیہ کے

اخبار ''جہان اسلام'' کو بھی ایڈٹ کر چکا تھا۔ ہندوستان میں واپسی کے بعد اخباروں، رسالوں میں مضامین نکلتے رہے تھے۔ لکھنؤ سے ''البیان'' بھی میری ایڈیٹری میں نکل چکا تھا مگر مولانا کا اخبار کچھ اور ہی چیز تھا اور میں ڈرتا تھا کہ اس ذمہ داری کا کہیں اہل نہ ثابت ہوں۔

مولانا سے اپنی پریشانی بیان کی، تو عادت کے مطابق دیر تک ہنستے اور بناتے رہے پھر سنجیدہ ہو کر حوصلہ افزائی کی اور فرمایا ''آپ کو اہل نہ سمجھتا، تو یہ ذمہ داری سونپتا کیوں!'' ایک مشکل یہ بھی تھی کہ ان دنوں مولانا زیادہ تر دورے پر رہتے تھے اور اخبار مجھی اکیلے کو چلانا تھا۔ بروقت ان کی رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

باب فتح و مقصود کا افتتاح

بہر حال ''پیغام'' جاری ہو گیا۔ خوش قسمتی سے رحمت علی صاحب قطبی دہلوی سے ''پیغام'' مرحوم کی فائل حاصل ہو گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلا پرچہ ۲۳۔ ستمبر ۱۹۲۱ء کو نکلا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ مولانا محمد علی اور شوکت علی اپنے رفیقوں کے ساتھ کراچی میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ''پیغام'' کے پہلے نمبر کے سرورق پر مولانا نے ایک چھوٹا سا مضمون دیا، جو آج بھی پڑھنے کے لائق ہے، سرخیاں ملاحظہ ہوں:

باب فتح و مقصود کا افتتاح۔

محمد علی شوکت علی کے سفر حق کا اختتام اور گرفتاریوں کی ابتدا!

قِفَا نَبْکِ مِنْ ذِکْرَیٰ حَبِیْبٍ وَّمَنْزِلٖ!

باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد می دہد — ہر کہ بہ عشق نیست' خوش عمر بباد می دہد!
جلوۂ کاروان مانیست بہ ناقہ و جرس — عشق تو راہ می برد شوق تو زاد می دہد!

اب اصل مضمون پڑھیے:

''اٹھارہ مہینے ہوئے جب محمد علی شوکت علی نے نظر بندی سے رہا ہونے کے بعد راہ حق و حریت میں ایک دوسرا سفر شروع کیا تھا۔ آج اعلان کیا گیا ہے کہ یہ سفر ختم ہو گیا اور مسافر منزل مقصود پر پہنچ گئے: وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ! یہ ان کا فرض تھا، جو انہوں نے پورا کر دیا لیکن ملک بھی اپنا فرض پورا کرنے کے لیے تیار ہے؟ ملک کا فرض نہ تو دلوں کے اضطراب میں ہے، نہ صداؤں کے غلغلے میں نہ شورش و بدامنی میں، نہ جلسوں کی تجویزوں اور جوش کے

اظہارات میں، نہ اسٹرائک، نہ ہڑتال، نہ محض زبان، نہ محض قلم بلکہ ہر اس وجود کے لیے جوان دونوں جاں نثاروں کی عزت ومحبت کا مدعی ہو، عزم کی دعوت ہے۔ ہمت کی پکار ہے۔ عمل اور قربانی کے آخری فیصلے کی طلب ہے اور صرف اسی مقصد کے عشق کی منزل ہے جس نے انھیں پانچ سال کی نظر بندی کے بعد پھر جیل خانے کی چار دیواری میں پہنچا دیا ہے۔ وہ جنھوں نے ملک کی آزادی کی راہ میں اپنی آزادی قربان کر دی ہے، تم سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تھوڑا سا مال، تھوڑی سی جسمانی راحت، تھوڑی سی وہمی اور خیالی آرائش لیکن تمام تر غفلت ونفس پرستی اسی مقصد کی راہ میں قربان کردو! سودیشی کا عہد، بائیکاٹ کی تکمیل، ترک موالات کی سچی تعمیل، مجاہدین انگورہ کی مالی اعانت، گناہ ومعصیت سے دل کی پاکی اور اللہ اور شریعت سے کامل اطاعت کا رشتہ، یہی ان گرفتاران حق کی قربانی کی اصلی قیمت ہے، جو ملک کو ادا کرنی ہے۔ افسوس اور ماتم اس بدقسمت کی حرماں نصیبی پر جو اتنی قیمت بھی نہ دے سکے! فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ؟ ....'' (انتہیٰ)

پیغام کے مضامین

''پیغام'' کا پہلا افتتاحیہ بھی مولانا کے قلم کا شاہکار ہے۔ کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

هٰذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ، وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَاحِدٌ، وَلِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ!

معاشراں! گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است، بہ ایں قصہ اش دراز کنید!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحدهٗ. اجنوری ۱۹۲۰ء کو جب مجھے چار سال کے بعد نظر بندی سے رہا کیا گیا، تو میں اپنی آئندہ زندگی، زندگی کے کاموں اور کاموں کے طریق واسلوب کی نسبت خالی الذہن نہ تھا اور نہ اپنے ارادے کے بہنے کے لیے واقعات وحوادث کے کسی سیلاب کا منتظر تھا۔ میں نے ہمیشہ بہنے کی جگہ چلنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس وقت بھی اپنے سفرِ عمل کے لیے ایک طے شدہ راہ اختیار کر چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میری مشغولیت کا عنوان وطریق کیا ہوگا؟ دنیا کے واقعات وحوادث طوفان کی طرح اٹھتے اور سیلاب کی طرح آتے ہیں اور انسان کا کمزور ارادہ اس کی سطح پر حباب کی طرح بہتا رہتا ہے۔ حکمت الٰہی نے اگرچہ انسان کو یہ طاقت بخشی ہے کہ اس طوفان وسیلاب کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اگر چاہے، تو فرش زمین کی طرح

اس کی لہروں پر بھی چل سکتا ہے اور دنیا ان عزائم سے کبھی خالی نہیں رہی ہے جنھوں نے نہ صرف اس کا مقابلہ کیا ہے، بلکہ مرکب کی طرح لگام لگا کر جس طرف چاہا ہے رُخ پھیر دیا ہے لیکن افسوس کہ زندگی اور ارادے کے اس کرہ میں بہت کم انسان ہیں، جو اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ان سے بھی کم ہیں، جو سمجھنے کے بعد برت سکتے ہیں:

وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ. (یوسف)

زمین پر درختوں کے جھنڈ ہیں، جو ہوا سے ہلتے ہیں، کنکر پتھر کے ڈھیر ہیں، جن کو ٹھوکریں پامال کرتی ہیں، خس وخشاک کے انبار ہیں جن کو آندھی اڑا لے جاتی ہے، اسی طرح انسان کی بھی ٹولیاں اور بستیاں ہیں، جو اگرچہ دیکھتا اور سنتا ہے، سوچتا اور ارادہ کرتا ہے لیکن جب حوادث امنڈتے ہیں، واقعات وتغیرات بہنے لگتے ہیں، تو وہ اپنی تمام ارادی اور ادراکی قوتوں کو خیر باد کہہ دیتا ہے اور پھر درخت کی طرح گر کر، پتھر کی طرح لڑھک کر، خس وخاشاک کی طرح آناً فاناً بہہ جاتا ہے! مقام انسانیت کا منارہ بہت ہی بلند ہے لیکن اس کی دیواریں جمادات کی سطح ہی سے بلند ہوئی ہیں، اس لیے اگر اس کی چوٹی گرے گی، تو وہیں پہنچے گی، جہاں سے بلند ہوئی تھی۔ قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ!

(۲)

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کے حوادث عالم کا سیلاب اگرچہ نہایت مہیب اور ہوش ربا تھا اور بہت مشکل تھا کہ ارادے اور فیصلے کی دیواریں اس کے مقابلے میں قائم رہ سکیں۔ عنایت الٰہی کی دست گیری سے میں نے اپنے ارادے اور عزم کو اس وقت بھی پوری طرح قائم واستوار پایا اور ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل پر مایوسی کو قبضہ نہ ملا۔ واقعات کی الم ناکی اور ناکامی میرے دل و جگر کو چیر دے سکتی تھی اور حوادث کی غمگینی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے سکتی تھی لیکن وہ اس یقین و عزم کو نہیں نکال سکتی تھی، جو اس کے ریشے ریشے میں بسا ہوا ہے اور صرف اسی وقت نکل سکتا ہے، جب دل بھی سینے سے نکل جائے۔ وہ زمین کی پیداوار نہیں ہے کہ زمین کی کوئی طاقت اسے پامال کر سکے۔ وہ آسمان کی روح ہے اور بحکم: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا

تَخْزَنُوْا آسمان کی بلندیوں سے ہی اُتری ہے۔ پس نہ تو زمین کی امیدیں اسے پیدا کر سکتی ہیں، نہ زمین کی مایوسیاں اسے ہلاک کر سکتی ہیں۔ عین ۱۹۱۸ء کے اواخر عہد میں جبکہ امیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا اُلٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور و شور کے ساتھ گزر چکا تھا، تو میں رانچی کے گوشہ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی دنیائے امید کی تعمیر کا سرو سامان دیکھ رہا تھا اور گو دنیا نے دروازے کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں، مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے:

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

(۳)

۱۹۱۸ء کے رمضان المبارک کا پہلا ہفتہ اور اس کی بیدار و معمور راتیں تھیں کہ جب میں نے انہی ہاتھوں سے امیدوں اور ارادوں کے نئے نقشوں پر لکیریں کھینچیں' جن سے تمام پچھلے نقشے چاک کر چکا تھا:

ہمت نگر کہ صد ورقِ دفترِ امید
صد پارہ کردہ ایم و بہ خوناب شستہ ایم

جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں نظر بندی کے گوشۂ قید و بند سے نکلا، تو دو سال پیشتر کا یہ نقشۂ عمل میرے سامنے تھا اور اس لیے نہ تو مجھے واقعات کی رفتار کا انتظار تھا نہ مزید غور و فکر کا، بلکہ صرف شغل و عمل شروع کر دینا تھا۔ میں نے آئندہ کے لیے جن امور کا ارادہ کیا تھا، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ رانچی سے نکلتے ہی کسی گوشہ عزلت میں رفقاء و طالبین کی ایک جماعت لے کر بیٹھ رہوں گا اور اپنی زبان و قلم کی خدمات میں مشغول ہو جاؤں گا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیش نظر تھے، ان کے لیے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی۔ قیام و استقرار ہی مطلوب تھا۔

چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد سیدھا کلکتہ کا قصد کیا اور اگرچہ تمام ملک سے پیام ہائے طلب و دعوت آ رہے تھے اور ہر طرف نظر بندوں کی رہائی کا ہنگامہ تہنیت و تبریک گرم تھا لیکن میں کہیں نہ جا سکا اور سب سے عذر خواہ ہوا۔ میری طلب و جستجو نے مجھے مہلت نہ دی کہ اپنے وجود کو لوگوں کی طلب و جستجو کا سراغ بنا سکوں:

مرا کہ شیشہ دل و زیارت سنگ است
کرا دماغ مے ناب و شیشۂ و چنگ است

(۴)

لیکن: عَرَفْتُ رَبِّي بِفَسْخِ الْعَزَائِم۔ بالآخر مجھے سیلاب میں بہنا ہی پڑا!

مگر الحمدللہ کہ یہ حوادث و واقعات کے سیلاب کی مخالفانہ رو نہ تھی، جو عزم کو بہالے جاتی اور قصد کو تاراج کر دیتی ہے، بلکہ خود عزم و عمل ہی کی ایک رو تھی، جس کے اندر سے مشیت الٰہی کی صدا اٹھتی ہے اور انسان کو اس کے فیصلے کی جگہ اپنے فیصلے کی طرف بلاتی ہے:

وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْماً حَكِیْماً.

میں نے جنوری ۱۹۲۰ء کے آخر تک پوری جدوجہد کی کہ موجودہ تحریک کی خدمات کو اس عنوان سے انجام دوں کہ میرا قرار دادہ اسلوب عمل بھی قائم رہے اور اقلا سیر دگردش کے کاموں سے الگ رہوں لیکن حالات کی نزاکت، مقاصد کی ناگزیر احتیاجات اور اشخاص کے فقدان نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہ دیا۔ کچھ عرصے تک کشمکش جاری رہی اور بالآخر مجھے فیصلہ کر لینا پڑا کہ اصلی فیصلہ وہی ہے، جو وقت اور ضرورت نے کر دیا ہے اور اب تمام تر اسی کے لیے وقف ہو جانا ہے۔

اس حالت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک کا زمانہ جو اٹھارہ ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے، تمام تر پے در پے دَوروں اور عام تحریک کی فکروں اور کاوشوں میں بسر ہو گیا اور تمام دوسرے مشغلے یک قلم ملتوی کر دینے پڑے نہ تصنیف۔ و تالیف کی تکمیل ہو سکی، نہ طباعت و اشاعت کی فکر کر سکا، نہ البلاغ جاری کیا جا سکا، نہ اپنے پیش نظر مہمات دلجمعی کے ساتھ انجام پا سکے۔ ساری باتیں قیام و سکون پر موقوف تھیں اور وہ ان اٹھارہ مہینوں میں ایک شب و روز کے لیے بھی میسر نہ آ سکا۔ زندگی وہی زندگی ہے، جو سب کے لیے مقدر ہوئی ہے، وقت وہی شب و روز کا وقت ہے، جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ نہ سورج میرے لیے زیادہ دیر تک ٹھہر سکتا ہے نہ رات میری خاطر اپنا معمول بدل دے سکتی ہے۔ ایک زندگی ہے لیکن سینکڑوں زندگیوں کا حوصلہ دل میں پنہاں ہے۔ کیونکر دنیا کو پلٹ دوں؟ اور کہاں سے اس طاقت کو بلالوں، جو ایک دل و دماغ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہاتھوں کو جوڑ دے؟

کمند کوتہ و بازوے ست و بام بلند
بہ من حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند!

موجودہ حالت یہ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حالت کب تک جاری رہے گی؟

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں!

''پیغام'' میں مولانا نے بڑے پر جوش مضمون لکھے، مگر ''پیغام'' اب معدوم ہے، اس لیے ایک دو مضمون یہاں نقل کر دینا مناسب ہے۔ ان مضامین کی زبان ''الہلال'' کی زبان سے کہیں آسان ہے، مگر جوش و خروش میں کمی نہیں ہے۔ علی برادران کی گرفتاری پر لکھتے ہیں، سرخی ہے ''فیصلے کا انتظار'':

''مسٹر محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد پیر غلام مجدد، شنکر اچاریا جی کی گرفتاری پر کامل دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ وہ کراچی کے جیل خانے میں مقید ہیں اور وہیں کی ایک عمارت میں مجسٹریٹ کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا ہے۔ ابتدائی کارروائی، جو قانونی اصطلاح میں ''تحقیقات'' کے نام سے موسوم کی گئی ہے، ختم ہو چکی ہے اور اب سشن کی کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ چند دنوں تک اس کا ہنگامہ بھی گرم رہے گا، پھر بالآخر فیصلے کا دن آئے گا اور نام نہاد عدالت اپنا آخری فیصلہ سنا دے گی۔

ایک دوسرا مقدمہ

لیکن ٹھیک اِسی طرح ایک دوسرا مقدمہ بھی ہے، جو ایک عدالت میں پیش ہو چکا ہے۔ اس عدالت کی بھی حکومت ہے۔ اس کا بھی قانون ہے۔ اس کی بھی جزا وسزا ہے۔ وہاں بھی مجرموں کی پکار ہوتی ہے اور وہاں کے لیے بھی ایک فیصلے کا دن آیا کرتا ہے۔

یہ چند انسانوں کا نہیں، قوموں اور ملکوں کا مقدمہ ہے اور دنیا کی کسی ٹھہرائی ہوئی عدالت میں نہیں بلکہ اللہ کی ازلی وابدی عدالت کے سامنے پیش ہو چکا ہے۔ حق، باوجود اپنی تمام بے سرو سامانیوں کے مدعی ہے اور باطل اپنے تمام سامانوں اور طاقتوں کے ساتھ مدعا علیہ ہے۔ ایک طرف ہندوستان ہے اور ہندوستان کی ۳۲ کروڑ مخلوق ہے، چالیس کروڑ پیروان اسلام ہیں اور تمام ایشیا و افریقہ ہے۔ اُجڑی ہوئی آبادیاں، ویران شہروں کے کھنڈر، خون کے سیلاب، بیواؤں کے آنسو، یتیموں کی چیخیں اور مظلوم اور روندی ہوئی زمینوں کے ایک ایک کونے، ایک ایک ذرے کی فریادیں ہیں، دوسری طرف انسانی تاج و تخت کا غرور ہے۔ ظلم کا گھمنڈ ہے۔ طاقت کی سرشاری ہے۔ دولت کے خزانے ہیں۔ فوجوں کی قطاریں ہیں۔ ہولناک ہتھیاروں کے ذخیرے ہیں اور

انسان کی مادی ہیبت و سطوت اور دنیاوی قہر و اقتدار کا بے خوف اور بے باک دعویٰ ہے۔ یہ دونوں فریق: مَالِکُ الْمُلْک اور: اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْن کے تخت جلال کے آگے کھڑے کئے جا چکے ہیں، عدالت اپنا کام کر رہی ہے۔ قانون اٹل اور بے پناہ ہے اور حکم ناگزیر و لابدی۔ ضرور ہے کہ انتظار ختم ہو اور ضرور ہے کہ نتیجہ کا دن آ جائے۔ وہ آئے گا اور بالآخر ایک دن فیصلہ سنایا جائے گا:

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ ھُنَالِکَ الْمُبْطِلُوْنَ. (۴۰:۷۸)

کراچی کے مقدمہ کی طرح یہ مقدمہ بھی نیا نہیں ہے، نہ تو نوعیت کے اعتبار سے اور نہ واقعات کے اعتبار سے، نہ جرم کے اعتبار سے اور نہ نتیجہ کے اعتبار سے۔ دنیا کی پوری تاریخ صرف انہی دو مقدموں کی روئداد ہے۔ انسان کی عدالتوں نے ہمیشہ فیصلہ کیا ہے اور خدا کی عدالت بھی ہمیشہ فیصلہ کرتی رہی ہے۔ انسان نے ہمیشہ دعویٰ کیا ہے: مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً ہم سے بڑا دنیا میں کون ہے! اور خدا نے ہمیشہ جواب دیا ہے کہ سب سے بڑا میں ہوں اور میرا فیصلہ:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَھُمْ ھُوَ اَشَدُّ مِنْھُمْ قُوَّۃً (۴۱:۱۵)

پھر انتظار کس فیصلے کا کرنا چاہیے؟ اس کا جو کراچی کی عدالت سنائے گی؟ یا اس کا جو خدا کی عدالت سنائے گی۔

کراچی کے فیصلے کا انتظار بے سود ہے۔ اس کے لیے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جواب کی ضرورت ہے اور وہ وہی ہے جو پہلے بھی ہمیشہ ایسے فیصلوں کے لیے دیا جا چکا ہے:

فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ. اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا (۲۰:۷۲)

تم جو کچھ فیصلہ کر سکتے ہو کر دیکھو، تم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہو کہ اس دنیا کی فانی زندگی کے لیے کوئی حکم دے دو۔ اس سے زیادہ تمہارے بس میں کیا ہے؟

لیکن اگر انتظار کرنا ہے تو دوسرے مقدمہ کے فیصلہ کا کرنا چاہیے:

وَاِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (۲۱:۱۰۹)

انتظار

سچا انتظار وہی ہے جو سچی تیاری کے ساتھ ہو۔ پھر کیا واقعی ہم منتظر ہیں اور کیا واقعی ہم نے اپنے تئیں فیصلہ کا حقدار اور سزاوار ثابت کر دیا ہے؟ شاید کسی انسانی جماعت نے اتنے تھوڑے دنوں کے اندر اتنی بڑی بڑی باتیں کہی ہوں گی جیسی ہم نے گذشتہ اٹھارہ مہینوں کے اندر کہی ہیں۔

ہم نے وہ بڑے سے بڑا دعویٰ کر دیا ہے جو دنیا میں انسان کر سکتا ہے لیکن اب تک ہم نے وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کیا جو اتنے بڑے دعووں کے بعد کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے ایمان اور عمل کا اعلان کیا ہے اور ان دو باتوں کے بعد دنیا کی اور کون سی بڑائی ہے جو باقی رہ جاتی ہے؟ لیکن اب تک نہ تو ہمارے دلوں میں سچا ایمان پیدا ہوا ہے، نہ ہمارے کاموں میں سچا عمل دکھائی دیتا ہے۔

ہم نے حق اور سچائی کا لفظ منہ سے نکالا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی آواز نہیں جو آدمی کے منہ سے نکل سکتی ہے لیکن اب تک نہ تو حق کا پورا پورا ہمیں یقین ہوا ہے اور نہ سچائی کی سچی لگن ہمارے دلوں سے لگی ہے۔

ہم نے ایثار اور قربانی کی راہ اختیار کی ہے اور اس سے بڑھ کر فتح مندی کی کون سی راہ ہے جو انسانوں پر کھل سکتی ہے؟ لیکن اب تک ہم ایثار سے ناآشنا ہیں اور غرض اور ذات کی پرستش سے ہمارا دل خالی نہیں ہوا۔

ہم نے کہا ہے کہ ہمارے لیے جانبازی اور سرفروشی کا وقت ہے اور وہ گھڑی آ گئی ہے جب انسان کے لیے بجز اپنے کو کھو دینے اور قربان کر دینے کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا لیکن اب تک ہمارا یہ حال ہے کہ اپنا تھوڑا سا مال اور تھوڑی سی آسائش بھی تج دینے کے لیے تیار نہیں۔

ہم نے اس خدا کا پاک نام لیا ہے جس کو ہم چھوڑ چکے ہیں' اور اس شریعت کا ذکر کیا ہے جس کو صدیوں سے بھلا چکے ہیں' اور پھر ان دونوں ناموں کی نسبتوں سے اپنے فرائض کا اعلان کیا ہے۔ وہ فرائض کیا ہیں؟ یہ ہیں کہ سب کچھ دے ڈالو اور سب کچھ قربان کر ڈالو!

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسَاکِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ. (۹ : ۲۴)

اگر ایسا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ تمہیں دنیا اور دنیا کی چیزیں پیاری ہیں۔ باپ، بیٹے، بھائی، بیوی، خاندان اور اس کے رشتے ناتے راہِ حق سے روک رہے ہیں، مال و متاع کا عشق دامنگیر ہے، کاروبار کے سرد پڑ جانے سے ڈر رہے ہو، مکان و محل کی

آسائشوں میں جی اٹکا ہوا ہے اور تمہارے پاؤں ان زنجیروں میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اللہ کی پکار بھی انھیں نہیں ہلا سکتی، تو یقین کرو کہ اللہ بھی اپنے کاموں کے لیے تمہارا محتاج نہیں۔ ایمان اور سچائی کی راہ چھوڑتے ہو تو چھوڑ دو اور نتیجہ کا انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ کو جو کچھ کرنا ہے کر دکھائے۔ اللہ نافرمانوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا۔

لیکن اس پر بھی ہماری بدبختی اور شقاوت کا یہ حال ہے کہ اب تک ہم نے کچھ بھی نہیں دیا اور اب تک ہم نے کوئی قربانی بھی نہیں کی۔ ہم نے شریعت کے حکموں کا دنیا میں ڈھنڈھورا پیٹا لیکن خود اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

ہم نے جان تک دینے کا اعلان کیا لیکن اس وقت تک مال بھی قربان نہ کر سکے۔ ہم نے اپنا پورا جسم و وجود قربان کر دینے کا دعویٰ کیا لیکن اب تک جسم کا لباس بھی قربان نہ کر سکے۔ ہم نے قوموں اور ملکوں سے لڑنا چاہا لیکن اب تک اپنی غفلت کو بھی شکست نہ دے سکے۔ ہم نے اسلام اور ملک کے دشمنوں کو شکست دینی چاہی لیکن اب تک اسلام اور ملک کے دوستوں کی غفلت اور انکار فتح یاب رہے۔

ہم جب تک اپنی غفلت و سرشاری کو شکست نہ دیں گے دنیا کو شکست نہیں دے سکتے۔ ہم نے کہا کہ بستر پر کانٹے بچھ گئے اور توشک و بالین کی جگہ شعلوں اور انگاروں نے لے لی، اب دنیا دیکھنا چاہتی ہے کہ بیدار راتیں اور بے چینی کی کروٹیں کہاں ہیں؟ ہم نے کہا کہ دل کے ٹکڑے ہو گئے اور جگر میں ناسور پڑ گئے لیکن دنیا نے دیکھا کہ جن کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے، وہ عیش و راحت کے اسیر ہیں اور جن کے جگر میں ناسور تھے ان کی زندگی میں غم و الم کی کوئی بے قراری نہیں!

کیا ہم نے نہیں کہا کہ ہم پیاسے ہیں لیکن اگر ہم پیاسے ہیں تو کیا ہمارا چہرہ سوکھا ہوا؟ کیا ہمارے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں؟ اور کیا ہمارے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں؟

جمال حال شود ترجمان استحقاق
دلیل آب جگر تفتگی و تشنہ لبی ست

جب ایسا نہیں ہے تو کیونکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو سچ مچ فیصلے کا انتظار ہے اور ہم واقعی اس گھڑی کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکے ہیں؟

قول وفعل

فی الحقیقت انسان کی عالمگیر اور دائمی گمراہی یہی ہے کہ وہ جتنا کہتا ہے، اس قدر کرتا نہیں۔ اس کا عمل، قول سے متضاد ہوتا ہے اور اگر متضاد نہیں ہوتا تو مختلف ضرور ہوتا ہے اس کی تمام نامرادیوں اور خسران کی بڑی علت یہی ہے۔ قرآن حکیم نے جا بجا اس بات کو واضح کردیا ہے:

يَـاَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْن كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْ لُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْن (۶۱:۲.۳)

مسلمانو! تم کیوں ایسی بات منہ سے نکالتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ کے حضور یہ بات بڑی ہی ناراضگی کا موجب ہے کہ تم کہو مگر کرو نہیں۔

اگر ہم کسی عمل حق کا ارادہ نہ کریں تو یہ ہماری محرومی ہے لیکن دعویٰ کر کے عمل نہ کریں، تو یہ صرف محرومی ہی نہیں بلکہ اللہ کے غضب کا موجب ہوگی۔ مندرجہ بالا آیت سے یہ بات واضح ہوگئی ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم نے بنی اسرائیل کی شقاوتوں میں سے ایک بڑی شقاوت یہ بتلائی ہے کہ وہ آزمائش سے پہلے آزمائش کی گھڑی کے لیے بڑی بے قراری ظاہر کرتے تھے اور کہتے تھے:

اِبْعَثْ لَنَا مَلِكاً نُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (۲:۲۴۶)

ہمارے لیے ایک امیر بنادو تا کہ ہم اپنے دشمنوں سے مقابلہ کریں۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَ لَّوْا اِلَّا قَلِيْلاً مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظَّا لِمِيْنَ (۲.۲۴۶)

لیکن جب لڑائی کا حکم دیا گیا تو بہت تھوڑے اپنے قول کے پکے نکلے باقی سب قول وقرار سے پھر گئے!

سورۂ احزاب اور سورۂ محمد میں منافقوں کا حال بھی ایسا ہی بتلایا ہے:

وَلَقَدْ كَا نُوْا عَاهَدُ و اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَ لُّوْنَ الْاَ دْبَارَ وَكَانَ عَهْدَ اللّٰهِ مَسْئُوْ لًا (۳۳.۱۵)

فرض

پس اگر ہم واقعی حق و باطل کے فیصلہ کے طلبگار ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم خود اپنے عمل کے لیے ایک آخری فیصلہ کر لیں اور اپنے عمل کو قول کے مطابق کر دکھائیں۔ جب تک ہم خود فیصلہ نہ کریں گے ہمارے ساتھ فیصلہ نہ کیا جائے گا:

ذٰلِکَ یُوْعَظُ بِہٖ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ

(انتھیٰ) (۲:۲۳۲)

''پیغام'' میں مولانا کا ایک اور مضمون ملاحظہ کیجئے:

کیا آخری منزل آ گئی؟

ہم نے آخری منزل کا بار بار ذکر کیا ہے۔ وہ ہمارے سفر کا مقصود ہے۔ طلب و سعی کا مطلوب ہے۔ جستجو کا سراغ ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں کی امید گاہ ہے:

وابرج ما یکون الشرق یوما
اذا دنت الخیام من الخیام

پھر کیا وہ آ گئی؟

اگر واقعی آ گئی ہے اور واقعی ملک اس کے استقبال کے لیے تیار ہے، تو ہماری کامیابی بھی آ گئی اور فتح و مراد نے بھی اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا:

یاراں، صلائے عام ست گرمی کنید کارے

ہم نے اول دن سے اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کے لیے آخری منزل قید خانہ ہے۔ اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا۔ قید خانے کی کوٹھڑیوں میں ہوگا۔ ہم نے اسی لیے سول ڈس اُوبیڈینس یعنی سول قوانین کی نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا کیونکہ قید خانہ کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ وہی ہے۔ پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آ گیا ہے؟

• دو سفر

سفر دو ہیں: ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا۔ اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کیے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لیے قربان کر دیں۔ جب انہوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا

تو ان کا سفر، منزل مقصود تک پہنچ گیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔ اب ان کے لیے سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں۔ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے اور اس کے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا اس نے اپنا کام پورا کر دیا، یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں، ایک ہی ہیں:

راہ رواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہست وہم خود منزل ست

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو بیج بوتا ہے، خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروان مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا سفر پورا کرتے رہے، تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (الروم ۳۰:۲۴)

ہندوستان کا سفر اور آخری منزل

ہندوستان نے بھی سفر شروع کیا ہے ایک سفر اس کے مقاصد کا ہے، ایک سفر جاں نثاران مقاصد کے فرائض کا ہے اور پہلے کی کامیابی دوسرے کی کامیابی پر موقوف ہے۔ طریق عمل یہ قرار پایا کہ جو سفر اس وقت تک چند مسافروں میں محدود تھا اس کو تمام ملک اپنا شیوہ بنا لے اور سینکڑوں ہزاروں جانباز ایسے پیدا ہو جائیں جو کامل خود فروشی و قربانی کے ساتھ کوچ کر دیں۔ ایمان کی لازوال روح ان کے دلوں میں ہو، صبر کی ان تھک اور اٹل طاقت ان کے قدموں میں، عشق ان کی رہبری کرے، شوق ان کا رفیق و دمساز ہو، عزم قدم قدم پر ہمت بڑھائے اور ہمت آگے بڑھ کر راہ صاف کرے:

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ (الحدید ۵۷:۱۲)

عشق تو راہ می برد، شوق تو زاد می دہد

اور پھر جب آخری منزل آجائے، قید و بند کی پکار ہو اور طوق و زنجیر استقبال کریں

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

تو ایسا ہو کہ ہزاروں قدم اس کے لیے مضطربانہ دوڑیں، ہزاروں ہاتھ اس کے لیے والہانہ بڑھیں، ہزاروں دل اس کی طلب وشوق سے معمور ہو جائیں۔ وہ عیش ونشاط کی پکار ہو۔ کامرانی و مراد کی بخشش ہو۔ فتح واقبال کا نشان ہو۔ ہر انسان اس کے لیے آرزوئیں کرے، ہر دل اس کے لیے رشک کھائے اور ہر روح میں اس کے لیے بے قراری سما جائے۔ قید کرنے والے قید کرتے کرتے تھک جائیں لیکن قید ہونے والے قید ہونے سے نہ اُکتائیں، ہتھکڑی پہنانے کے لیے ہاتھ نہ ملیں لیکن ہتھکڑی پہننے والے ہاتھوں کی کمی نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں ایک نئی بستی زندانیانِ حق کی آباد ہو جائے اور اس کی کوٹھریوں اور محنت خانوں میں چوروں اور ڈاکوؤں کے رکھنے کے لیے جگہ باقی نہ رہے!

آخری منزل کے بعد

جب ملک قربانی اور خودفروشی کا یہ مرحلہ طے کرلے گا، تو پھر اس کی طاقت ناقابل تسخیر ہو جائے گی۔ کوئی ہتھیار اس پر اثر نہ کرے گا۔ کوئی فوج اس کو فتح نہ کر سکے گی۔ آسمان کی تمام بجلیاں بھی اگر اُتر آئیں اور سمندر کی تمام موجیں بھی اکٹھی ہو جائیں جب بھی قربانی کی قہرمان طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کو قید کے نام سے دھمکایا جاتا ہے اور موت کے خوف سے وہ مسخر ہو جاتا ہے لیکن جو انسان خود قید کا آرزومند اور موت سے بے خوف ہو، اس کا مقابلہ کس ہتھیار سے کیا جائے؟ بالآخر یا تو گورنمنٹ کو اپنے گھمنڈ کے تخت سے اُترنا پڑے گا اور حق وانصاف کے سامنے جھکنا پڑے گا، یا ہمیشہ کے لیے اس تخت ہی کو چھوڑ دینا پڑے گا۔

آخری منزل کے لیے تین شرطیں

لیکن اس منزل کا نقشہ لفظوں میں جس قدر جلد کھنچ گیا، عمل میں اس قدر آسان نہیں ہے۔ ایک ایسی حرکت کے لیے جو کروڑوں غفلت پسند انسانوں میں پھیلی ہوئی ہو، بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے اور جب تک خود ہمارے دلوں کا کام پورا نہ ہو جائے میدان کا کام شروع نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ملک میں کامل قربانی، استقامت اور نظم پیدا ہو جائے۔ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے خودفروش تیار ہو جائیں۔ جو کامل ایمان ویقین کے ساتھ سچائی کے ہاتھ بک چکے ہوں۔

استقامت سے مقصود یہ ہے کہ ان کا جذبہ عارضی وہنگامی نہ ہو بلکہ اس میں پوری طرح قرار اور جماؤ پیدا ہو جائے۔ ان کی آگ ہوا سے بھڑکائی جائے لیکن پھر دمبدم ہوا کی محتاج نہ رہے، خود چولھے میں بھی مشتعل رہنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ وہ سمندر کی طرح لبریز ہو جائیں، پہاڑ کی طرح خود اپنے سہارے کھڑے ہو جائیں۔ قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ کامیابی اور بے خوفی کے فرشتے صرف انہی پر اُترتے ہیں جو خدا پرستی کے اقرار کے ساتھ استقامت کا جماؤ اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (حم سجدہ ۴۱: ۳۰)

نظم، سب سے بڑی شرط ہے اور وہ آخری بھی ہے اور پہلی بھی ہے کائنات کا پورا کارخانہ اسی کی طاقت پر چل رہا ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ عمل کا تمام حلقہ ایک رشتے میں منسلک ہو جائے۔ کوئی کڑی اس سے باہر جانے نہ پائے جو راہ قرار دی جائے، سب اسی پر گامزن رہیں اور سارا حلقہ ایسے انتظام اور یکسانیت کے ساتھ کام کرے گویا سب کے دل اور جذبات ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔

سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ نظم لوگوں میں پورا پورا ضبط اور اپنے اوپر قابو رکھنے کا ملکہ پیدا کر دے۔ اشتعال ان کو ہلا نہ سکے اور غیظ وغضب ان پر قابو نہ پا سکے۔ وہ وقت پر بھڑک نہ اٹھیں، بے جا جوش میں آ کر اپنا کام فراموش نہ کر دیں، قید و بند کے یہی معنی ہیں کہ ہم قید ہوں۔ قربانی و خود فروشی کے یہی معنی ہیں کہ ہم ہر طرح کی تکلیف اور نقصان برداشت کریں۔ پس اگر ایسا ہونے لگا تو اچنبھا کیوں ہو؟ اور غصہ کیوں آئے؟ انتقام کا ارادہ کیوں کریں؟ کیوں بچنا چاہیں؟ اور کیوں دوسروں کو بچائیں؟ پیاسا پانی سے نہیں بھاگتا اور مفلس نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ دولت ملنے پر لڑنے لگا ہو۔ اگر ہم واقعی راہ حق میں قید ہو جانے کو تیار ہیں اور سچ مچ ہمارے دل کا یقین یہی ہے کہ اس منزل سے ہو کر کامیابی تک پہنچیں گے، تو ہمارا مطلوب و مقصود یہی ہونا چاہیے، اور مقصود کے ملنے کی راہ کھل گئی تو ہمیں خوش ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینا چاہیے۔ ایسا کیوں ہو کہ ہم بھاگیں اور بے قابو ہو کر لڑنے پر اُتر آئیں؟ یہ شرط سب سے بڑی اور نازک ہے اور اس عمل کی ساری کامیابی اِسی پر موقوف ہے۔ اگر یہ طاقت ملک میں پیدا نہ ہوئی تو پھر اس کی قربانی اور استقامت کچھ بھی سود مند نہ ہو گی۔ فوج کتنی ہی بہادر اور جانباز ہو لیکن اگر اس میں نظم اور اطاعت نہیں ہے تو اس کی شجاعت و جانبازی یک قلم رائیگاں جائے گی۔ کم از کم ملک میں بکثرت

ایسے کارکن مہیا ہو جانے چاہئیں جو وقت پر لوگوں کے جذبات کو مسخر کر سکیں اور اشتعال و بے راہ روی پر پوری طرح قابو پالیں۔

ہم اپنی کمزوریوں کا اقرار کرتے رہے ہیں۔ ہم معترف ہیں کہ ملک نے ابھی یہ شرطیں پوری نہیں کیں۔ بلاشبہ قربانی کا ولولہ زندہ ہو گیا ہے لیکن استقامت کا امتحان باقی ہے اور نظم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہم مطمئن نہ تھے اس لیے آخری منزل کا اعلان نہ کر سکے اور بار بار ملک سے یہی درخواست کی کہ درمیانی منزلوں کو پہلے کامیابی کے ساتھ طے کر لے۔

گورنمنٹ کی جلدی اور دعوت

لیکن گورنمنٹ نے ایک پیام بھیجا ہے اور ہم نے قبول کر لیا ہے، کیونکہ جب حریف کا پیام آ جائے تو صرف قبول ہی کیا جا سکتا ہے۔

ہم متامل تھے اور چاہتے تھے کہ مزید انتظار کریں لیکن گورنمنٹ انتظار نہ کر سکی۔ اس نے بے صبری کے ساتھ ارادہ کیا کہ تحریک خلافت کے سربرآوردہ کارکنوں کو گرفتار کر کے سزائیں دینا شروع کر دے۔ اس طرح یا تو اچانک برہمی و بدامنی پیدا ہو جائے گی، یا لوگوں پر خوف و ناامیدی چھا جائے گی۔ پہلی صورت میں گورنمنٹ کو موقع مل جائے گا کہ ایک مرتبہ اپنی طاقت کی پوری خونریزی اور ہولناکی دکھلا کر تحریک کا ایک ایک رگ و ریشہ فنا کر دے۔ دوسری صورت میں تحریک خود بخود شکست کھا جائے گی اور اس طرح چالیس کروڑ مسلمانان عالم اور بتیس کروڑ ہندوستانیوں کی زندگی کا مسئلہ ایک بڑی مدت تک کے لیے ہندوستان میں مدفون ہو جائے گا۔

انسان کا گھمنڈ دور کی فتح مندیاں دیکھ لیتا ہے لیکن قریب کی بدبختی اسے نظر نہیں آتی، گورنمنٹ نے یہ دونوں پہلو دیکھ لیے مگر تیسری راہ اسے دکھائی نہ دی۔ وہ ملک کو پامال کر سکتی تھی یا شکست دے سکتی تھی لیکن یہ بھول گئی کہ خود بھی شکست کھا سکتی ہے اور خود بھی پامال ہو سکتی ہے! (انتہیٰ)

گالیوں سے خوشی!

"پیغام" کی ایڈیٹری کے یہ دن میرے لیے ایسے خوشی کے دن تھے کہ پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئے تھے۔ اخبار اس قدر مقبول تھا کہ آج بھی جب اخبار بینی عام ہو چکی ہے، لوگوں کو آسانی سے یقین نہیں آئے گا۔ کسی کسی ہفتے تو دس دس ہزار پرچے چھپتے تھے اور دیکھتے دیکھتے بازار میں عنقا

ہو جاتے تھے۔ ایک پرچے کی قیمت دو آنے تھی لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہاکر، ایک ایک دو دو روپے میں بیچتے تھے اور گاہک تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ اخبار کی مقبولیت نے مولانا کی نگاہ میں میری وقعت اور بھی بڑھا دی تھی۔

"پیغام" بہت بڑی لیتھو مشین پر چھپتا تھا، مگر مشین میں کوئی ایسی خرابی تھی کہ چلتے چلتے رک جاتی تھی۔ لنگی باندھ کر خود مجھے بھی رات رات بھر مشین پر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ کپڑے چیکٹ ہو جاتے اور حالت ایسی کہ انجان آدمی، مجھے ایڈیٹر خیال ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اخبار اسٹیچنگ مشین میں تار سے سی کر تقسیم کیا جاتا تھا اور یہ کام بھی میں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ سر سے پاؤں تک میل کچیل میں لت پت، مشین پر کھڑا مستعدی سے کام کرتا رہتا تھا، مگر ہاکروں کو اخبار لینے کی آپا دھاپی ہوتی تھی اور جب میری مستعدی ان کی جلد بازی کا ساتھ نہ دے سکتی تو مغلظ گالیاں دینے لگتے! ضرور مجھے اول درجے کا کاہل الوجود اور کام چور سمجھتے ہوں گے!

ایک دن بدرالدین بھی پاس کھڑے تھے۔ ایک ہاکر نے آتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ "سالا" کہہ دیا! نہ جانے کتنی دفعہ گالیاں سن چکا تھا لیکن بدرالدین کے لیے یہ بالکل نئی اور ناقابل برداشت بات تھی۔ ہاکر کو سزا دینے پر تل گئے۔ میں نے خوشامد کی "خفا نہ ہو۔ یہ گالی نہیں ہے۔ تعریف ہے۔ اخبار مقبول ہے اور یہ شخص جلد سے جلد لے جانا چاہتا ہے۔ بیچارے کے خیال میں دیر لگنے کا سبب میں ہوں اور گالی دینا اپنا حق سمجھتا ہے۔ میں خفا نہیں ہوں۔ خوش ہوں بلکہ اس گالی پر فخر کرتا ہوں!"

بدرالدین نے مولانا کو خبر پہنچا دی۔ مجھے بلا کر فرمایا "اب معلوم ہوا آپ پٹھان نہیں ہیں۔ کوئی شیخ زادے ہوں گے! لکھنؤ میں خود آپ کے مکان پر ملیح آبادی پٹھانوں کو دیکھ چکا ہوں۔ شیر تھے شیر! پٹھان اور گالی پی جائے۔ معاذ اللہ!" دیر تک بناتے اور ہنستے رہے پھر دل کھول کر تعریف کی اور اخبار کو سراہتے رہے!

اب مولانا زیادہ تر دورے پر رہتے تھے اور اخبار کا کام چلتا رہتا تھا مگر جب موجود ہوتے، تو بڑی مشکل سے دوچار ہونا پڑتا۔ لکھنے میں وقت کی پابندی کے مولانا قائل ہی نہ تھے۔ اس قید سے بھی ہمیشہ آزاد رہے کہ لکھیں گے، تو کتنا لکھیں گے۔ فرما دیتے، پرچے میں دو صفحے میرے لیے خالی رکھیے۔ اخبار جمعہ کے دن نکلتا تھا۔ ایک ہی کاتب سے کام لیا جاتا تھا۔ اب منگل کے بعد بدھ ہے۔ پرزوں پر پرزے بھیج رہا ہوں کہ مضمون دیجیے مگر وہاں نہ سانس نہ ڈکار۔ ذرا ترش لہجے میں

تقاضا کرتا ہوں، تو جواب آتا ہے "مولوی صاحب، بےفکر رہیے۔ بھیج رہا ہوں!" لیجئے جمعرات بھی آ گئی۔ میرے تقاضے جاری ہیں، مگر اُدھر سے وہی ایک جواب "بس بھیج رہا ہوں!" صبح سے دوپہر، دوپہر سے سہ پہر۔ آخر شام ہو گئی۔ اب مولانا کی طرف سے پرزہ آ رہا ہے، پیچش نے ہلکان کر ڈالا ہے۔ کیسے لکھتا اور یا پھر دو صفحوں کی جگہ چار صفحے کا مضمون نازل!

اب آدمی کرے تو کیا کرے۔ دونوں صورتیں مشکل۔ فوراً دو صفحے کا مضمون کیونکر لکھ دیا جائے اور خالی دو صفحوں میں چار صفحوں کے مضمون کو کیسے کھپا دیا جائے؟ اس مصیبت کو میں جانتا ہوں، یا کاتب صاحب جانتے تھے۔ ہم رات رات بھر جاگتے اور اس مہم کو کسی نہ کسی طرح سر کرتے، مگر ہماری مصیبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ آٹھ بجے رات کو مولانا کی سلپ چلی آ رہی ہے کہ ان کے مضمون میں فلاں پیراگراف بدل دیا جائے اور اب اس طرح لکھا جائے۔ ایک بالکل نئی عبارت آ گئی۔ اس سے مطلب ہی نہیں کہ یہ عبارت، پہلی عبارت کے برابر ہے، یا کم ہے، یا زیادہ ہے اور بہت دفعہ تو پتھر پر کاٹ چھانٹ کی جاتی تھی، کیونکہ مولانا سب کچھ گوارا کر سکتے تھے، مگر اپنی تحریر کو قیمہ بنائے بغیر، بلکہ بالکل بدل ڈالے بغیر رہ نہیں سکتے تھے!

لیکن مجھے یہ مصیبتیں بھی راحت معلوم ہوتی تھیں کیونکہ مولانا جب موجود ہوتے تھے، تو اپنے مضمون انہی کے ہاتھ میں دے دیتا اور وہ اصلاح و ترمیم کر دیتے۔ مولانا کا از حد احسان مند ہوں۔ ان کی اصلاحوں سے مجھے اتنا فائدہ پہنچا کہ بیان کرنا چاہوں، تو بیان نہیں کر سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کامیاب اخبار نویس محض اس وجہ سے بن سکا کہ مولانا جیسا کامل اخبار نویس خوش قسمتی سے مل گیا تھا، جو میری اصلاح کیا کرتا تھا۔

خطرناک مذاق

مولانا، نہایت سنجیدہ ہونے پر بھی نہایت پُر مذاق آدمی تھے، بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے مزاج پر مذاق ہی غالب تھا اور شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ مولانا زیادہ سے زیادہ سنجیدہ صورت بنا کر بھی لوگوں کا ایسا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ پھکو سے پھکو آدمی بھی اُڑا نہیں سکتا۔ اس کا مجھے برابر تجربہ ہوتا رہا۔

پیغام نکل رہا تھا، فضل الدین مرحوم، اخبار کے منیجر تھے۔ فضل الدین، مولانا کے بچپن کے ساتھی تھے۔ پنجابی تھے اور ان کا دل معصوم بچوں کا سا تھا، جاپان میں انجینیری پاس کی تھی۔ بڑے

ہنسوڑ، یار باش آدمی تھے۔ طرح طرح سے منہ بنا کر لوگوں کو ہنسانا اور قسم قسم کے لطیفے سنا کر دوستوں کو کھلکھلا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مولانا کا ''تذکرہ'' انہی نے شائع کیا ہے۔

فضل الدین مرحوم کو میں لااُبالی سمجھا کرتا تھا لیکن اسی پیغام کے زمانے میں یا مدرسے کی مہتممی کے زمانے میں مجھے چندروز کے لیے وطن جانے کی مجبوری پیش آئی۔ مرحوم کو معلوم ہوا تو پوچھنے لگے، کیا کیا چیزیں گھر لے جاؤ گے؟ میں نے کہا کوئی چیز نہیں۔ تحفے لے جانے کا قائل نہیں ہوں۔ دوپہر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ٹیکسی سے اُترے کچھ لدے پھندے چلے آرہے ہیں۔ تعجب نہیں ہوا۔ خیال کیا اپنی ضرورت کی چیزیں لائے ہوں گے۔ آتے ہی میرے سامنے ایک طرح کا مینا بازار لگا دیا۔ ساریاں اور نہ جانے کیا کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ سب کس کے لیے ہے۔ چیزوں کی تعریف شروع کر دی۔ کہنے لگے ''یہ سب آپ گھر لے جائیں گے!''

فضل الدین ایسے تھے، مگر مولانا کو مذاق سوجھا اور انھیں مجھ سے لڑا دینا چاہا۔ ایک صبح میں اپنے ''خود ساختہ محل'' میں بیٹھا تھا۔ بدرالدین بھی موجود تھے۔ چائے اور ناشتے کا سامان میز پر چنا ہوا تھا اور ہم فضل الدین کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مولانا سے ملنے اوپر گئے ہوئے تھے اور ہم بحث کر رہے تھے کہ اس مسخرے سے ایسا کون مذاق کیا جائے کہ بے وقوف بن جائے!

اتنے میں آ گئے۔ آتے ہی میز پر زور کا ہاتھ مارا۔ پیالیاں، چائے دانی، ناشتہ سب زمین پر! پھر بڑی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگے ''میں چور ہوں!''

میں حیرت میں پڑ گیا۔ پوچھا، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر ان کا پارہ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ کچھ سُننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ آدھ گھنٹے تک پورے گھر کو سر پر اٹھائے رہے اور جب تھک گئے تو میں نے کہا آخر اس خردماغی کا سبب؟ کہنے لگے ''اہاہا! آپ نے مولانا سے کہا ہے کہ پیغام چھاپنے والی مشین ناکارہ ہے اور فضل الدین نے مشین خرید کے بہت سا روپیہ غبن کر لیا ہے'' میں نے کہا، یہ تو واقعہ ہے کہ مشین ناکارہ ہے مگر فضل الدین کے غبن کرنے کی بات میں اس وقت خود آپ کی زبان سے پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔ کہنے لگے، تو کیا مولانا جھوٹ بولتے ہیں؟ آپ نے ان سے یہ نہیں کہا؟ عرض کیا آپ مولانا کے بچپن کے ساتھی ہیں اور یقیناً مجھ سے زیادہ انھیں جانتے ہیں۔ اگر مولانا نے میری نسبت وہ سب فرمایا ہے، جو آپ کہہ رہے ہیں، تو یقیناً مولانا نے مذاق کیا ہے اور ہم دونوں کو مرغ بنا کر اس وقت بھی اوپر اپنے کمرے سے ہماری ''پالی'' کے مزے لوٹ رہے ہوں گے!''

یہ کہتے ہی میں نے بھی اور فضل الدین نے بھی بے اختیار دروازے سے منہ نکال کے اوپر دیکھا، تو واقعی مولانا اپنی کھڑکی پر سراپا قہقہہ بنے کھڑے تھے!

پرلطف واقعہ

انہی دنوں ہوڑہ میں ایک بڑا جلسہ ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ مولانا کے ساتھ حسب دستور میں بھی تھا۔ مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور دیکھتے دیکھتے زلزلہ برپا کر دیا مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ تقریر کے دوران مولانا کا ازار بند ٹوٹ گیا۔ بار بار پاجامے کو سنبھالتے تھے، مگر کب سنبھلنے والا تھا۔ میں نے چاہا کہ اُٹھ کر کان میں کہوں، الگ ہٹ کے اس مصیبت سے نجات حاصل کر لی جائے، مگر ہمت نہ پڑی۔ اب مولانا کبھی اِس ہاتھ سے، کبھی اس ہاتھ سے پاجامے کو پکڑتے اور اوپر کی طرف کھینچتے چلے جاتے ہیں لیکن وہ رکتا نہیں۔ حیرت ہوگئی کہ اس مجبوری کی حالت میں بھی نہ تقریر کا تسلسل ٹوٹا نہ زور میں کمی آئی!

واپسی پر ٹیکسی میں کہنے لگے "اس وقت سخت پریشانی اٹھانا پڑی۔ ازار بند کو جلسے ہی میں ٹوٹنا تھا!" دل کھول کے ہنسے اور اسی قسم کے لطیفے سناتے رہے۔ کتابوں میں پڑھ چکا تھا مگر مولانا نے مصر کے حبشی خواجہ سرا غلام بادشاہ، کافوراخشیدی کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن دربار میں بیٹھا تھا کہ زور کا دھماکا ہوا اور بادشاہ اُچھل پڑا پھر اسے خیال ہوا کہ یہ دیکھ کر ارکانِ سلطنت اسے بزدل نہ سمجھ لیں، اس لیے اس نے یہ کیا کہ جب تک زندہ رہا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اسی طرح اُچھلتا رہا، تاکہ سمجھا جائے کوئی عصبی بیماری ہوگئی ہے اور پہلی دفعہ اس کا اُچھل پڑنا خوف کی وجہ سے نہ تھا!۔

مولانا، ملیح آباد میں

اسی زمانے میں مولانا لکھنؤ گئے۔ میں نے سوچا، ملیح آباد بھی لے جاؤں اور تقریر کراؤں۔ کیا عجب مولانا کی روح پرور تقریر سے پٹھانوں کی رگوں میں بزرگوں کا گرم خون پھر سے دوڑنے لگے۔ ملیح آباد کے پٹھان سو رہے تھے اور اپنے خاندان کے دو تعلقداروں کی انگریز چاپلوسیوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ میرے ہم خیال چند ہی آدمی تھے۔ ان سے تاکید کر دی کہ جلسے کا انتظام کر رکھیں اور ان کی یقین دہانی پر مولانا کو لے کر ملیح آباد پہنچ گیا۔

مگر نا قابل بیان خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں نہ استقبال تھا، نہ جلوس، نہ جلسہ، قصبے بھر میں مولانا کو ٹیکسی میں لیے پھرا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پٹھانوں کو سانپ سونگھ گیا ہے اور وہ اپنے بلوں میں مرے نہیں، تو بے ہوش اور بے سدھ ضرور پڑے ہیں۔ مشکلوں سے ایک باغ میں چند خاص عزیزوں کو گھسیٹ گھساٹ کے جمع کیا گیا۔ بھلا مولانا اس ''مجمع'' میں تقریر کیا کرتے۔ لاکھوں انسانوں کے دلوں اور دماغوں سے کھیلنے والے ٹھہرے مگر تیوری پہ بل ڈالے بغیر مختصر لفظوں میں سامعین کو مخاطب کیا، پھر مجھ سے فرمانے لگے ''مولوی صاحب، یہ جلسہ تو بہترین جلسہ رہا!'' عرض کیا ''سخت نادم ہوں'' فرمایا ''دو پٹھان بھی کام کے مل جائیں، تو ہزاروں آدمیوں سے بھاری نکلتے ہیں۔ میں تو اس کامیابی پر خوش ہوں۔ آپ کی ندامت بے جا ہے!''

ٹیکسی میں لکھنؤ لوٹتے ہوئے ہنس کر فرمایا ''یہی ہے آپ کا ملیح آباد! بڑی شہرت تھی، مگر......!'' بات کاٹ کر عرض کیا ''اور حضرت، مکہ کیسا تھا، جہاں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تولد ہوئے اور جہاں تیرہ سو سال بعد خود آپ کو بھی پیدا ہونا پڑا''؟ فرمایا ''مولوی صاحب آپ بڑے باتونی ہیں'' عرض کیا ''باتیں کیا کروں گا۔ دیہاتی ہوں۔ میری زبان ہی کب مستند ہے''۔

اب تو مولانا نے مجھے ایسا لیکچر پلایا کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کہنے لگے آپ کا خاندان اپنی مستورات کے ساتھ غزنی سے چلا تھا نا؟ عرض کیا ''جی ہاں'' فرمایا ''نادر شاہ افشار سے شکست کھا کر قندھار آیا۔ پھر ملتان پہنچا۔ پھر دہلی کا رخ کیا اور جب نادر دہلی کے قریب پہنچا تو فرخ آباد کی راہ لی۔ احمد خان بنگش نے سرپرستی کی۔ پھر فیض آباد گیا اور بالآخر قندھاری بازار لکھنؤ آپ کے خاندان کی فوجی چھاؤنی بن گیا''۔

عرض کیا، حضرت یہ سب آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ گہری مسکراہٹ سے چہرہ گلزار بن گیا۔ فرمانے لگے ''مجھے آپ کے خاندان کی پوری تاریخ کا علم ہے۔ روہیلے بھی آپ کے بھائی برادر تھے لیکن آپ ہی کے بزرگوں نے شجاع الدولہ کی فوج بن کر حافظ رحمت خان کو قتل کیا!''

اب تو میں سکتے میں پڑ گیا۔ ہمارے بزرگ جس کے نوکر ہوتے تھے، اس کا حق نمک ادا کرتے تھے۔ مولانا نے میری خفت بھانپ لی۔ فرمایا لیکن جب شجاع الدولہ نے بریلی کی جامع مسجد میں طوائفیں بٹھائیں، تو آپ ہی کے بزرگوں نے شاہ اودھ سے برسر دربار کہہ دیا تھا کہ مسجد کی بے حرمتی ہم برداشت نہیں کر سکتے اور مسجد کو پاک نہ کیا گیا تو ہم بغاوت کر دیں گے اور تمہیں قتل کر ڈالیں گے!

اب میری جان میں جان آئی لیکن مولانا کی تقریر جاری رہی:

"اور آپ کے ننھیالی جب فقیر محمد خاں گویا بھی تو لکھنؤ میں رہتے تھے میں خود احاطہ فقیر محمد خان، میں منشی محمد علی مرحوم کے پاس ہفتوں، مہینوں بیٹھا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مولانا شبلی نعمانی نے مجھے "الندوہ" کا ایڈیٹر بنایا تھا اور آپ یہ سن کر شاید تعجب کریں کہ اس زمانے میں میرے لاابالی پن کا شباب تھا۔ جاڑا کڑا کے کا پڑ رہا تھا۔ ایک دن دل نے کہا، لکھنؤ سے اُڑ جاؤ اور میں اپنا لحاف بھی چھوڑ کر اُڑ گیا! سنا ہے، میرا لحاف مدتوں منشی محمد علی کے کمرے کی چھت کے ایک کڑے میں لٹکا رہا!"

عرض کیا، جی ہاں وہ لحاف خود میں نے بھی سینکڑوں دفعہ دیکھا تھا۔ اور منشی محمد علی آپ کی کچھ "داستانیں" بھی سنایا کرتے تھے............

بات کاٹ کر افسردہ لہجے میں فرمایا "ہاں مولوی صاحب وہ دور میری زندگی کا تاریک ترین دور تھا لیکن میں مطمئن بھی تھا اور خوش بھی کہ مکروہ قدامت پرستی، اندھی تقلید، اور پیری مریدی کی متعفن دلدل سے باہر نکل آیا ہوں۔ دراصل میں خود اپنے باپ کا باغی تھا۔ والد مرحوم بہت بڑے پیر تھے۔ جمود و تقلید، پیری مریدی اور متعلقہ رسوم و عوائد میں اس قدر متشدد تھے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد صرف ڈھائی عدد بتایا کرتے تھے! میرے ذہن و مزاج کے لیے یہ ماحول ناقابل برداشت تھا اور جب والد سے ذہنی کشمکش آخری حد تک پہنچ گئی، تو میں نے جلاوطنی اختیار کر لی۔ گھر میں سب کچھ تھا۔ دولت پھٹی پڑتی تھی۔ کامیاب پیروں کی تونگری کا حال آپ کو بھی معلوم ہوگا، مگر میں اس کم عمری ہی میں بے گھر ہو گیا اور بڑی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔

"لیکن مولوی صاحب، گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ آپ بقول خود دہقانی سہی، مگر آپ کا پورا خاندان شروع سے لکھنؤ میں رہا ہے اور اردو زبان آپ کی گھٹی میں پڑی ہے۔ فقیر محمد خان کی مادری زبان، پشتو تھی، مگر وہ اردو کے اچھے شاعر ہوئے اور بلاشبہ استاد کا درجہ رکھتے ہیں لیکن خود میری مادری زبان، اردو نہیں، عربی ہے۔ اردو تو مجھے سیکھنا پڑی ہے۔ اور مادری اور سیکھی ہوئی زبان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ سے کہہ چکا ہوں کہ جب کوئی غلط لفظ سنیں، تو بے تکلف ٹوک دیا کریں۔"

عرض کیا، مولانا! اس وقت تو آپ نے مجھے بہت موٹا کر دیا! تعجب ہے یہ معلومات آپ کو ملیں کیسے؟

فرمایا مولوی صاحب جو کچھ سامنے آ جائے پوری توجہ سے پڑھا کرو۔ کام کی چیزیں ذہن میں ٹانک لیا کرو، لغویات کو تھوک دیا کرو۔

عرض کیا، کہنے میں تو یہ آسان ہے، مگر عملاً کیونکر ہو؟

فرمایا، نپولین بوناپارٹ کی سوانح تو آپ پڑھ چکے ہوں گے۔ نپولین بیک وقت سپہ سالار بھی تھا، مورخ بھی، ادیب بھی، قانون دان بھی۔

''نپولین کوڈ'' آج بھی فرانس میں جاری ہے۔ نپولین نے اپنا یہ قانون زیادہ تر فقہ مالکی سے اخذ کیا تھا۔ جب وہ مصر میں تھا تو اس نے فقہ مالکی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور جب فرانس کا شہنشاہ بنا، تو قانون سازی میں اس نے اپنے مطالعہ فقہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پھر ذرا رُک کر کہنے لگے اور آپ نے نپولین کی سوانح میں یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس کے علم میں فوج کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی موجود رہتی تھی۔ گھوڑوں کے کتنے زین قابل مرمت ہیں؟ کتنی لگامیں ٹوٹ گئی ہیں؟ کتنے گھوڑوں کی نعل بندی آج ہی ہونا چاہیے؟ غرض کہ کوئی بات اس کے حافظے سے باہر نہ رہتی اور یہ حافظہ ہی اس کی کامیابیوں کا بڑا سبب تھا۔

عرض کیا لیکن مولانا، نپولین کو یہ سب یاد کیسے رہتا تھا؟ کہنے لگے، یہی سوال خود نپولین سے کیا گیا تھا اور اس نے جواب دیا تھا کہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ اگر تم اپنے دماغ کو کباڑ خانہ بناؤ گے، جس میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی تو تمہیں کچھ یاد نہ رہے گا لیکن اگر اپنے دماغ کو اسٹور بنالو، جس میں ہر چیز نظم و قاعدے سے رکھی جاتی ہے، تو سب کچھ یاد رکھ سکو گے چنانچہ میں نے بھی اپنے دماغ میں خانے بنا رکھے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں خانے۔ یہ خانہ قانون کا ہے۔ یہ بین الاقوامی سیاست کا، یہ علم تاریخ کا، یہ ریاضی کا، یہ فوج کا۔ میں اپنی معلومات سلیقہ مند، ماہر اسٹور کیپر کی طرح نظم و ترتیب کے ساتھ الگ الگ خانوں میں جمع کرتا ہوں اور جس وقت جن معلومات کی ضرورت پڑتی ہے، اسی کا خانہ کھول لیتا ہوں اور باقی خانے بند رکھتا ہوں۔ ہر آدمی ایسا ہی کرسکتا ہے!

عرض کیا، اب معلوم ہوا کہ آپ کے حیرت انگیز حافظے کی تربیت کیونکر ہوئی ہے۔ ہنسے، طنزیہ ہنسی۔ پھر فرمایا، میرا معاملہ کچھ اور ہی رہا ہے۔ بچپن سے ذہن از خود اسی سانچے میں ڈھل گیا تھا، مگر مجھے محسوس نہ تھا، یہاں تک کہ نپولین کی سوانح پڑھی اور تعجب ہوا کہ خود میرا معاملہ بھی یہی ہے لیکن مجھ میں اور نپولین میں بڑا فرق ہے، نپولین ٹھیک اس زمانے میں پیدا ہوا، جب اس کی ضرورت تھی۔ یہ زمانہ والٹیر، روسو اور انسائیکلو پیڈیا والوں کا زمانہ تھا۔ خونریز و خونخوار انقلاب فرانس دم توڑ چکا تھا، مگر اپنے پیچھے حریت، مساوات، اخوت کے نعروں کے ساتھ طاقتور ریشنلزم چھوڑ گیا

تھا۔ نپولین اسی ماحول کی پیداوار تھا۔ یہ ماحول نہ ہوتا، تو نپولین بھی کچھ نہ ہوتا، آپ نے اس شخص کی سوانح میں پڑھا ہوگا کہ جب روسو کی قبر پر پہنچا، تو ادب سے ٹوپی اُتار لی اور جنرلوں سے کہنے لگا "بوربون نے اگر روسو اور والٹیر کا منہ بند کر دیا ہوتا، تو آج میرا کہیں وجود نہ ہوتا" مطلب یہ تھا کہ والٹیر اور روسو اپنے خیالات نہ پھیلا سکتے، تو فاسد و مفسد بوربون بادشاہی برقرار رہتی۔ نہ انقلاب فرانس برپا ہوتا، نہ نپولین کا ستارۂ اقبال آسمان پر چمکتا۔

مگر مولوی صاحب، میں غلام ملک میں پیدا ہوا، یہ ملک، غلامی کے ساتھ انتہائی قدامت پرستی، تقلید و جمود کی لعنتوں میں بھی گرفتار ہے۔ میری راہ صاف نہیں ہے۔ نپولین کی طرح دماغ کا ایک خانہ نہیں، بیک وقت بہت سے خانے مجھے کھولنا پڑتے ہیں، مگر نتیجہ؟ سمجھنے والا کوئی ذہن نہیں۔ میں مظلوم ہوں۔ تاریخ انسانی کا شاید سب سے زیادہ مظلوم وجود۔ مجھے تو کہیں صدیوں بعد پیدا ہونا تھا، مگر ستم ظریف قدرت نے بے سوچے سمجھے اسی زمانے میں ٹپکا دیا۔ لوگ "فَلتاتِ طبیعۃ" کہتے ہیں، یعنی فطرت کی بھول چوک۔ میں فطرت کی بھول چوک کی عبرت انگیز زندہ مثال موجود ہوں!

عرض کیا، مگر مولانا، میں قائل نہیں کہ فطرت سے بھی بھول چوک ہوتی ہے۔ کوئی وجود اپنے وقت سے پہلے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے آدمی، جنھوں نے تاریخ کے دھارے بدل ڈالے اور انسانیت کو آگے بڑھا دیا، اپنے زمانے سے آگے ضرور تھے، مگر ٹھیک اسی وقت پیدا ہوئے تھے، جب ان کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ پیدا نہ ہوتے، تو دنیا بھی آگے نہ بڑھتی۔ قدرت کو منظور تھا کہ ہندوستان جاگے اور آگے قدم بڑھائے، اسی لیے غیر معمولی ذہن و دماغ دے کر آپ کو پیدا کر دیا، تاکہ آپ............

مولانا نے بات کاٹ دی۔ ہنس کر کہنے لگے "لیجیے ہم لکھنؤ پہنچ گئے!"

گاندھی جی کو لوٹا دیا!

سب جانتے ہیں کہ مولانا، کم آمیز تھے۔ ملاقاتوں سے گھبراتے تھے، مگر لوگ تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ جیل جانے سے پہلے مجھے مولانا کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے تھے۔ آپ کہیں گے یہ پوزیشن تو بڑی اچھی تھی لیکن حقیقت میں یہ پوزیشن ایسی تھی کہ اِس کے مزے میں ہی جانتا ہوں!

پبلک میں مولانا سے ملنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔کوئی ملاقات کا آرزومند ہے۔کسی کو محض ''زیارت'' کرنا ہے۔کوئی بس ایک جھلک ہی دیکھ لینا چاہتا ہے۔مولانا بھی مجبور تھے''جھلکیاں'' ہی دکھانے لگتے،تو دین ودنیا کا کوئی کام نہ کر سکتے۔مجبوراً اپنے کمرے میں بندرہتے اور یہ سیکریٹری کا فرض تھا کہ ملاقاتیوں،زائروں،جھلکی بازوں کو محروم ونامراد واپس کرتا رہے!

لیکن ایسے دیوانے بھی آجاتے تھے کہ جان رہے یا جائے،زیارت کیے بغیر لوٹ جانے سے انکار کرتے اور اڑکر بیٹھ جاتے۔اب میں کرتا تو کیا کرتا۔مولانا کو خبر کرتا ہوں،تو چین بجبیں ہوتے ہیں۔فرماتے ہیں،مولوی صاحب،آپ سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ اس آفت کو ٹال دیں۔عرض کرتا،کیونکر ٹالوں؟ اَڑا بیٹھا ہے۔فرماتے،مولوی صاحب،ذرا سوچیے تو،پیچش ہے،انفلوئنزا ہے،اسہال ہے،بخار ہے،نزلہ ہے،دردسر ہے،ہزاروں امراض وعوارض آدمی کو لاحق ہو سکتے ہیں۔کوئی عارضہ اس شخص کو سمجھا دیجئے!عرض کرتا،مگر وہ تو کہتا ہے،چھ مہینے سہی،بیٹھا رہوں گا۔زیارت کے بغیر لوٹ جانا،حرام ہے!ذرا آنکھیں پھاڑ کر فرماتے،سخت تکلیف دہ ہیں یہ لوگ۔میں کوئی پیر ہوں،کوئی مزار ہوں(پھر جوش سے)مولوی صاحب،آپ کا پٹھانی جذبہ آخر کہاں سے ڈھونڈ لاؤں اور آپ کو دے دوں۔اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ اس بھوت سے نپٹ لیں!

کھِسیانا ہوکر''بھوت'' کے پاس لوٹ آتا۔کبھی کبھی تو آستینیں تک چڑھ جاتیں،وہ دانت پیس کر کہتا،سب شرارت تمہاری ہے۔کسی کو مولانا سے ملنے نہیں دیتے!تم......(گالیاں)غرض کہ ان دنوں زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ کوئی پانچ بجے گاندھی جی آپہنچے۔میں نے استقبال کیا اور دوڑ کے مولانا کو خبر کی۔انہوں نے سنا تو،مگر جیسے سنا نہیں۔ٹس سے مس نہ ہوئے۔فرمانے لگے''کہہ دیجئے اِس وقت ملنے سے معذور ہوں۔کل نو بجے تشریف لائیں''عرض کیا غور فرما لیجئے،کیا یہی پیغام پہنچادوں؟کسی قدر تیکھے تیوروں سے فرمایا''اور کیا؟ گاندھی جی میں سُرخاب کے پَر تو لگے نہیں ہیں!''

میں نے گاندھی جی کو پیغام پہنچا دیا۔ٹھنڈے دل سے سنا۔ہشاش بشاش لوٹ گئے اور دوسرے دن نو بجے صبح پھر تشریف لائے۔

بریلی کی جمعیت کانفرنس

اِسی زمانے کا واقعہ ہے کہ بریلی میں جمعیت علماء کا اجلاس طے ہوا اور مولانا آزاد، صدر قرار پائے۔ سب جانتے ہیں کہ بریلی، مرحوم مولانا احمد رضا خاں کا گڑھ تھا اور وہاں کے گویا بے تاج بادشاہ تھے۔ اُنہی کا حکم چلتا تھا اور وہ خلافت تحریک کے اور ہر اس تحریک کے جانی دشمن تھے، جو انگریزی راج کے خلاف ہو۔

یاد رہے، مولانا احمد رضا خاں صاحب، اپنے سوا اور اپنے معتقدوں کے سوا دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر بلکہ ابوجہل وابولہب سے بھی بڑھ کر اَکْفَر سمجھتے تھے لیکن یہ سن کر آپ حیرت کریں گے کہ مولانا آزاد کے والد احمد رضا خاں کو بھی صحیح العقیدہ مسلمان نہیں مانتے تھے!

مولانا نے جیل میں اپنے جو حالات مجھے لکھائے، ان میں فرماتے ہیں:

''غالباً ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ مولوی احمد رضا خان بریلوی ان سے (والد سے) ملنے کے لیے کلکتہ آئے، جن سے ان کے برابر تعلقات رہے تھے اور بارہا ہم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ شخص بلاشبہ صحیح الاعتقاد ہے لیکن بدقسمتی سے وہ (یعنی احمد رضا خاں) اپنے ساتھ بعض اپنی تصانیف لائے اور چونکہ شیخ احمد دحلان، والد کے خاص دوست تھے، اِس لیے انہوں نے (احمد رضا خاں نے) خاص طور پر اپنا ایک رسالہ دیا، جو ان کے (دحلان کے) رد میں لکھا تھا اور اس میں عدم ایمان اَبَوَین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان ابوطالب پر زور دیا تھا چنانچہ اس پر کچھ دیر تک والد نے ان کا ایسا تعاقب کیا کہ آخر وہ ہکا بکا رہ گئے اور خاموش چلے گئے۔ جانے کے بعد (والد نے) ہم سے کہا کہ اس شخص کے عقیدے میں بھی فتور ہے!''

ایک اور موقعہ پر مولانا نے مجھ سے فرمایا ''مولوی احمد رضا خاں مرحوم سے ملنے کے بعد والد افسوس وحسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے ''دنیا بھر میں بس ڈھائی مسلمان باقی رہ گئے ہیں: ایک خود میں ہوں دوسرے مولانا عبدالقادر بدایونی[6] ہیں اور آدھے احمد رضا خاں بریلوی!''

اب انہی احمد رضا خاں مرحوم ومغفور کی بریلی میں کانفرنس ہونے والی تھی اور احمد رضا خاں کو بھی آدھا مسلمان سمجھنے والے مولانا خیرالدین مرحوم کے نور نظر، ابوالکلام آزاد اس کانفرنس کے صدر تھے! وہ ابوالکلام آزاد، جو اپنے والد کے مسلک کو بھی برملا غلط قرار دے چکے تھے!

کلکتہ سے مولانا کے ساتھ میں بھی بریلی پہنچا۔ رات کو اجلاس تھا مگر شام ہی سے خبریں آنے لگیں کہ کانفرنس ہونے نہیں پائے گی۔ احمد رضا خاں تو بے شک مرحوم ہو چکے ہیں، مگر ان کے صاحبزادے، مولانا حامد رضا خاں تو موجود ہیں اور قصابوں کا ایک پورا لشکر چھروں سے مسلح تیار کھڑا ہے۔ کانفرنس شروع ہوئی نہیں کہ قصاب ٹوٹ پڑے اور خون کا دریا بہنے لگا!

پھر ''ناصحان مشفق'' نے آنا شروع کیا۔ مولانا تو کسی سے ملتے نہیں تھے۔ صدقے کا بکرا، میں بن گیا تھا۔ بڑی ''ہمدردی'' بڑا ''قلق'' مولانا سے بڑی ''محبت''...... ''دیکھئے، فائدہ کیا کہ مسلمان، مسلمان کی جان لیں!'' میں نے عرض کیا رضا خانی ہمیں مسلمان ہی کب سمجھتے ہیں؟ فرمانے لگے ''مگر آپ تو انہیں مسلمان سمجھتے ہیں۔ مولانا کو سمجھایئے کہ کانفرنس نہ ہو اور یہ ممکن نہ ہو سکے، تو خود مولانا ہرگز ہرگز تشریف نہ لے جائیں!''

مولانا کو یہ خرافات سناتا، تو ہنستے اور فرماتے، احمقوں کو خوب بناؤ۔ یہی کہو مولانا کانفرنس میں نہیں جائیں گے! پھر ایسا ہوا کہ ''خان بہادر'' قسم کے معززین شہر کا ایک وفد آ پہنچا اور مولانا سے خوشامدیں کیں ''للہ کانفرنس نہ ہونے دیجئے۔ کم سے کم آپ تو ہرگز نہ جائیں!'' مولانا کا چہرہ تمتما اٹھا تھا، مگر ضبط کر کے متانت سے جواب دیا ''میرے بھائی! آپ کے اخلاص کا شکر گزار ہوں!''

اب کانفرنس کا وقت آ پہنچا۔ مولانا نہایت مطمئن و ہشاش بشاش تھے۔ عمامہ باندھا۔ سرمئی رنگ کی عبا، شیروانی پر ڈالی اور ہم کانفرنس میں پہنچ گئے۔ مجمع بہت بڑا تھا۔ ہزاروں آدمی بیٹھے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اکثریت رضا خانیوں کی تھی اور مجمع کے گرد ایک حلقہ ان گنت آدمیوں کا تھا، جو کھڑے تھے اور بہتوں کے ہاتھوں میں ننگے قصابی چھرے چمک رہے تھے۔ پولیس بھی موجود تھی، مگر کم تعداد میں۔ ضرور پولیس والے بھی چھرے دیکھ رہے ہوں گے مگر کوئی باز پرس نہ تھی!

ڈائس پر مولانا احمد رضا خاں کے صاحبزادے، مولوی حامد رضا خاں، مولانا سید سلیمان اشرف اور بہت سے رضا خانی مولوی جمع تھے۔ مولانا آزاد صدر کی نشست پر بیٹھ گئے اور چھرے باز قصائیوں کو دیکھ کر میں، مولانا کی پیٹھ سے بالکل مل کے بیٹھ گیا۔ مولانا کو فوراً محسوس ہو گیا۔ اب تک بڑی شائستگی اور تکلف کا برتاؤ چل رہا تھا پہلی دفعہ جھنجھلا اٹھے ''مولوی صاحب! یہ کیا؟ آپ خدا ہیں کہ مجھے بچا لیں گے؟ اُٹھیے، میرے پاس آ کے بیٹھیے!'' اس وقت میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی...... یہ لیجئے میں رو رہا ہوں...... اور میں نے دل میں کہا تھا، مرد مومن، مرد مجاہد کوئی ہے، تو یہی چھریرا انسان ہے!

وتری الرجل النحیف فتزدریہ

وفی اثوابہ اسد مزیر

کانفرنس شروع ہوگئی۔ مولانا نے مختصر سی افتتاحی تقریر میں فرمایا، اس جلسے میں ایسے دوست اور بھائی بھی موجود ہیں، جو ہمارے مسلک سے متفق نہیں ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں۔ نیک نیتی پر مبنی اختلاف خیال، یقیناً امت مرحومہ کے لیے موجب رحمت ہے، لہٰذا میں ان بھائیوں اور دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے خیالات اور وجوہ اختلاف پوری آزادی سے پیش کر کے ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیں۔

رضا خانی جماعت کے ترجمان اور خطیب، مولانا سلیمان اشرف تھے اور اس میں شک نہیں بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ موصوف کی تقریر نے، جو بہت لمبی تھی، کانفرنس کو ہلا ڈالا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اور کچھ کہنا ممکن نہیں۔

مولانا کی طبیعت مجھ سے زیادہ کون جانتا تھا۔ مخالف مقرر جس قدر زیادہ کامیاب ثابت ہوتا، اسی قدر زیادہ مولانا کے اندر جوش خطابت موجیں مارنے لگتا۔ خود ان کا جسم بھی ایسے موقعوں پر عجیب طرح متاثر ہوتا تھا۔ پہلو تو سنجیدگی کی وجہ سے نہیں بدلتے تھے لیکن ان کے کندھوں میں ایک عجیب و غریب جنبش جاری رہتی تھی۔ یہاں تک کہ خود بولنے کھڑے ہو جائیں۔

مولانا سلیمان اشرف مرحوم کی جادو بیانی مولانا سن رہے تھے اور ان کے کندھے غیر نمایاں طور پر پھڑک رہے تھے۔ مولانا سلیمان کی تقریر ختم ہوئی، تو مولانا نے بڑی بے صبری سے رضا خانی مولویوں سے پوچھا اور بھی کوئی صاحب بولیں گے؟ مولوی حامد رضا خاں نے جواب دیا، اب ہمیں اور کچھ کہنا نہیں۔ مولانا نے جملہ بھی پورا نہ ہونے دیا اور کھڑے ہوگئے۔ اب سمندر میں طوفانوں پر طوفان آنا شروع ہوگئے۔ آتش فشاں پھٹنے لگے۔ زلزلوں نے زمین کو الٹ پلٹ ڈالا۔ ستارے ششدر رہ گئے۔ چاند بھی، انسانی طلاقت لسانی پر مبہوت ہو کر رہ گیا!

مولانا بیٹھ گئے۔ ایسی طوفانی تقریر مولانا کی زبان سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ مولانا سلیمان اشرف کھڑے ہوئے اور اعلان کیا، مولانا آزاد کی تقریر نے ہمیں مطمئن کر دیا ہے اور اب ہم خلافت تحریک کے مخالف نہیں رہے۔ مولانا حامد رضا خاں بھی اٹھے اور صاف لفظوں میں فرمانے لگے، سب غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں۔ اب ہم بھی سب کے ساتھ ہیں! اور پھر ان پھوٹی آنکھوں نے کیا دیکھا؟

ہاتھوں سے چُھرے گر پڑے اور مصافحوں کا وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ مولانا کُچلتے کُچلتے بچے۔ بارہ بجے رات کو ہم قیام گاہ پر پہنچے۔ مولانا کو میں نے مبارک باد دی۔ جواب میں صرف اس قدر فرمایا "بے عقل ہیں۔ یہ سب مہمل ہے!" اور میرے دل پر پھر اس شخص کی عظمت کی ایک پرچھائیں سی پڑ گئی۔

آگرہ خلافت کانفرنس

اکتوبر ۱۹۲۱ء میں پراونشل آگرہ خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ مولانا صدر تھے اور کانفرنس میں ان کی تقریریں ایسی ہوئیں کہ سننے والے آج تک انہیں یاد کرتے ہیں۔ افسوس مولانا کی تقریریں محفوظ نہ رہ سکیں۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں بھی تلف ہو چکی ہوں گی اور موجود بھی ہوں تو سود مند نہیں ہو سکتیں۔ مولانا اس روانی اور تیزی سے بولتے تھے کہ رپورٹر کا قلم ساتھ نہیں دے سکتا تھا لیکن خوش قسمتی سے آگرہ کی تقریریں محفوظ رہ گئی ہیں۔ غلام حسین خاں کوئی رپورٹر تھے۔ انہیں نے قلم بند کی تھیں اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ میرے قبضے میں کیونکر آ گئیں۔ بہر حال یہاں نقل کرتا ہوں۔ افتتاحی تقریر ۲۵ اکتوبر کو ہوئی اور اختتامی تقریر ۲۶ اکتوبر کو۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان تقریروں کے علاوہ مولانا کی کوئی تقریر بلفظہٖ کہیں محفوظ نہ ملے گی، اس لیے ان تقریروں کو بیش بہا تحفہ سمجھنا چاہیے۔ پھر یہ تقریریں اتنی لمبی مدت کے بعد آج بھی دلوں میں ایمان زندہ کرنے والی ہیں۔

افتتاحی تقریر

حضرات! آپ کے صوبے کی غالباً یہ تیسری مجلس خلافت ہے، جس کی صدارت کی خدمت کے لیے آپ نے ازراہ لطف و نوازش مجھ کو منتخب فرمایا ہے۔ میں اس لطف و عنایت کے لیے آپ تمام بزرگوں اور عزیزوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس خدمت کے انجام دینے میں آپ عزیزوں کی مساعدت میری مدد کرے گی اور اللہ تعالیٰ توفیق دے گا کہ اس کو بہتر امیدوں کے ساتھ ختم کروں۔

اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے جن بیانات کی ضرورت تھی، میں سمجھتا ہوں کہ وہ اتنی مرتبہ بیان میں آ چکے ہیں، بار باران کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، بار بار مجلسوں میں وہ پیش ہو چکے ہیں، زبانوں پر بھی بار باران کا اعادہ ہو چکا ہے، قلم نے بھی بار باران کی تکرار کی ہے، اِس لیے میں سمجھتا

ہوں کہ ان مسائل کی نسبت اس وقت اور زیادہ تفصیل سے کام لینا بالکل غیر ضروری ہے لیکن اگر اس کی ضرورت ہوتی کہ میں وقت کے مسئلوں کی نسبت، تحریک خلافت کی نسبت، آزادی ہند کی تحریک کی نسبت، آپ کی خدمت میں گزارشات کرنا ضروری محسوس کرتا، تب بھی میں سمجھتا ہوں کہ کم سے کم ایک ایسی آبادی میں، ایک ایسے شہر میں، جیسا کہ یہ شہر ہے اور جیسی کہ اس شہر کی تاریخ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام بیانات کی، جو انسان کی گویائی کر سکتی ہے، کچھ ضرورت نہ تھی۔

آپ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں جس طرح خدا کی سچائی کے مختلف بھیس ہیں۔ خدا کی سچائی کے لیے مختلف نقاب ہیں، اگرچہ بھیس مختلف ہوتے ہیں لیکن صورت مختلف نہیں ہوتی، اسی طرح سچائی کی بھی مختلف زبانیں ہیں اور سچائی ہمیشہ ان مختلف زبانوں سے اپنی فصاحت و بلاغت آپ کے کانوں تک پہنچاتی ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سچائی کی زبان ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہماری آپ کی اللہ کی دی ہوئی گویائی سے ہے، جو زبان سے تعلق رکھتی ہے، وہ آواز جو حلق سے نکلتی ہے۔ ایک گویائی تو وہ ہے جو زبان سے تعلق رکھتی ہے جس کے لیے زبان کو گویائی اور تکلم کی ضرورت ہے لیکن اس دنیا میں ایک دوسری خاموش بلاغت اور گویائی بھی ہے، وہ گویائی، جس کے لیے کانوں کی ضرورت نہیں ہے کہ کان سنیں بلکہ اس گویائی کو آنکھوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ آنکھیں اس کا مطالعہ کریں۔

تہذیب کا مدفن

میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ حقیقتاً اٹھارہ مہینے گزرنے کے بعد، جو آپ کی اِس تحریک کے بعد گزر چکے ہیں، جو تحریکِ خلافت اور آزادی ہند کی تحریک پر گزر چکے ہیں اگر ایک ایسی مجلس میں جو میرے چاروں طرف فراہم ہے. اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے آگے ماتم اور فریاد کی جاوے، التجاؤں کا ہاتھ پھیلایا جاوے، تمام حقائق و معارف کا دفتر کھولا جائے، تو میرے عزیزو، خاص کر وہ جو شہر آگرہ کے باشندے ہیں، بلکہ جو ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کے مدفن کے باشندے ہیں، اگر اب بھی ان کو ضرورت ہے خطبوں کی، تقریروں کی، تو وہ ان تقریروں کے لیے میری گویائی کا انتظار نہ کریں۔ آیئے ہم اور آپ چشم تصور سے کام لیں اور چند منٹوں کے لیے اس جمنا کے کنارے پہنچیں جس کو آج ہی میں نے علی گڑھ سے آتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اس جمنا میں اُتنا پانی بھی نہ پایا، جتنا خون ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کا بہہ چکا ہے۔ اگر آپ میری

ہمراہی کریں گے تو میں آپ کے لیے ایک بہترین آواز کی زبان کو، ایک بہترین دفتر عبرت کو وہاں مہیا پاتا ہوں۔ وہاں زبان نہیں ہے۔ وہاں ایک مجسم فصاحت موجود ہے۔ وہاں ایک مجسم خطبہ موجود ہے۔ وہ جملہ عمارت موجود ہے، جو ہندوستان کی گزشتہ عظمت پر ماتم کر رہی ہے۔ وہاں شاہجہاں کا مدفن اور آرام گاہ موجود ہے۔ اِس سے بڑھ کر بھی کوئی زبان ہو سکتی ہے، جو تمہارے کانوں کو مخاطب کر سکتی ہے؟

میں نہیں سمجھتا کہ اس آبادی میں، اِس تہذیب کے مدفن میں، اس عالم کی قربان گاہ میں میں کون سی چیز پیش کروں؟ اس زمین کے ایک ایک چپے کی خاموشی میں آواز موجود ہے۔ اس کے ایک ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں، ان ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں، جن کا غبار، ہوا میں اُڑ رہا ہے، نصیحت موجود ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر میرا فرض ایک خطیب کا فرض نہیں ہے۔ ایک مقرر کا فرض نہیں ہے۔ البتہ میرا فرض ایک فریادی اور ماتمی کا فرض ہے، جو آپ کے آگے اس لیے نہیں آیا ہے کہ آپ کو کچھ سنائے، بلکہ ماتم کرے اور آپ سے امید کرے کہ اگر آپ کی زندگی کے چند لمحے، آپ کے معاملات دنیا اجازت دیں، تو آپ بھی اس کے ماتم میں شریک ہوں۔

اٹھارہ مہینے کا زمانہ گزر چکا ہے کہ ہم نے اِس سفر کا اعلان کیا تھا۔ اس اٹھارہ مہینے کے اندر تحریک خلافت کی کتنی منزلیں ہیں، جو ہمارے سامنے آئیں اور ہم طے کر چکے ہیں۔ میں اس وقت مسئلہ خلافت پر، مقامات مقدسہ پر، ہندوستان کی آزادی پر، جو مسلمانوں کے لیے ویسا ہی فرض شرعی ہے۔ جیسا تحفظ خلافت و دفاع، میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ان مسائل پر کچھ عرض کروں۔ اس کے لیے آپ کے پاس خاموش گویائی موجود ہے۔ جو آپ کے دلوں کو متنبہ کر سکتی ہے۔

اِس وقت اِس جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ احتساب کی نظر ڈالیں اور اندازہ کریں کہ اِس اٹھارہ مہینے کے اندر جو سفر پیش آیا تھا، اس میں ہم نے کون سی منزلیں طے کیں اور آگے کون سی منزلیں باقی ہیں؟ اِس بارے میں آپ کے صوبے کو علاوہ تاریخی خصوصیت کے ایک اور خصوصیت حاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو آپ ہی کا صوبہ ہے، جس کی کانفرنس میں سب سے پہلے اس عمل عظیم کا اعلان کیا گیا ہے، جس کو آپ نان کوآپریشن کے نام سے سن چکے ہیں۔

میرٹھ میں خلافت کا جو جلسہ ہوا، اس میں مہاتما گاندھی جی بھی شریک تھے۔ اس میرٹھ کے جلسے میں سب سے پہلے ترک موالات کا خلافت کمیٹی کی جانب سے بطور ایک عمل دفاع کے، بطور

ایک امر احتجاج کے اعلان کیا گیا۔ آپ ہی کا صوبہ ہے، جس میں سب سے پہلے ہم نے اس سفر کے کوچ کا اعلان کیا۔ اٹھارہ مہینے گزر چکے اٹھارہ مہینے کی مایوسیاں بھی گزر چکیں۔ اب ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک نظر ڈالیں کہ اب تک ہم نے کتنا سفر طے کیا ہے۔ عجب نہیں کہ ہمارے سفر کے متعلق بہت سی کمزوریاں، شکوک و شبہات، جو ہم میں سے بعض دلوں کے لیے موجب خلش ہوا کرتے ہیں، عجب نہیں کہ نظر ڈالنے کے بعد خود بخود ان کا ازالہ ہو جائے۔

عالمگیر غلطی

اس پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے پہلے آپ کو یہ حقیقت اپنے سامنے لانا چاہیے کہ اس سفر سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ اور سعی و قربانی کا جو میدان آپ کے سامنے پیش آیا تھا، کیا تھا؟ اس میں ایک بڑی عالمگیر غلطی ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ وہ محض چند قوموں سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ نوع انسان کی غلطی ہے۔ انسان جب کسی کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے، تو وہ اس میدان کو ڈھونڈتا ہے، جو اس کے وجود سے باہر ہو اور جو سب سے پہلا میدان اس کے سامنے ہے، اس کو نظر انداز کر دیتا ہے، اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم متعین کریں کہ مقصد خلافت کے لیے مدافعت کا جو میدان تھا، وہ کون سا تھا ؟ کیا وہ میدان وہ تھا، جو ہندوستان کے رقبے سے باہر ہے، یا اس کے علاوہ دوسرا میدان بھی تھا؟

اس بارے میں فی الحقیقت دو میدان تھے، جو آپ کو پیش آئے تھے۔ پہلا میدان، جو آپ کی کامیابی کے لیے اولین قیام گاہ تھا، وہ میدان، ہندوستان کے باہر کا میدان نہ تھا۔ وہ عراق و شام کا، ایشیائے کوچک اور سمرنا کا نہ تھا جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا ہے۔ وہ میدان آپ کے ایمان کا، عزم کا، عمل کا میدان تھا اور ان تمام لفظوں کی جگہ ایک لفظ بول دیں۔ وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور آپ کے ملک کی فتح و شکست کا تھا۔ جب تک آپ اسے فتح نہ کرتے، دنیا کی کامیابی آپ کا استقبال نہ کر سکتی۔ آپ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ سب سے پہلے آپ اپنے پہلے میدان کو استوار کرتے۔ اپنے پہلے میدان کا ہتھیار اور ساز و سامان سنوارا ہوتا۔ جب تک اسے فتح نہ کرتے، دوسرے میدان میں قدم نہ رکھ سکتے۔

تحریک خلافت کے لیے سب سے پہلے خود ہندوستان کا میدان تھا، خود مسلمانوں کا میدان تھا، ہندوستان کی بسنے والی قوموں کا میدان تھا۔ سب سے پہلی منزل جو آپ کو پیش آئی، وہ تھی جس میں آپ کی تحریک محض اپنی زندگی کی ابتدائی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ جس وقت بے چارگی کا

یہ حال تھا کہ ہزاروں زبانیں موجود تھیں، جن پر خلافت کا نعرہ تھا لیکن کوئی متفقہ میدان عمل آپ کے سامنے نہ تھا۔ مجالس کے مقصد سے یہ معاملہ آگے نہیں گزرا تھا۔ وہ ابتدائی گھڑیاں آج تحریک خلافت پر گزر چکی ہیں، جب یہ معاملہ محض دلوں میں تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی قوت اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم و توفیق فرمائی کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ باوجود ہماری درماندگی کے، ہماری ترک عمل کے، عدم استحقاق کے اللہ کے فضل و رحمت نے اپنا دروازہ کھول دیا اور ہم کو کامیابی عطا کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر ہم نے یہ پہلا میدان فتح کر لیا۔ جب دنیا کی آنکھ کھلی، تو اس نے محسوس کیا کہ یہ محدود جماعت کی تحریک نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا متفقہ مسئلہ ہے۔ یہ پہلا میدان تھا، جو تحریک خلافت کو پیش آیا اور اس کو کامیابی کے ساتھ اس تحریک نے فتح کر لیا۔

ایمان و عمل کی طاقت

اس کے بعد دوسری منزل ہے جو اس تحریک کو پیش آئی۔ اس تحریک کی فتح مندی کے لیے ضرورت تھی کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت کی تحریک نہ ہو بلکہ اس ملک کے لیے ملکی تحریک بن جائے۔ یہ دوسری منزل تھی، جو تحریک خلافت کو پیش آئی۔ ضرورت تھی کہ یہ تحریک صرف سات کروڑ دلوں میں گھر نہ بناتی بلکہ بتیس کروڑ کے دلوں میں اپنا گھر بناتی۔ یہ ہندو بھائی ہمارے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور ان کی ہمدردی بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتی، اس لیے نہیں کہ فی الحقیقت مسلمانوں کے مطالبات کی کامیابی اسی چیز پر موقوف تھی کہ ہم اپنے بھائیوں کو اس مدد کی زحمت دیتے۔ ہم میں سے ہر شخص، جس کے دل میں ایمان موجود ہے، اس کو یقین ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں کسی مقصد کی کامیابی محض انسانوں کی تعداد پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر تحریک کی کامیابی، ایمان اور عمل کی طاقت پر موقوف ہے۔ اس سے پہلے بار بار میں اعلان کر چکا ہوں اور آج بھی اعلان کرتا ہوں کہ درحقیقت اس مقصد کی کامیابی کے لیے ہندوستان کے کسی رقبے میں سے کسی ایک بھائی کو بھی اس امر کی زحمت دینے کے لیے ہم مجبور نہ تھے کہ وہ ہمیں مدد دیتا۔ اگر مسلمان کامیابی حاصل کر سکتے تھے تو اللہ پر اعتماد کر کے، اللہ کی نصرت پر، اپنے ایمان پر اعتماد کر کے لیکن بلاشبہ جبکہ مسئلے کی صورت کا یہ حال تھا، تو اس کے ساتھ ہی اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریک خلافت کے ضمن میں خود ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا، جس وقت تک ملک میں

عام تحریک پیدا نہ ہوتی اور فی الحقیقت تحریک خلافت کی کامیابی میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقتور ہنگامے کے ساتھ کل ہندوستان کے مسئلے کو زندہ کر دیا، جو چالیس سال کی کوشش سے ہندوستان کو نہ ملا تھا۔ اس کامیابی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف تحریک خلافت ہی موجود نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کا مسئلہ بھی پوری طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کی کامیابی کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک صرف سات کروڑ کی تحریک نہ ہوتی بلکہ اس کے ضمن میں عام ہندوستانیوں کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھتی اور عام مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ اگر آپ کے دل مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں تو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ امید دلاؤں کہ یہ مسئلہ خلافت کی دوسری منزل ہے، جہاں اس نے کامیابی حاصل کی ہے۔

میں اِس منظرِ رفاقت کو ایک منٹ کے لیے فراموش نہیں کر سکتا کہ جوں ہی مسئلہ خلافت ہندوستان میں چھیڑا گیا، ہندوستان کے تمام گوشوں سے ہمارے ہندو بھائیوں نے کامل صداقت کے ساتھ تحریک خلافت کا استقبال کیا اور اپنی تمام ہمدردیاں اس کے لیے وقف کر دیں لیکن جہاں اس کا تعلق ملک کے مسئلے سے ہے، وہاں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ چند رفقاء میں محدود تھا۔ میں نام لوں گا مہاتما گاندھی جی کا کہ وہ اس تحریک کے ایک اولین اور سب سے بڑے قابل عزت رفیق تھے کہ جنھوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تک اس مسئلے نے تمام ہندوستان کے قومی مسئلے کی صورت اختیار نہیں کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کر دیا کہ تحریک خلافت کی روشنی نے ہندوستان کے چراغ کو روشن کر دیا۔ یہ مسئلہ خلافت کی دوسری فتح مندی تھی جو اس کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

ہندو مسلم اتحاد

ہندوستان کے لیے ہندوستان کی آزادی کے لیے، صداقت وحق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ ترین فرائض ادا کرنے کے لیے ہندوستان کے ہندو مسلمان کا اتفاق اور ان کی یک جہتی ضروری ہے۔ میرا قصد نہ تھا کہ مستقل طور پر اس مسئلے کے متعلق کچھ کہوں، کیونکہ الحمد اللہ یہ مسئلہ عمل تک پہنچ چکا ہے۔ اب اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پر بحث کی جائے لیکن چونکہ تحریک خلافت کی تیسری منزل کے ضمن میں یہ مسئلہ چھڑ گیا ہے، لہٰذا آپ اجازت دیں گے کہ میں کچھ اس کے متعلق کہہ دوں۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اگر چہ اپنے ایک سیاسی مسئلہ ہونے کے لحاظ سے ہندوستان کی نجات کے لیے ایک ضروری مسئلہ رہا ہے لیکن یہ مسئلہ آج تحریک خلافت کی بدولت ہی ہمارے سامنے نہیں آیا ہے، بلکہ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود تھے کہ تحریک خلافت کی بنا پر نہیں بلکہ چونکہ انہوں نے اپنی ہدایت کے لیے، اپنی ہر فکر اور ہر کام کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہدایت کا پکڑ لیا تھا، اس لیے اسلام کے اصولوں نے، اسلامی تعلیم نے ان کو مجبور کیا تھا کہ اس کا ہندوستان میں اعلان کریں۔

تحریک خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں، تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے نہیں...... یہ بھی ایک سچی حیثیت ہے...... مگر سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ان کا فرض ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں۔ میں اپنے سینے میں وہ دل رکھتا ہوں، جس کے لیے ہدایت کی کوئی شعاعیں نہیں ہو سکتیں، جو فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ نے نہ بھیجی ہوں، میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔ یہ اعتقاد قرآن مجید کی نص قطعی پر مبنی تھا۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے جو ایک طرف ترک موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے اور دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلے کو واضح کرتی ہے۔ ترکِ موالات کے ضمن میں قرآن مجید کے احکام کیا ہیں؟ موالات، ولایت سے ہے۔ ولایت کے معنی ہیں، محبت اور اعانت اور نصرت۔ تو ترک موالات یعنی مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کر لینا جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آئے۔

دو قسم کی قومیں

قرآن مجید نے دنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ یہ تقسیم سورہ ممتحنہ میں موجود ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ دو قسم کی قومیں دنیا میں ہو سکتی ہیں: ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں ہیں، جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں۔ مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں جنھوں نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں، ایسی قوموں کے لیے قرآن ایک لمحہ کے لیے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان

ساتھ مصالحت کریں اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں، تو ان قوموں کی نسبت بلاشبہ قرآن مجید کی یہ تعلیم ہے اور قرآن مجید کا یہ قانون، کامل انصاف اور عدالت پر مبنی ہے۔ جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے۔ اسی عالمگیر اور ہمہ گیر عدالت کی بنا پر قرآن مجید کا اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں، جو محبت، دوستی، صلح و وفاداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو۔ یہ حکم قطعی متعدد آیات قرآنی میں موجود ہے۔ سورہ ممتحنہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں روکتا کہ جن نامسلمانوں نے تم سے نہ لڑائی لڑی ہے، نہ قتال کیا ہے، نہ مسلمانوں کو ان کی آبادیوں سے نکالا ہے، اگر مسلمان ایسے نامسلمانوں کے ساتھ اتحاد کریں، ہر طرح کی نیکی کا بہتر سے بہتر سلوک جو وہ کر سکتے ہیں، کریں، ایک منٹ کے لیے قرآن انھیں اس سے نہیں روکتا۔ قرآن دنیا میں دشمنی کا پیام نہیں لایا ہے۔ وہ تو محبت کا پیام لایا ہے۔ اس لیے محبت کے قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ٹھیک اسی قانون کے مطابق، جس کی رو سے عدالت، مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کرتی ہے، مسلمان کا بھی ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی تعلق محبت، اعانت اور نصرت کا نہیں رہ سکتا، جو اس کی دشمن ہوں۔ اس تقسیم کی رو سے آپ کے سامنے ترک موالات کا مسئلہ واضح طور پر آ گیا۔

گزشتہ پانچ سال کے اندر دنیا میں وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، جن کے بعد برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلے میں ''فریق محارب'' ہوگئی ہے، یعنی لڑنے والی فریق ہے۔ میں نے فریق محارب پر زور دیا ہے۔ بہت سے لوگ یہاں محارب اور غیر محارب پر زور نہیں دیتے۔ میں نے غیر محارب اور محارب پر زور دیا ہے۔ برٹش گورنمنٹ، اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں از روئے شریعت فریق محارب ہوگئی ہے، اس لیے بموجب اسی نص قطعی کے اور بموجب گیارہ سے زیادہ آیتوں اور اسلام کے قانون کے، مسلمانوں کے لیے یہ حرام اور ناجائز ہوگیا، فسق ہوگیا نفاق ہوگیا، قریب قریب کفر ہوگیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت، وفاداری و اعانت کا کوئی تعلق رکھیں اور اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے، تو ایک منٹ کے لیے بھی ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو مسلمان ایسے وقتوں میں، ایسی حالتوں میں اس محارب قوم کے ساتھ اور اس کے شرکاء

کے ساتھ رشتہ موالات کا رکھتا ہے، اگرچہ وہ زمین پر اپنے آپ کو مسلمان کہے لیکن اللہ کے نزدیک اس کا شمار مومنوں میں نہ ہوگا۔ کفار میں ہوگا!

آج بھی میں یہی اعلان کرتا ہوں کیونکہ صلح کی خبریں اُڑ رہی ہیں۔ ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہونا چاہیے کہ جب تک انگریزی گورنمنٹ اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے مطالبات شرعی کو پورا نہ کردے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہوجائے۔ ایشائے کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے، اس وقت تک انگریزی گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلے میں فریق محارب ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل میں ایک آخری چنگاری ایمان کی باقی ہے، تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ صلح یا صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ مسلمان اپنے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے، وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کرلے، بچھوؤں کے ساتھ صلح کرلے، مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کرسکتا۔

لیکن ہاں، جس آن اور جس لمحہ حالات میں تبدیلی ہوجائے، حالات پلٹ جائیں۔ جو فریق محارب ہے، وہ فریق محارب نہ رہے، بلکہ اس حکم میں آجائے جس کو تم سن چکے ہو، یعنی جن لوگوں نے مسلمان سے قتال نہیں کیا ہے، ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، ان کو دیس نکالا نہیں کیا ہے اور یہی نہیں کہ خود ظلم نہ کیا ہو بلکہ دوسروں کو بھی ظلم پر نہ اُبھارا ہو۔ جس آن برٹش گورنمنٹ میں یہ تبدیلی ہوجائے گی، حقیقی تبدیلی آجائے گی، دھوکے کی نہیں، جس میں چالیس سال سے ہندوستان الجھا ہوا ہے، بجز دحالات کی تبدیلی کا حکم بھی بدل جائے گا اور مسلمانوں میں سے ہر فرد تیار ہوگا کہ صلح اور اتفاق کا ہاتھ بڑھائے لیکن جب تک گورنمنٹ فریق محارب ہے، خلافت کے مطالبات پورے نہیں کرتی، جب تک ہندوستان کو سچے اور حقیقی معنوں میں سوراج نہیں دیتی، یعنی کوئی نئی اور کسی قدر ترقی یافتہ ریفارم کی اسکیم نہیں بلکہ سوراج، جس وقت تک انگریزی گورنمنٹ ان تمام امور کو پورا نہیں کرتی، اس وقت تک مسلمانوں کے لیے اس کا وجود، اس کے ایجنٹوں کا وجود، اس کے گورنروں کا وجود، اس کی عدالتوں کا وجود، ظلم و ستم کی کارروائیاں ہیں۔ ان کا وجود لڑنے والوں کا وجود ہے۔ مسلمان کے لیے ممکن ہے کہ وہ بچھوؤں کو ہتھیلی پر لے کر دودھ پلائے، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کرے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ ایک ضمنی حقیقت تھی۔ اصل مسئلہ، جس پر میں گام فرسائی کررہا تھا، یہ تھا کہ ہندوستان کی نجات کے لیے، ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے، جس کا اعلان ۱۹۱۱ء میں الہلال کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہوں گے، جنھوں نے الہلال کو فراموش نہ کیا ہوگا۔ الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا، کیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا۔ میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکام شرع کی رو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فریق ہوسکتا ہے جو نہ صرف ایشیا کو، مشرق کو، بلکہ اس تمام کرۂ ارضی کی سچائی کو آج چیلنج دے رہا ہے، اس کو مٹا رہا ہے، جس کے غرور سے اللہ کی عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے، وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر، حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر، جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے عملاً پیش کیا ہے اور عملاً وحکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض شرعی ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ پیمان محبت باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔

امت واحدہ

پہلے میں ایک لفظ کہوں گا اپنا اور اس کے بعد آپ کو ایک لفظ سناؤں گا ایک دوسری زبان کا۔ میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تھی۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا۔ بجنسہ یہ اس کے الفاظ ہیں، ہم ان قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک "امت واحدہ" بننا چاہتے ہیں۔ "امت" کے معنی ہیں قوم اور نیشن اور "واحدہ" کے معنی ہیں، ایک۔

اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اسی وقت انجام دیں گے، جب وہ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے، تو یہی وہ لفظ ہے، جو اللہ کے رسول صلی

اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت لکھایا تھا کہ ہم سب مل کر قریش کے مقابلے میں ایک نیشن ہو جائیں گے۔ جن مقاصد کی بنا پر جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عہد کیا تھا، اس سے زیادہ وجوہ آج آپ کے لیے موجود ہیں اگر اس وقت صرف قریش مکہ کی ایک جماعت تھی، جو اسلام کو غربت میں دھمکی دے رہی تھی، تو آج اس غربت ثانیہ میں صرف مٹھی بھر قریش نہیں بلکہ کرہ ارضی کی دو تہائی بسنے والی قومیں، اسلام کو مٹانا چاہتی ہیں، اگر رسولِ خدا، مٹھی بھر قریش مکہ کے مقابلے میں، ابوسفیان کے مقابلے میں، اطراف مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کر سکتے تھے تو آج اس عظیم الشان قوت کے غرور، گھمنڈ، خونخواری کے مقابلے میں، جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے۔ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض نہیں ہے کہ اپنے بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں؟

بہرحال ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے سلسلے میں آپ کے سامنے میں یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبت کا ہاتھ، رفاقت کا ہاتھ، یکجہتی کا ہاتھ اپنے ہمسایوں کی طرف بڑھایا ہے تو ان کا یہ عمل محض کوئی وقتی اور دفاعی نہیں ہے، پولیٹکل چال نہیں ہے، بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے بلکہ ان کے خدا نے، ان کے قوانین شریعت نے کھلوایا ہے، چونکہ بنیاد شریعت پر ہے، اس لیے عزیزان من، آج ترک موالات کے سلسلے میں نہیں بلکہ بیس تیس سال پیشتر بھی میرا یہی اعتقاد تھا۔ دوستو میں اپنی زندگی کا اگر کوئی کام سمجھتا ہوں، تو مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستان کے ان انسانوں میں ہوں جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے۔ میں اپنے لیے کوئی خدمت سمجھتا ہوں، تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف انسانوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھے، علی گڑھ کی پالیسی، مسلمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان، ہندوستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ایک مذہبی عمل تھا۔

بہرحال موضوع شب یہ تھا کہ تحریک خلافت نے اندرونی میدان میں دوسری صورت سے جو فتح یابی حاصل کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تحریک خلافت کی بدولت ہندوستان کی آزادی کا سویا ہوا مسئلہ اس قوت کے ساتھ جاگ اٹھا کہ آج اس کا غلغلہ دنیا میں بلند ہے۔

اب تیسری منزل کونسی ہے اس میدان کی؟ وہ تیسری منزل فی الحقیقت نہایت فیصلہ کن منزل ہے ۔تحریک خلافت نے ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو، پنجاب کے مسئلے کو زندہ کر دیا تھا اور ضروری تھا کہ اس کے لیے کوئی مذہبی شاہراہ عمل ہوتی اور آپ کے سامنے کھولی جاتی ۔خلافت کمیٹی نے احکام شرع کے ماتحت فیصلہ کیا کہ ترکِ موالات، مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ بدبختی سے جہاں مسلمانوں نے اپنے تمام مسائل کو ترک کر دیا ہے، یہ مسئلہ بھی فراموش کر دیا تھا، اس لیے ضرورت تھی کہ اس مسئلے کو زندہ کر دیا جائے۔خلافت کمیٹی نے یہی کیا۔سب سے پہلے ترک موالات کا اعلان کلکتہ کے اس اجلاس میں ہوا، جو فروری ۱۹۲۰ء کو ٹاؤن ہال میں ہوا تھا اور میں اس کا صدر تھا۔سب سے پہلے اس کی تحریک وہاں کے خطبہ صدارت میں کی گئی تھی ۔اس کے بعد دہلی میں دوسری مرتبہ سربرآوردہ ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کہ اس مسئلے کو بحیثیت قوم کے ہم اختیار کر سکتے ہیں۔اس سب کمیٹی میں بھی ،جس میں مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور میں تھا، یہ طے پایا تھا۔کمیٹی سے میں نے کہا کہ بحث کی ضرورت نہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ چیز، جو ہمارے سامنے آ رہی ہے، تیرہ سو سال سے موجود ہے۔میں نے کہا کہ آپ اپنی رپورٹ تیار کیجیے۔اس کے بعد میرٹھ میں اس صوبے کا پہلا جلسہ ہوا اور اس میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کے مختلف اجزا کو پیش کیا اور جو لوگ موجود تھے، وہ تصدیق کریں گے کہ وہاں بھی میں نے اعلان کیا تھا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ پہلی اپیل ہے، بلکہ فی الحقیقت یہ چیز تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے یہاں موجود ہے اور بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر عمل پیرا ہوں۔اس وقت اِس مسئلے کے عمل میں اگرچہ خلافت کمیٹی کے ارکان شریک تھے۔مسلم علماء کی جماعت شریک تھی لیکن یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ مسئلہ چونکہ نہایت پیچیدہ شکل میں ملک کے سامنے آیا تھا، اس لیے ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت، انڈین نیشنل کانگریس نے اس میں شرکت نہیں کی تھی ۔یہ آخری میدان تھا، جس میں ہمیں فتح حاصل کرنا تھی ۔میں آپ کو یاد دلاؤں گا اللہ تعالیٰ کے کرم کو۔یہ تیسری منزل بھی سامنے آئی اور تحریک خلافت نے نہایت کامیابی سے اسے فتح کیا۔ایک معرکہ وہ تھا، جو کلکتہ میں گرم ہوا۔دوسرا وہ تھا، جو ناگپور میں گرم ہوا اس دوسرے معرکے میں بیس ہزار ہندوستان کے ہندو مسلمانوں نے متفقہ آواز میں، جس میں ایک آواز بھی خلاف نہ تھی، ترک موالات کے ساتھ اتفاق کیا اور یہ تیسری فتح مندی، مسئلہ خلافت کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

اب تیسرا میدان ، جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں ، وہ بھی اِسی ہندوستان کے اندر موجود تھا جب تک آپ کے اندر خود آپ کی قوت واپس نہ آ جاتی ، جب تک آپ خود اپنے دلوں کے

معاملات صاف نہ کر لیتے، جب تک آپ کے کاموں میں عمل کی سچی روح نہ پیدا ہو جاتی، اس وقت تک آپ دشمنوں کے مقابلے میں کیا کامیابی حاصل کر سکتے تھے؟

اصلی میدان، ہندوستان کا میدان تھا۔ اندرونی میدان تھا۔ اصلی فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا تھا۔ اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان میں، ترکِ موالات کے میدان میں، قربانی کے ولولے کے میدان میں، مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیتے، تو دنیا کی کون سی قوت ہے جو آپ کو شکست دے سکتی تھی؟ اگر آسمان کی تمام بجلیاں اُتر آئیں، ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کر لیں، تو بھی ایمان کو ایک منٹ کے لیے بھی شکست نہیں دے سکتیں۔ سب سے بڑی ضرورت اسی بات کی ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے دلوں کے میدان کو فتح کر لیں۔ ایمان کے میدان کو، استقامت کے میدان کو، قربانیوں کے میدان کو، ملک کے اتفاق کے میدان کو سر کر لیں۔ جب تک ان میدانوں کو فتح نہ کر لیتے، دشمنوں کے مقابلے میں کیسے بازی جیت سکتے تھے؟

امید اور ناامیدی

دنیا میں ہر فکر اور عمل کے دو ہی موجب ہیں: ایک موجب امید کا اور ایک یاس اور ناامیدی کا۔ اگر امید کی روشنی کو سامنے لائیں، تو شبہ نہیں کہ تحریکِ خلافت نے تمام درماندگیوں کو دیکھتے ہوئے اندرونی میدان کی ان تینوں منزلوں کو اللہ کے فضل سے کامیابی کے ساتھ طے کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسی جماعت میں، جس سے بڑھ کر ہندوستان کے لیے کوئی ملکی جماعت نہیں ہو سکتی، یعنی انڈین نیشنل کانگریس میں کامیابی حاصل کی۔ یہ اٹھارہ مہینے جو گزر چکے ہیں، تحریکِ خلافت کی کامیابیوں کا زمانہ ہے۔ یہ شکست کا نہیں، یقیناً کامیابی کا زمانہ تھا۔

لیکن اگر اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہو کہ آپ کے اندر گھمنڈ پیدا ہو جائے اور آئندہ عمل کی قوت جاتی رہے، تو پھر یہ کامیابی آپ کے لیے فتح مندی نہیں ہے۔ ایک کھیل ہے، جسے ہوا کا ایک طمانچہ اُڑا لے جائے گا۔

اِس کامیابی کا دارومدار آخری منزل پر موقوف ہے جب تک آپ اسے طے نہ کریں گے، پہلی کامیابی آپ کے لیے سودمند نہیں ہو سکتی۔ ایک موجب امید کا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ نے گزشتہ حالات پر نظر ڈالی۔ تم نے دیکھا کہ تحریکِ خلافت کی کامیابی کی بیل چڑھی۔ ایک دوسرا

موجب بھی ہے۔ وہ ناامیدی اور خوف کا ہے۔ ایمان دو پروں سے اُڑتا ہے۔ ایک امید کا دوسرا خوف کا۔ یہ ہماری بڑی ناکامیابی ہوگی کہ گزشتہ کامیابیوں کا تصور کرتے ہوئے آنے والی کامیابی کو بھول جائیں۔ بے شک تحریک خلافت نے یہ کامیابی حاصل کی لیکن ان تمام کامیابیوں کے لیے فیصلہ کن منزل وہ ہے، جو تمہارے غفلت سے بھرے ہوئے سروں سے گزر رہی ہے۔ اگر ان گھڑیوں میں ہندوستان کا ہر باشندہ، ہر مسلمان، ہندو، پارسی، سکھ، عیسائی، غرض کہ ہندوستان کا ہر بسنے والا، جس نے گنگا جمنا کی صاف روانی دیکھی ہے اور ہندوستان کے اس تاروں بھرے آسمان کو سر پر اُٹھائے ہے، ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کامیابی کو حاصل کرے۔ اگر اب بھی تمہارے ایمان کے شعلے نہ بھڑکے، تو ان گزشتہ کامیابیوں کا افسانہ ایک منٹ کے لیے منزلِ مقصود تک نہ پہنچا سکے گا۔ اب آخری منزل آ گئی ہے۔ آج یا تو ہمیشہ کے لیے فیصلہ کرو گے یا ہمیشہ کے لیے ناامیدی کے مدفن میں اس تحریک کو دفن کردو گے۔ وہ آخری فیصلہ کن گھڑی آپ کے سامنے آ گئی۔ وہ کون سی ہے؟ افسوس کہ وقت کوتاہی کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مسلمان بھائیوں کے سامنے یہ آ جائے کہ کون سی منزل ان کا انتظار کر رہی ہے؟ جب تک وہ پوری صداقت کے ساتھ اس کا دھیان اپنے سامنے نہ لائیں گے۔ گزشتہ کامیابیاں سودمند نہیں ہوسکتیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس منزل کا نقشہ کن لفظوں میں آپ کی آنکھوں کے سامنے سنواروں۔ میں دنیا کی تمام بولیوں سے قطع نظر کر لیتا ہوں اور مسلمانوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ دنیا کے طرح طرح کے اعلانات کی پرستش کر رہے ہیں، مگر انھیں یاد کرنا چاہیے کہ ان کے پاس ایک الہامی اعلان بھی ہے۔ جب تک وہ اس تعلیم کو اپنے سامنے نہ لائیں گے، ان کی کامیابیاں سود مند نہیں ہوسکتیں۔ وہ اعلان قرآن مجید میں جا بجا دُہرایا گیا ہے۔ وہ ایک مختصر سبق ہے، جسے دُہراتے ہوئے میں خاص طور سے خطاب کروں گا اپنے مسلمان بھائیوں سے اور التجا کروں گا اپنے ہندو بھائیوں سے کہ وہ خاص اصطلاح سن کر کبیدہ خاطر نہ ہوں، بلکہ اس حقیقت کو ڈھونڈھیں کہ جس طرح بہت سے کنول ہیں، مگر روشنی ایک ہے۔ سرخ رنگ کے کنول سے روشنی سرخ نہیں ہوسکتی۔ خدا کی سچائی ایک ہے اگرچہ طرح طرح کے ناموں میں پیش کی جائے۔ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی بھی دنیا کا کوئی وجود، کوئی روح، کوئی آتما، بلکہ کوئی ذرہ اِس آسمان کے نیچے نہیں پا سکتا، جب تک وہ اس پروگرام پر عمل نہ کرے، جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

قرآن نے اس بارے میں نہایت تفصیل سے بیانات دیئے ہیں لیکن ایک بہت ہی چھوٹا سا بیان بھی ہے جس کی نسبت تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے امام نے' جن کا نام، امام شافعی ہے، کہا تھا کہ اگر قرآن کے صرف یہی چند جملے نازل ہو جاتے، تو تمام کرہ ارضی کی ہدایت کے لیے کافی تھے۔ آپ کی تحریکِ خلافت، ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔ یہ ایک مقصد ہے، جو فتح چاہتا ہے۔ عمل چاہتا ہے۔ جو لوگ مقصد اور عمل کے ڈھونڈنے والے ہیں، جو مقصد کے عشق میں آنسو بہانے والے ہیں، تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر اچھے مقصد کے لیے یہ اعلان ہے کہ اِس آسمان کے نیچے نوع انسان کے لیے، انسان کی تلاشوں، جستجوؤں، امیدوں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں۔ بڑے بڑے گھاٹے، ٹوٹے ہیں لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے، جو بچ سکتی ہے، ناکامیابی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے، ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے، وہ کون انسان ہے؟ وہ انسان ہے، جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً اور عملاً اپنے اندر پیدا کر لے۔ جب تک یہ شرطیں پیدا نہ ہوں گی دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے نہ ملک، حتیٰ کہ ہوا میں اُڑنے والا پرند بھی دنیا میں کامیابی نہیں پا سکتا۔

اِن چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا۔ اگر ایک چیز عربی بھیس میں آ جائے، تو کیا تم انکار کر دو گے، چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو؟

ایمان و عمل صالح

پہلی شرط وہ ہے، جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں "ایمان" ہے۔ تم جب ہی کامیابی پا سکتے ہو، جب تمہارے دلوں کے اندر، روح کے اندر وہ چیز پیدا ہو جائے، جس کا نام قرآن کی بولی میں ایمان ہے۔ عربی میں ایمان کے معنی ہیں زوال شک کے، یعنی کامل درجے کا بھروسہ اور علم۔ کامل درجے کا اقرار تمہارے دلوں میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجے کا یقین تمہارے دلوں میں نہ پیدا ہو، اللہ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی پر، اللہ کے اصولوں پر، جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہو گا، کامیابی کا کوئی دروازہ نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چُبھ رہا ہے، تو تمہیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان، یقین، اطمینان، جماؤ، تمکین اور اقرار پیدا ہو۔

لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل، یقین و ارادہ کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں۔ ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کرلو گے اس پہلی منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے۔ اس دوسری منزل یا شرط کا نام قرآن مجید کی بولی میں ''عمل صالح'' ہے، یعنی وہ کام جو اچھا ہے، جسے اچھائی کے ساتھ کرنا، سچائی اور صحیح طریقے سے انجام دینا ہے۔

ایمان کے معنیٰ ہیں، وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار، جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت یہاں اس کانفرنس کی جگہ ایک چٹیل میدان تھا، کوئی وجود اس شامیانے کا نہ تھا۔ صرف تمہاری خلافت کمیٹی کے ارکان تھے، مگر اس وقت بھی یہ شامیانہ ان چمکتی ہوئی لالٹینوں کے ساتھ موجود تھا۔ کہاں؟ تمہارے ارکان کے دماغ میں! وہ چیز جو ان کے دماغوں میں موجود تھی، وہ ارادہ، جو ان کے ذہن میں پیدا ہوا تھا، پہلی منزل ہوئی، جو مذہب میں آ کر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی چیز عمل دماغ ہے۔ عملِ تصور و یقین ہے۔ اس بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے، پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو۔ دوسری منزل، عملُ الصالحات کی ہے۔ صرف دماغ کی منزلیں طے کر کے قدم نہ رُک جائیں بلکہ عمل بھی کرو، وہ عمل، جو صالح ہو، جو صحیح طریقے پر ہو جب اس کو پورا کر لیا، تو معنیٰ یہ ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے طے کر لیں۔

تواصی بالحق

مگر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا؟ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن مجید کی عالمگیر صداقت بتاتی ہے کہ نہیں: دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔ اپنی ہمت کو آزماؤ کہ ان کے لیے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں؟ تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ممکن ہے کہ یہ دو منزلیں تمہارے لیے سودمند نہ ہوں۔ وہ دو منزلیں یہ ہیں: قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عمل صالح آدمی کے اندر پیدا ہوا، یعنی یہ ہوا کہ انسانیت کی جو ایک زنجیر ہے، اس کی ایک کڑی نے اپنے آپ کو درست کر لیا لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ تم کیا ہو؟ افراد کا مجموعہ بکھری ہوئی کڑیوں کا ڈھیر۔ قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا، قوم کا، اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی

ہے۔اس کا کام پورا نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی۔ زنجیر مضبوط نہیں ہوسکتی۔اس لیے فرمایا کہ کامیابی کا سفر، کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔وہ تیسری منزل فصیح و بلیغ لفظوں میں تَوَاصِی بِالحق وَ تَوَاصِی بالصَّبر ہے۔یعنی تم جو ایک کڑی تھے تم نے ایمان کی مضبوطی سے اسے سنوار لیا لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا تمہارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کو بھی درست کرو اور انہیں اس طرح درست کر سکتے ہو کہ جس سچائی کو تم نے اپنایا ہے، اسے دوسروں میں بھی پھیلاؤ جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے۔ جب تک تم تواصیِ حق نہ کروگے، اس وقت تک کامیابی تمہیں مل نہیں سکتی۔

تواصی بالصبر

لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہوگئے، اگر توفیق الٰہی نے تمہاری دست گیری کی، تو پھر آخری منزل کون ہے؟ وہ منزل وہ ہے جو صبر کی منزل کے لیے لازم ملزوم ہے۔اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جُڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جاسکتی۔فرمایا،حق کی وہ تواصی کریں گے،حق کا پیام سنائیں گے۔حق کی دعوت پہنچائیں گے،مگر حق کا یہ حال ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اُٹھ سکتا، جب تک وہ قربانیوں کے لیے بھی نہ اٹھے۔فرمایا کہ صرف حق کا پیام ہی مومن نہ پہنچائے۔بلکہ صبر کا بھی پہنچائے۔

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے، بلکہ اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کو، بولیوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔صبر کے معنیٰ کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنیٰ ہیں بے غیرتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔تم صبر کے معنی یہ سمجھتے ہو لیکن جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے،اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف لفظی کرنے والا کوئی نہیں۔اگر صبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمہارے حق کے مقابلے میں مصیبت آجائے،تو تم صبر کے گوشے میں پناہ لو، یعنی ہر طرح کی بے غیرتی کو، بے چارگی کو، باطل پرستی کو قبول کرلو، تو میرے بھائیو، تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

صبر کے معنیٰ اِس سے بالکل مختلف ہیں۔صبر کے معنیٰ ہیں برداشت کے،جھیلنے کے،عمل کے جو تم مقصد کی راہ میں، اپنے محبوب اور پیارے مقصد کے لیے اُٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں، زنجیریں اور ہتھکڑیاں آئیں بلکہ ممکن

ہے کہ تمہارے سامنے تختہ آئے اور اس پر ایک پھندا جھول رہا ہو۔ یہ سب تمہارے سامنے آ سکتا ہے لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو، تو تمہارا فرض ہونا چاہیے کہ تمہارے اندر صبر ہو، تمہارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت، برداشت کا وہ پہاڑ موجود ہو، جس پر دنیا کی کوئی شوکت، کوئی تاج وتخت فتح یاب نہ ہو سکے، یہ معنیٰ صبر کے ہیں۔

قرآنی پروگرام

مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید نے جو صداقت نوعِ انسان کے آگے کامیابی کے لیے پیش کی ہے، اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنا دیا ہے، یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی سفر ہے، تو یہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ کیا تم دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان کے پا سکتے ہو؟ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی جو اور چاول بھی پا سکتے ہو، جب تک تمہارے اندر طلب کے لیے سچا جذبہ نہ ہو؟ کیا ایک لمحے کے لیے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمہیں دکھا سکتی ہے جب تک حق کی راہ میں قربانی چڑھانے کو تیار نہ ہو؟ خدا کی اس کائنات میں ایک ایک ذرے کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا، جب تک وہ ایمان، حق، اور صبر کی منزلوں سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرند کے لیے بھی ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمہارے لیے بدل دے گا؟ کیا اللہ تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہو، تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں۔

میرے دوستو! آج ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی گزشتہ کامیابیوں کے افسانے نہ دہرائیں، بلکہ ہر شخص اپنے عمل کا احتساب کرے اور اپنے دل سے پوچھے کہ کیا واقعی اس کے دل کے اندر ایمان کا بجھا ہوا چراغ روشن ہو گیا ہے؟ کیا واقعی اس کے اندر عمل صالح پیدا ہو گیا ہے؟ اور کیا واقعی اس کے اندر حق پیدا ہو گیا ہے؟

اِس پروگرام میں آخری منزل قربانی کی ہے۔ اسی منزل کے چند ہفتوں بلکہ اس کے چند دنوں کے اندر تمہارے ہندوستان کی آزادی اور مسئلہ خلافت کی پوری قسمت پوشیدہ ہے اگر اس منزل کے لیے تیار ہو، تو اللہ کی کامیابی بھی تمہارے استقبال کے لیے تیار ہے۔ اگر ایمان ہمارے اندر پیدا نہیں ہوا ہے اگر اب تک ہمارا دل شک سے خالی نہیں ہے، اگر ہمارے دل میں حق کا یہ

پہلا سبق بھی پیدا نہیں ہوا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اگر سچ ہے، تو ضرور کامیابی ہوگی اور دنیا کی ساری طاقتوں کے مقابلے میں ہم فتح مند رہیں گے اگر اللہ کی چوکھٹ سے بھاگے ہوئے سر اس کے آگے پھر نہ جھکے ہوں، تو پھر کون سی شے ہے جو تمہاری چوکھٹ پر آئے گی اور تمہاری کنڈی کھٹکھٹائے گی؟ اگر اب بھی تم ایمان، تواصی بالحق، عمل صالح اور قربانی کے لیے تیار نہیں ہو تو تم کو حق نہیں کہ خدا کی زمین پر کامیابی کو ڈھونڈو۔

حضرات! جس طرح یہ شرائط، جن کو نہ اول کہا جا سکتا ہے نہ آخر، ہر حال میں جس طرح آپ کے لیے ضروری ہیں، اسی طرح آپ کو خبردار ہونا چاہیے کہ آپ نے جو عمل ترک موالات کا شروع کیا تھا، اس کی منزلیں جب تک آپ کامل ایمان، عمل صالح اور کامل قربانی کے ساتھ انجام نہ دیں گے، باقی منزلیں آپ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ جب کوئی مقصد کسی کے سامنے رکھا جاتا ہے، تو وہ پوچھتا ہے کہ اس کا انعام کب ملے گا؟ وہ اطاعت فرض کے معاملے کو دوکانداری بناتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے، نتیجہ کب نکلے گا؟ لیکن فرض اِس امر کا محتاج نہیں کہ نتیجہ کب اور کیا پیدا ہوگا۔ اگر فرض، فرض ہے تو تمہیں چاہیے کہ تم پورا کرو۔ نتیجے پر غور کرنا تمہارا کام نہیں۔ دنیا میں بیج ہے۔ زمین ہے۔ انسان ہے اور اس دنیا پر خدا بھی ہے۔ کیا تم خدا کا کام، خدا کی زمین پر کر سکتے ہو؟ تم یہ کر سکتے ہو کہ تمہاری جھولی میں جو دانے ہیں، زمین کے سپرد کر دو اور پھر وہ خدا ہے جو اپنی رحمت کو بھیجتا ہے اور اپنے بادل کو برساتا ہے اور جو بیج تم نے زمین کے سپرد کر دیا تھا، اس کو بارآور کرتا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ دیکھو، زمین صالح ہے۔ دانہ سچا ہے۔ اگر تمہارے ایمان کا دانہ سچا ہے اور اپنے دل کی جس سرزمین میں ڈالا ہے، وہ سرزمین شور نہیں ہے، تو ضرور ہے کہ وہ دانہ، زمین کے پردے کو چاک کرے گا اور اپنی کامیابی کا سر نکالے گا۔

پس دوستو! یہ نہ دیکھو کہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے سلسلے میں جو کام درپیش ہیں، وہ تحریک کے لیے کہاں تک مفید ہیں۔ تمہارا یہ فرض نہیں ہے کہ تم ان کاموں کو اختیار کرو جو تحریک کے لیے مفید ہیں، بلکہ تمہیں چاہیے کہ وہ کام کرو، جو تمہارا فرض ہیں۔

قربانی کی جو پہلی منزل تھی جب تک قدم اس سے آگے نہ بڑھ جائیں، قربانی کا دعویٰ مانا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ میری طرف نہ دیکھو۔ اپنے گریبان کی طرف دیکھو۔ وہ کپڑا جو تمہارے جسم پر ہے، وہ باریک ململیں، جو تم نے اپنے جسموں پر لپیٹی ہیں، ان سے تم بڑی خدمت اپنے دشمنوں کی انجام دے رہے ہو۔ تمہارے ملک سے نوے کروڑ روپیہ ہر سال اِن کپڑوں کے

ذریعہ ان خزانوں میں جاتا ہے، جو پانچ سال سے اسلام کو مٹانے میں صرف ہو رہا ہے۔ ترکِ موالات میں اس سے بڑھ کر اور کون سا مسئلہ ہو سکتا تھا؟ تمہارے عمل کے لیے یہ علت نہیں ہو سکتی کہ تم دوسروں کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہو۔ تمہارے لیے سچا اصول یہ ہے کہ تم اپنے دل کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ تمہاری کامیابی کے لیے، خلافت کے لیے، سوراج کے لیے پہلی چیز یہ تھی کہ ملک میں قربانی کا ولولہ پیدا ہو۔ مقصد کے لیے، ملک کے لیے، حق کے لیے تکلیف اُٹھانے کا ولولہ پیدا ہو، اس لیے ضرورت تھی قربانی کا سبق آئے، جو سبق تمہارے سامنے آیا، وہ جان، گردن اور رگوں کا نہ تھا۔ محض ان کپڑوں کا تھا۔ اگر اسے تم کامیابی کے ساتھ طے نہیں کر سکتے، اگر تمہارے دل میں اتنا عشق نہیں کہ تم ان باریک کپڑوں کو چھوڑ کر موٹے کپڑے پہن سکو، تو کیا تمہارے دل میں یہ حوصلہ آ سکتا ہے کہ تم خدا کی زمین میں بسنے کی ہمت کرو؟ جب تک غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی منزل کو طے نہیں کرو گے، قربانی کی کوئی منزل تمہارے سامنے نہیں آ سکتی۔

۳۰ ستمبر کا زمانہ خلافت کمیٹی نے اس کے لیے قرار دیا تھا۔ مگر ہماری کامیابیوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دردانگیز داغ نہیں ہو سکتا کہ ۳۰ ستمبر کی صبح آئی اور ہماری غفلت پر رو کر چلی گئی۔ اب تک وہ لباس موجود ہے، جس کی وجہ سے ہندوستان غلام بنایا گیا۔ جس کے ذریعہ ہندوستان کے بہترین مقاصد پامال کیے گئے۔ کیا ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم کہیں، اپنی جانوں کو قربان کرنے کے لیے ہم تیار ہیں؟ ہم میں سے ہر مسلمان اور ہندو کا سب سے بڑا پاک اور اشرف فرض ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو، اس معاملے کو کامیابی تک پہنچائے۔ جب تک یہ منزل طے نہ ہوگی اور کوئی منزل ہمارے سامنے نہیں آ سکتی۔ خاص کر مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کام، جو ان کے جسم کی قربانی سے تعلق رکھتا ہے، یہ ہے کہ ان باریک کپڑوں کو جو مانچسٹر اور لنکاشائر سے آتے ہیں اور ان کے ملک کو تباہ کر رہے ہیں، اتار دیں اور انہیں اپنے لیے جائز نہ رکھیں۔

دوسرا کام ان کے لیے اس قسم کی قربانی کے ساتھ جو میں پیش کرتا ہوں، وہ مال کی قربانی ہے جس کے لیے آج سے تیرہ سو برس سے پکارا جاتا رہا ہے کہ اپنی جانوں کو اور مال کو سچائی کی راہ میں قربان کرو۔ اگر آج مسلمانوں کے دل میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ سمرنا میں اپنے دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں اپنی لاشیں تڑپائیں۔ اگر آج مسلمانوں کی قسمت میں یہ دولت نہیں لکھی ہے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ وہاں کے مسلمان بھائیوں کی روپیہ سے بھی مدد نہ کریں، ہندوستان کا کوئی مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہنے کا حق نہیں رکھتا، جب تک وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو حکومتِ انگورہ اور مجاہدینِ انگورہ کی اعانت کے لیے قربان نہ کر دے......

اختتامی تقریر

برادرانِ عزیز! دو دن سے آپ کے صوبے کی مجلس خلافت مختلف جلسوں اور صحبتوں میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی، یہ اس کا آخری جلسہ ہے......

میں آپ کے سامنے اس وقت جو چیز آشکارا کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر آپ اس جلسے کے اختتام کے منتظر تھے، اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس جلسے کا کام ختم کر چکے ہیں تو میں آپ کے اس گمان کی تصدیق کرتا ہوں کہ جلسے کا کام ختم ہو چکا، مگر یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کا کام ابھی تک ختم نہیں ہوا، بلکہ شاید اس وقت تک شروع بھی نہیں ہوا جس قدر کام قول سے تعلق رکھتا تھا، زبانوں سے تعلق رکھتا تھا، تو میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ کام پورا ہو چکا۔

لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اِس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم بھی ہے، زبان کا عالم نہیں، فعل کا عالم، تو میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تمہارا کام ختم نہیں ہوا۔ بلکہ شاید ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔ جہاں تک صداؤں کا تعلق تھا، تم صدائیں سن چکے اور سنا چکے لیکن اب وہ گھڑی آ گئی ہے کہ چند لمحوں کے لیے اپنے عمل کا احتساب کرو کہ کتنا تم نے عمل کیا ہے اور کتنے عمل کی منزل سر کرنے کے لیے تم تیار ہو؟

دوستو! مجھے چھوڑ دو کہ وہ دعوت آپ کے سامنے پیش کروں، جو آج نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ سچائی کی قدر کرنے والے ہر انسان کے لیے سب سے بڑی دعوت ہے۔ جس دعوت کو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ کوئی تجویز نہیں ہے، تجویز ہوتی تو اپنے رسوم کے ساتھ آپ کے سامنے آتی۔ وہ دعوت ہمارا ایک مسلّمہ اعتقاد ہے، ایک مسلّمہ یقین ہے، مذہب کا ایک مسلّمہ رکن ہے۔ مذہب کا ایک مسلّمہ عمل ہے اور کوئی مسلمان جو ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے، اس سے میں مطالبہ کر رہا ہوں کہ یا تو اسے اپنے عمل سے ثابت کر دے اور یا اسلام اور اس کی صداقت کا دعویٰ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ وہ اعتقاد، ایمان کے اعتبار سے کوئی نیا اعتقاد نہیں ہے۔ اس وقت کوئی خاص ضرورت نہ تھی کہ میں خصوصیت سے اس کا اعلان کرتا، اس پر زور دیتا، وہ اعتقاد اگرچہ اس وقت سے موجود ہے، جب سے دنیا میں انسان موجود ہے اور مسلمانوں کے دلوں اور عمل میں تو وہ اعتقاد تیرہ سو برس سے برابر چلا آ رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کا بار بار اعلان کیا جا چکا ہے، اس لیے کوئی ضرورت نہ تھی کہ خاص طور پر اس کا اعلان کیا جاتا۔

تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ ہفتوں میں گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ملک میں جو مختلف نمایاں اشخاص، خلافت اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں، ان کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کر دیا جائے، گورنمنٹ کو اتنا ہی حق حاصل تھا، جتنا ہر غرور اور گھمنڈ کو حق حاصل ہو چکا ہے کہ جس شہری کی چاہے زنجیر اور طوق سے تواضع کرے۔ اس کی نہ ہم شکایت کرتے ہیں نہ شکایت کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ یہ گرفتاریاں وہ ہیں، جن کا ہم اول وقت سے انتظار کر رہے تھے، جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ جس میدان جنگ میں ہم نے قدم رکھا ہے، اس کی آخری منزل طے نہ ہوگی، جب تک ان گرفتاریوں کا سلسلہ تمام ہندوستان کے طول و عرض کا احاطہ نہ کر لے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے انتظار میں ہم بے قراری کی صبحیں اور شامیں بسر کر رہے تھے۔

میں اپنی کمزوریوں کو چھپانا نہیں چاہتا۔ یہ میدان خود ہم نے نہیں کھولا۔ ہم اپنے لوگوں کی استطاعت اور صلاحیت کے منتظر تھے لیکن گورنمنٹ صبر نہ کر سکی۔ اس نے ایک قدم بڑھایا اور جس چیز کے ہم بھوکے پیاسے تھے اور جس کی تاخیر ہمارے کاموں کو روکے ہوئے تھی، گورنمنٹ نے اس دعوت کا اعلان کر دیا۔

اس دعوت کی اولین راہ یہ تھی کہ گورنمنٹ نے ملک کے ان نمایاں پیشواؤں میں سے چند افراد کو گرفتار کیا، جن کے متعلق ملک کا خیال ہے کہ وہ تحریک خلافت کے روح رواں تھے۔ گورنمنٹ نے محمد علی، شوکت علی، مولانا حسین احمد، ڈاکٹر کچلو، پیر غلام مجدد، مولانا نثار احمد، جگت گرو سری شنکر اچاریہ جی اور اسی سلسلے میں دہلی میں مولانا احمد سعید صاحب، عبدالعزیز صاحب اور دیگر اشخاص کو یکے بعد دیگرے گرفتار کر لیا۔

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنا چاہتی تھی، تو گرفتاری کے لیے کسی جرم کی ضرورت نہ تھی۔ دنیا کی ہر قوم و ملک کی تاریخ میں ایک زمانہ آتا ہے جب ملک کا ہر باشندہ، ظلم، گھمنڈ اور مادی طاقت کی نظروں میں مجرم بن جاتا ہے، اس لیے کہ وہ آزادی چاہتا ہے اور ظلم کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ قوم کی تاریخ میں یہ فیصلہ کن گھڑی ہوتی ہے۔

آج ہندوستان کا کون بد بخت بسنے والا ہے، جو گورنمنٹ کی نظروں میں مجرم نہیں ہے؟ اور ہندوستان کا وہ کون محروم باشندہ ہے، جسے اس جرم سے انکار ہوگا؟

گورنمنٹ کی ہندوستان میں بدبختیوں کی اگر تاریخ لکھی گئی، تو یقیناً اس تاریخ میں سب سے آخری بدقسمتی یہ شمار کی جائے گی کہ گورنمنٹ نے اپنی اس سب سے بڑی سلطنت کو اپنی سب سے بڑی فتح سمجھا اور غرور سے دیوانی ہوگئی۔

گورنمنٹ نے ان زندانیان حق کے لیے ایک ایسا جرم انتخاب کیا، جو اگر جرم ہے، تو صرف محمد علی، شوکت علی، حسین احمد کا نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت سات کروڑ قائلان کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا، بلکہ ہندوستان کے بتیس کروڑ بسنے والوں کا متفقہ جرم ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں کراچی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا تھا۔ اور اس جلسہ میں ایک ایسی تجویز بھی پاس کی گئی تھی، جو احکام شرعی کی بنا پر، انصاف اور اس کے قدرتی قانون کی بنا پر گزشتہ اٹھارہ مہینے کے اندر بار بار پاس ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ نے اسی تجویز کو گرفتاری کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اب اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے کہ اگر چند لمحوں کے لیے تسلیم کر لیا جائے کہ اس تجویز میں اسلام کا جو عقیدہ پیش کیا گیا ہے، وہ کوئی نیا عقیدہ ہے اور اس کی نئی بندش ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے، تو کیا گزشتہ اٹھارہ مہینے کے اندر اس کا بار بار اعلان نہیں ہو چکا ہے؟ اسی قدر نہیں بلکہ کئی سال پہلے بھی اس کا اظہار و اعلان ہو چکا ہے۔

۱۹۱۶ء میں جب گورنمنٹ نے مجھے نظر بند کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اعلان کیا کہ یہ شخص، ملک معظم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے تو میں نے ایک چٹھی لکھی تھی اور نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کر دیئے تھے، جن کی رو سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔

میرے الفاظ یہ تھے کہ نہ صرف یہ حرام ہے بلکہ قرآن و حدیث کے قطعی احکام کے بموجب یہ لفظ کافی نہیں کہ حرام ہے بلکہ اسلام اور کفر کا فیصلہ کر دینے والا ہے۔ ہر لمحہ جو ایک بدبخت کے لیے انگریزی جھنڈے کے نیچے گزرے گا، وہ اس کے لیے حرام ہے۔

۱۹۱۶ء میں میں نے یہ چٹھی وائسرائے کے پاس بھیجی تھی۔ اس کی نقل گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس موجود ہونا چاہیے۔ کیا کراچی میں اس مسئلے کی ابتدا ہوئی؟ نہیں۔ اِس مسئلے کا بار بار اعلان ہوتا رہا ہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء میں، جب مسئلہ خلافت کے ابتدائی ایام تھے، انہی ایام میں کلکتہ میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اس کا صدر میں تھا۔ اس جلسے میں کراچی کی تجویز سے بھی زیادہ صاف لفظوں میں، خصوصیت سے سپاہیوں کو مخاطب کر کے اسلام کے اس عقیدے کا اعلان کیا گیا تھا کہ موجودہ حالات میں چونکہ انگریزی حکومت، اسلام کے مقابلے میں لڑنے والا جتھا ہے، اس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ برٹش گورنمنٹ کی فوج میں نوکری کرے یا نوکر رکھائے۔

یہ تجویز اور مختلف جلسوں میں بار بار پاس کی گئی۔ بریلی میں جمعیت العلماء کا جلسہ ہوا۔ وہاں بھی یہ پاس ہوئی۔ پھر میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ میری انہی انگلیوں سے اٹھارہ مہینوں کے اندر تین جزو سے زیادہ صفحات اس موضوع پر لکھے گئے اور وہ چھپ کر شائع بھی ہو چکے، جس کی بارہ ہزار سے زیادہ کاپیاں نکل گئیں۔

اگر یہ جرم ہے، تو اسے چھوڑ دو کہ اِس جرم کی تیرہ سو برس کی تاریخ کیسی ہے؟ میں تو تمہارے سامنے اٹھارہ مہینے کی تاریخ دُہرا رہا ہوں، جب اس جرم کا پکار پکار کر اعلان کیا گیا۔ دس دس پندرہ پندرہ ہزار آدمیوں نے اپنی ٹولیاں بنا کر اس جرم کا ارتکاب کیا۔ اس وقت گورنمنٹ کے عمال کہاں تھے؟

پس فی الحقیقت اگر گورنمنٹ گرفتار کرنا چاہتی تھی، تو ہم اسے دعوتیں دے رہے تھے کہ کاش وہ گرفتار کرنے کے لیے تیار تو ہو۔ جس وقت ان گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا، میں سچ کہتا ہوں کہ آرزو پیدا ہوئی کہ یہ گرفتاریاں اچانک شروع ہو کر رک نہ جائیں اور سچ کہتا ہوں کہ اس اٹھارہ مہینے میں مجھ پر کوئی گھڑی ایسی نہ گزری تھی، جیسی وہ پاک گھڑی جب گورنمنٹ کی درماندگیاں سامنے آ گئیں اور اب اگر گرفتاریوں کا سلسلہ آگے نہ بڑھے گا تو میرے قلب میں مایوسی کا داغ پڑ جائے گا کہ نصرت و مراد کا یہ ایک دروازہ تھا، جو افسوس کہ کھل کر بند ہو گیا!

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنے کے لیے تیار ہے تو اور مجرموں کو چھوڑو، ایک مجرم تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اگر اس عقیدے کی دعوت جرم ہے تو میں نے محض اعلان نہیں کیا، محض دور سے دعوت نہیں دی بلکہ میں نے سپاہیوں سے کہا ہے کہ بارش کی بوندوں کی طرح خدا کی لعنت تم پر برس رہی ہے۔ اگر لعنت سے بچنا چاہتے ہو تو انگریزی راج کی غلامی چھوڑ دو۔

ہاں، ہاں، میں نے سپاہیوں سے، ہندوستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے اور جب تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں، یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں کہ جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ کیا عظیم الشان برٹش گورنمنٹ، جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ گرفتار کرے؟ اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب تمام ملک کر رہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے اور لوگوں سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور سپاہیوں کو یہ پیغام سناؤ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتی ہے، تو کیوں نہیں قدم آگے بڑھاتی؟ کیا گورنمنٹ کی مشینری پر فالج گر گیا ہے؟

عزیزان من! اس سلسلے میں یہ چیز میرے سامنے آئی ہے کہ گو بار بار اس مسئلے کا اعلان کیا جاتا تھا، مگر چونکہ اب گورنمنٹ نے اپنے ذہن میں بڑی دانشمندی سمجھ کر، مگر یہ بھول کر کہ اب ستون گرنے والا ہے اور اس کا عالم یہ ہوا ہے کہ ہوش و حواس باختہ ہونے لگے ہیں، ہاں چونکہ گورنمنٹ کی سطوت مٹنے والی ہے اور دنیا کی تاریخ نے اور دنیا کی تاریخ کے فلسفوں نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ جب کسی قوم کے گھمنڈ اور طاقت کا زوال ہوتا ہے، تو جسمانی قوتوں کا زوال بعد میں ہوتا ہے، پہلے عقل کا زوال ہوتا ہے، یہ عقل کے زوال کا تماشہ ہمارے سامنے ہے۔

میں نہیں جانتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، تم اسے ہنگامہ یا تماشہ سمجھتے ہو مگر یہ ہنگامہ نہیں ہے۔ دنیا کے لیے ایک عجیب و غریب منظر تیار ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی آنے والی تاریخ کا مورخ بے چین ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اپنی فیصلہ کن گھڑیوں سے گزر رہی ہے اور میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر ہے، جو میں پچھلی تاریخوں میں دیکھتا تھا۔ میں اس وقت روما کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میں کلدانیوں کا خاتمہ دیکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے تخت جمشید الٹ رہا ہے اور تاریخ عالم ہم کو انقلاب کا ایک آخری تماشہ دکھا رہی ہے۔

درحقیقت یہ زوالِ عقل اور اختلالِ دماغ کا نتیجہ ہے کہ گورنمنٹ اپنے قدم کو ہوشیاری کا قدم سمجھ رہی ہے، حالانکہ یہ اس کے زوال کا قدم ہے۔ یہ گرفتاریاں، انگریزوں کے زوال کا تماشہ پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ نے محمد علی، شوکت علی، سیف الدین کچلو، حسین احمد، شنکر اچاریہ کو گرفتار نہیں کیا ہے، بلکہ گورنمنٹ نے آخری اعلان کر دیا ہے کہ وہ اسلام کو اور دنیا کی متفقہ سچائی کو گرفتار کرنا چاہتی ہے لیکن گورنمنٹ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا گھمنڈ لاکھ اونچا سہی لیکن اس کے گھمنڈ سے بھی اونچی ایک طاقت موجود ہے۔ گورنمنٹ سمجھتی ہے کہ ہم سے بڑھ کر دنیا میں کون ہے مگر وہ فاطر السموٰات و الارض بتاتا ہے کہ حقیقی طاقتور، اللہ تعالیٰ ہے۔

چونکہ گورنمنٹ نے اپنے عمل سے اسلام کو، اسلام کے عقیدے کو، دنیا کی عالمگیر صداقت کو، عالمگیر راستی کو چیلنج دیا ہے اس لیے ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہوگا کہ جب سچائی کو پامال کیا جائے، سچائی کو جرم قرار دیا جائے تو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی چیز ہو، اس وقت نوع انسان کے لیے بڑی سے بڑی عبادت یہ بن جاتی ہے کہ ظلم کا مقابلہ کرے......

آخری حج کے موقع پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، سب سے بڑا اور سب سے بہتر جہاد کیا ہے؟ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دیر تامل کر کے فرمایا "سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم حاکم کے روبرو کلمہ حق کا اعلان کر دینا!"

عزیزان من! اگرچہ یہ مسئلہ ہمارے لیے کوئی نیا مسئلہ نہ تھا، جس کی پکار ہمارے لیے ضروری ہوتی لیکن عاقبت نااندیش اور قریب زوال گورنمنٹ نے اس چیز کو جرم قرار دے کر آج ہر مسلمان کو اور ہر سچائی پسند انسان کو، ہندوستان کے ہر مسلمان اور ہر ہندو کو، جو دین کو دھرم کو عزیز رکھتا ہے، مجبور کر دیا ہے کہ وہ ساری باتوں سے بڑھ کر، سب سے بڑی نیکی، سب سے بڑا اجر، اللہ کی محبوبیت کا سب سے بڑا وسیلہ اسی چیز کو سمجھے اور پوری آزادی سے اعلان کرے کہ انگریزی گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے، کفر ہے اور ہر سپاہی کو نوکری ترک کر دینا چاہیے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اِس ٹکڑے کو ختم کروں، آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری زبان سے ابھی لفظ "حرام" آپ نے سنا تھا۔ یہ لفظ عربی زبان کا ہے، مگر کیا عربی زبان کا لفظ ہونے کی وجہ سے اس کی سچائی اسلام کے لیے مخصوص ہوگئی؟ کون صداقت پسند ہے، انگریز ہو، عیسائی ہو، یہودی ہو، جو ایک منٹ کے لیے بھی مان سکتا ہے کہ ظالم کی مدد کرنا، بندگان خدا کا خون بہانا، ان کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالنا، ثواب کا کام ہے؟ کیا دنیا کا کوئی مذہب بھی ایک گھڑی کے لیے اسے تسلیم کرے گا؟

برٹش گورنمنٹ، اسلام کے اور ہندوستان کے مقابلے میں لڑنے والا فریق ہے۔ اس لیے برٹش گورنمنٹ سے مددگاری کا کوئی رشتہ بھی رکھنا جائز نہیں اگر آج یہ صورت ہوتی کہ برٹش گورنمنٹ گناہ اور پاپ کے لیے سپاہیوں کو نوکر نہ رکھتی بلکہ نمازوں کے لیے نوکر رکھتی، تب بھی اس کی نوکری حرام ہوتی۔ جب برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، تو اب یہ سوال نہیں رہا کہ اس کی نوکری میں ہم کو کیا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی کام بھی کرنا پڑے، برٹش گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے اگر انگریزی راج کی فوج میں سپاہی کو گناہ نہیں کرنا پڑتا، بلکہ انگریزی راج، فوجی چھاؤنیوں میں مسجدیں اور مندر بنا کر مسلمان اور ہندو سپاہیوں سے کہتا کہ صبح و شام خدا کے آگے ماتھے ٹیکو، تو بھی میں یہی کہتا کہ انگریزی راج کی فوج میں بھرتی ہونا کسی ہندو مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

اس نوکری کا اصلی مقصد وہ ارادہ ہے، وہ نیت ہے جس کی نسبت ابھی چند منٹ میں تم سنو گے کہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا گناہ، سب سے بڑی معصیت، جو خدا کی لعنت کو پھیلاتی

اور خدا کی پھٹکار کو ظاہر کرتی ہے، وہی عمل ہے جس کے لیے ہندوستان کے بد بخت مسلمانوں کو انگریزی فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی یہ فوج کس غرض سے ہے؟ صرف دو غرض سے۔ ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہندوستان کے اندر سے ہے اور ایک وہ ہے، جس کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے۔

• اگر تم پوچھنا چاہتے ہو کہ اس فوج کا ہندوستان میں کیا کام ہے؟ تو اس کا جواب میں نہیں دے سکتا، جلیان والہ باغ کی وہ مٹی دے سکتی ہے، جو ہندو مسلمانوں کے خون سے تر ہو رہی ہے۔ کس نے اپنے بھائیوں پر گولیاں چلائی تھیں؟ ہندوستان کے سپاہیوں نے!

ہندوستان کے اندر انگریزی فوج کا ہندوستانی سپاہی کیا کرتا ہے؟ ہندوستان کو غلام بناتا ہے اور ہندوستانیوں کا خون بہاتا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ ہندوستان کی حکومت، ہندوستان کی طاقت کس نے پامال کی؟ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ دو سو برس پہلے، جو انگریز راج کے آنے کا زمانہ ہے، تمہارے ملک کو غلام بنانے کے لیے نہ دنیا کا کوئی خزانہ آیا تھا اور نہ برطانیہ کے جزیرے کے ڈھلے ہوئے ہتھیار آئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی انگریزی فوج نہیں آئی ہندوستان کو غلام بنانے کے لیے اور کوئی برطانوی سونا چاندی نہیں آیا ہندوستان میں بکھیرنے کے لیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے آج تک بتاؤ کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود ہے کہ ہندوستان کو انگریزی راج کا غلام بنانے کے لیے کوئی فوج بھی برطانیہ کے جزیرے سے آئی اور کوئی لدا ہو خزانہ سمندر کے کنارے لگا؟ جس سوراج کے لیے آج تم رو رہے ہو، جس کے لیے تمہارے دلوں میں سوراخ پڑ گئے ہیں، بد بخت ہندوستان کے بسنے والو، سن لو کہ اس سوراج کو خود ہندوستان کی فوجوں نے پامال کیا ہے۔ وہ ہندوستان ہی کی فوج تھی جس نے مٹھی بھر گیہوں کے لیے اپنے دین کو، دھرم کو بیچا، جس نے اپنی روح کو، آتما کو انگریزوں کے حوالے کر دیا، تا کہ ہندوستان کو، ان کے وطن کو، دیس کو انگریز غلام بنا لیں! وہ ہندوستان ہی کا خزانہ تھا، جو اس قوم کے آگے ڈال دیا گیا کہ وہ جی بھر کر چوس لے ہندوستان کے خون کو! وہ تمہاری غفلت تمہاری نا اتفاقی تھی، جس نے تم کو غلام بنایا۔

آج صبح یہاں جو تقریریں ہو رہی تھیں، میرے عزیز انہیں سن سن کر لعنت کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ اس سے میرے دل میں جوش پیدا نہ ہوا۔ لائڈ جارج کا نام لیا جاتا ہے، تو تم چیخ اُٹھتے ہو، لعنت! لعنت! لیکن میرے دوستو، لعنت تمہاری غفلت پر، لعنت تمہاری ایمان فروشی پر اور لعنت اس پر کہ تم نے خدا کی چوکھٹ چھوڑ دی اور بندوں کو معبود بنا لیا!

میرے دوستو، خدا کے اس آسمان کے نیچے اس ملک کے بسنے والوں سے بڑھ کر کوئی بد بخت ہوسکتا ہے کہ انھیں دو وقت کی روٹی بھی ملتی ہے، تو اس کام کے لیے کہ اپنے بھائیوں کا خون بہائیں اور اپنے وطن کو غلام بنائیں۔

اب سنو، ہندوستان کی فوج کو ہندوستان کے باہر کیا کام کرنا پڑتا ہے؟ میں وہ داستان، وہ کہانی تمہارے کانوں کو کیا سناؤں اگر تمہارے دل کے ٹکڑے ہوں، تو اسے ان پر نقش کردوں، آہ، وہ ترک، جو چھ سو برس سے اپنے سینوں کو اسلام کی حفاظت کے لیے ایک دیوار آہنی بنائے ہوئے ہیں، انہی ترکوں کے سینوں پر کس نے گولیاں برسائیں؟ بد بخت ہندوستانیوں نے۔ قسطنطنیہ کے ساحل پر کون قدم تھے جو اُترے؟ بد بخت ہندوستانیوں کے قدم۔ مسلمانوں کا خون بہانا، ایک ظالم کی زنجیر کو خدا کی آزاد مخلوق کے پاؤں میں ڈالنا، اس دنیا کی کون سی سچائی، کون سا دین، کون سا دھرم ہے، جو ایک گھڑی کے لیے بھی اسے نوع انسان کے لیے سب سے بڑی پھٹکار اور لعنت نہ کہے گا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اور اسلام کے قانون نے اس نوکری کو، اس کام کو، جس میں انسان کا خون بہانا پڑے، ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے، جس کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر کفر کا لفظ جاری ہوا ہے۔ اسلام کے قانون نے مسلمانوں ہی کا قتل نہیں بلکہ کسی انسان کا بھی قتل کرنا اور اس کا خون بہانا، ایک بہت بڑی معصیت، گناہ، پاپ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں فرمایا ہے: وَلاَ یقتلون النفس التي حرم الله الا بالحق یعنی وہ لوگ جو خدا میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے اور کسی جان کو قتل نہیں کرتے، جسے اللہ نے روک دیا ہے اور جسے اللہ نے حرام کر دیا لیکن اگر انھیں کرنا پڑتا ہے، تو صرف ان جانوں کے لیے وہ قتال جائز رکھتے ہیں، جن جانوں کو اللہ کی عدالت کے قائم رکھنے کے لیے سزا دینا ضروری ہے۔

اس قانون کی رو سے اگر قتل نفس جائز ہے، تو صرف ان جماعتوں، فوجوں، جتھوں کا، جن کا وجود، دنیا کی ہدایت و حریت کے لیے، قوموں کے ایمان کے لیے، سچائی کی بقا کے لیے ایک فتنہ ہو۔ قرآن کے قانون نے فتنہ وفساد کو قتال سے زیادہ سنگین قرار دیا ہے، اسی طرح، جس طرح ایک جج، عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر پھانسی کو جائز قرار دیتا ہے۔ قاتل اس کے سامنے اِس جرم پر لایا گیا ہے کہ اس نے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ جج حکم دیتا ہے کہ قاتل کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ جج بھی قتل کرتا ہے، مگر اس کا یہ قتل کرنا، قتل نہیں، زندگی کا اعلان ہے۔ قصاص میں تو فی الحقیقت زندگی چھپی ہوئی ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَاب اگر قاتلوں سے قصاص نہ لیا جائے اگر ظالموں سے خدا کے بندوں کو نہ بچایا جائے تو دنیا ظلم کا ایک جہنم بن جائے۔

شریعت نے قتل نفس کو ایک سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ جو دنیا میں انسان کر سکتا ہے اور اگر قتل نفس کو جائز رکھا ہے، تو صرف فتنہ و فساد کے دور کرنے کے لیے اور جب کہ علاج ہو جائے تو پھر اس علاج کو جائز نہیں رکھا۔

ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ اسلام مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل جائز رکھتا؟ اسلام نے بلا عذر شرعی مسلمانوں کے قتل کو ایک ایسی معصیت بتایا ہے کہ بمنزلہ کفر کے ہے۔ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد تم کافر نہ ہو جانا، کافروں کا چلن نہ اختیار کر لینا اور کافروں کا چلن یہ ہوگا کہ مسلمان، مسلمانوں کی گردنیں مارنے لگیں۔ اِسی طرح بخاری اور مسلم کی حدیث میں فرمایا، جس نے مسلمانوں پر ہتھیار اٹھایا، وہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہا۔ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور میں اس کی کوئی تاویل نہ کروں گا۔ اسی طرح قرآن کی نص قطعی موجود ہے:

وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خَالِدًا فِیْھَا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّلَہٗ عَذَاباً عَظِیْمًا. (النسآء ۴:۹۳)

یعنی جس شخص نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کیا، تو اس کی جزا یہ ہے کہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہے اور اللہ کی لعنت میں مبتلا رہے۔

بخاری اور مسلم میں حضرت اسامہ کا واقعہ موجود ہے۔ انہیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص موقعہ پر دشمنوں سے مقابلے کے لیے بھیجا تھا، جن کی قوتیں اسلام کو نقصان پہنچانے پر لگی ہوئی تھیں۔ حضرت اُسامہ نے ایک شخص پر تلوار اٹھائی اور جوں ہی وار کرنا چاہا، وہ کلمہ توحید پکار اٹھا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے پروا نہ کی اور اسے قتل کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا گیا، تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سُنتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس درجہ حزن و ملال چھا گیا کہ فرمایا اے اُسامہ، افسوس تو نے اس آدمی کو مار ڈالا، حالانکہ اس نے لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ کہا تھا! حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ بار بار اسی جملے کو دہراتے رہے اور بار بار اس پر افسوس و غم کا اظہار کرتے رہے، یہاں تک میرے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ آج کے دن سے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور مجھے حضور کا یہ غم نہ دیکھنا پڑتا!

یہ اظہارِ غم اس لئے تھا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا گیا تھا، جو آخری وقت سہی مگر مسلمان ہو گیا تھا۔ اُسامہ نے عرض کیا، یا حضرت اس شخص نے محض جان کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کو تو کیا جواب دے گا، جب کلمہ لا الہ الا اللہ خونیں چادر لے کر تیرے سامنے آئے گا؟

اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک شخص نے میدان جنگ میں اِس کلمے کا اقرار کیا، کب؟ اس وقت جب اُسامہ کی تلوار اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک لمحہ وہ مسلمان رہا ہوگا۔ ایک لمحے کا مسلمان، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا عزیز تھا!

اب مجھے بتاؤ کہ ان بدبخت مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا، جنھوں نے ان مومنوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا، جو چھ سو برس سے اسلام کی حفاظت کر رہے ہیں؟ کھلی بات ہے کہ آج انگریزی فوج میں بھرتی ہونا یا اس فوج میں رہنا، یا دوسروں کو رکھانا، یہ سب کے سب ملعون اور پھٹکار کے کام ہیں۔ یہ کام مسلمانوں کو مٹانے اور ہندوستان کو غلام بنانے کے کام ہیں، اس لیے اسلام کے قانون میں بہت بڑے کفر کے کام ہیں۔

میرے دوستو! اگر کراچی کی تجویز میں اسی بات کا اعلان کیا گیا ہے، تو یہ کراچی کی تجویز نہ تھی، بلکہ اسلام کے قانون کا اعلان تھا۔ اب اگر یہ جرم ہے تو میں تم سب سے پوچھتا ہوں اور ہر اس شخص سے، جس کے دل میں سچائی کا چراغ بجھ نہیں گیا ہے کہ کیا اسے جرم سے انکار ہو سکتا ہے؟ ہم کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے پاس بڑے بڑے جیل خانے ہیں لیکن کوئی ایسا جیل خانہ نہیں ہے، جس میں برٹش گورنمنٹ، سچائی اور ایمان کو قید کر سکے......

لاہور میں جمعیت کانفرنس

پیغام نکل رہا تھا کہ لاہور میں جمعیت علماء ہند کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ مولانا صدر تھے۔ میں ساتھ گیا تھا۔ ریل میں مولانا نے اپنا خطبہ لکھا۔ ریل کے ہالے ڈولے میں ہاتھ بے قابو ہوتا ہے۔ پھر مولانا کا ہاتھ، جو قلم پر قابو پاتے ہی ''قدم'' نہیں چلتا تھا، بگٹٹ دوڑتا تھا اور جب نظرِ ثانی کا وقت آتا تھا، تو کٹ پٹ کر تحریر ایسی ہو جاتی تھی کہ لکھیں موسیٰ اور پڑھیں عیسیٰ کی مثل صادق آتی تھی۔

مجھ سے کچھ کہا نہیں۔ خطبہ بھی دکھایا نہیں، مگر کانفرنس میں دفعتاً حکم ہوا کہ خطبہ سنا دو۔ تحریر نہایت شکست، کٹی پٹی قیمہ بنی ہوئی، روانی سے پڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس پر مولانا جھنجلا گئے اور میری جگہ ایک اور صاحب کو خطبہ سنانے کی مہم سپرد کر دی۔

شام کو شکوہ ہوا کہ اس طرح ناکام کیوں رہے؟ عذر پیش کیا تو ہمیشہ کی طرح یہ عتاب بھی لطیفوں میں تحلیل ہو گیا۔

عجیب حرکت!

مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسری مرحوم ومغفور، مشہور عالم اور جماعت اہل حدیث کے سردار تھے مگر مجھے مرحوم سے بغض ہو گیا تھا۔ بغض کی وجہ یہ ہوئی کہ جنگ عظیم کے بعد جب کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں ہوئے اور جمعیت علماء ہند کا بھی باضابطہ قیام یہیں طے پایا تو میں بھی امرتسر پہنچا اور جمعیت کی مجلس شوریٰ میں شرکت کی۔ اس زمانے میں چھوٹی سی داڑھی بھی منہ پر تھی، مگر مولویانہ روپ بھر لینا میرے بس سے باہر تھا۔ مجلس ایک ہال میں بیٹھی تھی اور دروازے پر رضاکاروں کا پہرا لگا تھا۔ میں نے اندر جانا چاہا، تو رضاکاروں نے مولوی نہ سمجھ کر روک دیا۔ لاکھ لاکھ کہتا ہوں، ارے بھئی ہم بھی مولوی ہیں، مولانا ہیں! مگر کسی کو یقین نہ آیا۔ مجبوراً مرحوم مفتی مولانا کفایت اللہ صاحب کے نام جو مجلس کے صدر تھے، رقعہ بھیجا اور مفتی صاحب نے فوراً اندر بلوالیا۔

اب کیا دیکھتا ہوں کہ مفتی صاحب کے پہلو میں مولانا ثناءاللہ تشریف فرما ہیں اور صدارت کے فرائض زبردستی خود ہی انجام دے رہے ہیں۔ کسی بات پر میں بولنے کھڑا ہوا، تو مولانا نے حقارت آمیز انداز سے ہاتھ ہلا کر یہ کہتے ہوئے مجھے روک دیا ”صاحب زادے، یہ علماء کی مجلس ہے!“ جب جب میں منہ کھولتا مولانا یہی فرما کے میرا منہ بند کر دیتے!

اب تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ جلسے میں اچھی خاصی تعداد میرے دوستوں کی بھی موجود تھی۔ مولانا محمد اکرم خاں، مولانا منیرالزماں وغیرہ احباب سے اُٹھ کر میں نے سرگوشی کی۔ یہ لوگ بھی مولانا ثناءاللہ سے جلے بیٹھے تھے۔ طے پایا گیا کہ جو آواز میں بلند کروں، وہی آواز یہ بھی بلند کریں گے۔ مولانا ثناءاللہ مفتی صاحب کو بولنے ہی نہیں دیتے تھے اور مداخلت کا گویا ٹھیکہ لیے بیٹھے تھے۔ اب ہوا یہ کہ مولانا نے ادھر منہ کھولا اور میں چلا اٹھا ”میاں صاحب، یہ علماء کی مجلس ہے!“ معاًسب طرف سے یہی آوازیں بلند ہو جاتیں!

بڈھا تجربہ کار تھا، معاملہ سمجھ گیا اور پھر جلسے میں مداخلت نہیں کی۔ دوسرے دن خود مولانا ثناءاللہ کے مکان پر جلسہ تھا۔ میں پہنچا، تو دیکھا، مولانا قیمتی قالین پر بیٹھے ہوئے ہیں اور قالین پر کئی گاؤ تکیے لگے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور جوش سے فرمایا ”اِدھر آیئے مولانا!“ اور اپنے پہلو میں زبردستی بٹھا لیا! بعد میں جو لوگ آئے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کبھی مجھے کبھی مولانا کو دیکھتے کہ کل کیا صورت تھی اور آج کیا صورت ہے!

مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کے اس اعلیٰ اخلاق، محاسبہ نفس، خاکساری، مہمان نوازی کا دل پر بہت اثر ہوا تھا، مگر میری جوانی تھی اور دل میں ایک شیطان چھپا بیٹھا تھا' یہ شیطان اکثر میرے اندر رہا ہے۔ خطرناک مذاق کے ذریعہ لطف اُٹھانے کا شیطان۔ اس مذاق میں، مجھے یقین ہے، بدنفسی کبھی شامل نہیں رہی۔ مولانا ثناء اللہ صاحب کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا، ویسے معاملوں میں مذاق سے رک جانا میرے لیے بہت مشکل تھا۔

بہرحال اب لاہور میں جمعیت علماء ہند کی کانفرنس ہورہی تھی۔ مولانا آزاد صدر تھے۔ کانفرنس نہایت سنجیدہ اور باوقار تھی۔ دور دور سے علماء آئے تھے۔ الہٰ آباد کے ایک مشہور صوفی بھی تشریف لائے تھے۔ موصوف کے علمی و باطنی کمالات سے واقف ہونے کا تو موقعہ نہیں ملا لیکن ان کی نیکی اور فرشتوں جیسی معصومی میرے دل پر اب تک نقش ہے۔ معمر بزرگ تھے۔ سجادہ نشین تھے اور "وہابیوں" کے نزدیک بغیر کسی دلیل کے "مشرک" تھے خود صوفی صاحب بھی بڑی معصومیت سے مغلظ گالیاں دینے کے عادی تھے، ایسی ایسی گالیاں تصنیف فرماتے تھے کہ نہ کبھی سنی گئیں نہ کسی کے خیال میں آئیں۔

رات کے اجلاس میں موصوف کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ خطرناک مذاق کی اسکیم پہلے سے ذہن میں مرتب تھی اور میں جان بوجھ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ موصوف نے اپنی ضرورت مجھ سے بیان کی۔ عرض کیا۔ چلئے میرے ساتھ۔ رات کو آنکھوں سے کم دیکھتے تھے۔ پھر جگہ بھی نئی تھی اور ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ کچھ تکلف کے بعد مجھے ساتھ لینے پر راضی ہوگئے۔

کانفرنس پنجاب کی راج دھانی میں ہورہی تھی۔ پنڈال کے ساتھ پیشاب پاخانے کے لیے تنبو لگادیئے گئے تھے، مگر بہت بری حالت میں تھے۔ میں تو پہلے سے سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ جان بوجھ کر موصوف کو ایسے تنبو میں لے گیا جو غلاظت سے بھرا پڑا تھا۔ ان کے پاؤں سن گئے۔ اب کیا تھا۔ گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ مجھ سے بھی ذرا خفگی سے فرمایا۔ ایسی جگہ کیوں لے آئے؟ میرے اندر کے شیطان نے عرض کیا، مولانا سب سے اچھے تنبو میں لایا ہوں، مگر کروں کیا، جب یہاں لوگ آپ کو تکلیف دینے پر تلے بیٹھے ہیں!

بڑی حیرت، بڑے غصے سے پوچھا "وہ کون لوگ ہیں؟ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟" میں نے معصوم بن کر جواب دیا کیا عرض کروں۔ بزرگ ہی برائی پر تل جائیں، تو ہما شما کی شکایت کیا؟

فرمانے لگے "آخر بتایئے تو، کون ہیں وہ لوگ اور کیا چاہتے ہیں؟"

عرض کیا "الامر فوق الادب! مگر فتویٰ دیدیجئے کہ غیبت تو نہیں ہوگی!"

موصوف کو جواب سننے کی بے تابی تھی۔ چیخ اٹھے "میاں، کیا کہتے ہو۔ غیبت کیسی؟ ان...... کی حقیقت کھول دو!"

میں نے بڑی لجاجت سے کہا "مگر ڈر لگتا ہے!"

غصے ہو گئے "میاں، لکھنو کے چو نچلے چھوڑو۔ حرام زادوں کے نام تو بتاؤ۔ دیکھتے نہیں، کس آفت میں مبتلا ہوں۔ کب تک نجاست میں ڈالے رکھو گے!"

میں نے رازداری کے لہجے میں کہنا شروع کیا "آپ مولوی ثناء اللہ کو تو جانتے ہی ہیں!"

بڑی بے صبری سے جواب دیا "ہاں، ہاں وہی وہابڑا املا............تو ثناء اللہ سے اس معاملے کا کیا تعلق؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا "آپ کو خبر نہیں، وہابی تو خود مجھے بھی وہابی سمجھتے ہیں۔"

جلدی سے کہنے لگے "اور میں بھی آپ کو وہابی سمجھتا ہوں!"

میں نے کہا "خیر، وہابی ہوں یا کیا ہوں، خدا ہی جانتا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہابیوں نے آپس میں صلاح کی ہے کہ مشرکوں، قبر پرستوں کا گرو گھنٹال، لاہور آیا ہوا ہے۔ صاف بچ کر جانے نہ پائے اور آپ جانتے ہیں کہ وہابی اپنے امیر، مولوی ثناء اللہ کے اشاروں پر چلتے ہیں!"

یہ سننا تھا کہ موصوف کا پارہ، آسمان پر چڑھ گیا۔ ان کے غیظ و غضب کا بیان میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے، گالیوں کا ایک توپ خانہ کھل گیا، مگر اس تنبو سے باہر نہیں جا سکتے تھے، جب تک غلاظت دور نہ ہو۔ مجھے تو اپنا مذاق پورا کرنا تھا۔ دور سے پانی لا کر پاؤں اور جوتے اپنے ہاتھ سے صاف کئے۔

اب وہ صاف ستھرے نکلے اور ڈپٹتے چنگھاڑتے کانفرنس کی طرف لپکے "......وہابڑے...... کو مزا چکھادوں گا! سمجھا کیا ہے وہابڑا......؟" سب لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ مولانا آزاد بھی تعجب میں تھے اور بپھرے ہوئے شیر کو منانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود مولانا ثناء اللہ صاحب بھی، جو بے چارے معاملے سے بالکل بے خبر تھے، دوڑ پڑے "حضرت مولانا کیا بات ہے؟" اس پر تو آتش فشاں ہی پھٹ پڑا۔ کوئی قلم اس نظارے کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ناقابلِ بیان، تصور تنگ ہوا اور مظلوم مولانا ثناء اللہ کو اس وقت کانفرنس سے کھسک جانا پڑا مگر مولانا آزاد جلد ہی معاملہ سمجھ گئے۔ پر معنی تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا اور چپ رہ گئے۔

کانفرنس کے بعد مولانا نے خفگی سے فرمایا "یہ کیا حرکت کی؟" میں نے امرتسر کی جمعیت علماء کی مجلس شوریٰ کا واقعہ سنا دیا، تو بے اختیار ہنس پڑے مگر کہنے لگے "مولوی صاحب، ایسا خطرناک مذاق کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ آپ نے ذرا نہ سوچا کہ کانفرنس، پنجاب کے پایۂ تخت میں ہو رہی ہے اور مولانا ثناء اللہ کا یہاں بہت اثر ہے۔ الہٰ آبادی صاحب کی وجہ سے ہنگامہ ہو جاتا تو ہم دنیا کو کیا منہ دکھاتے؟"

بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے اعتراف قصور کے ساتھ معذرت چاہی۔

ایک اور غلطی!

مگر صبح کانفرنس کا دوسرا اجلاس شروع ہوا، تو شیطان نے پھر دل میں گدی گدی پیدا کی۔ ایسی سخت گدی گدی تھی کہ مولانا کی خفگی یاد رہنے پر بھی میں اپنی حرکت سے باز نہ رہ سکا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم کے ایک رفیق، مولانا عزیر گل ہیں۔ مجھے ان سے بڑی محبت رہی ہے۔ سرحدی ہیں اور بچوں جیسا معصوم دل رکھتے ہیں۔ کانفرنس میں شریک تھے۔ میں نے ان کے کان میں کہا، مولانا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کس طرح بڑھ بڑھ کے بول رہے ہیں، حالانکہ کھدر کے جبے کے نیچے سب کپڑے ولایتی ہیں!

یہ میں نے یوں ہی انکل پچو کہہ دیا تھا۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ مولانا کے کپڑے کیسے ہیں۔ مولانا عزیر گل سنتے ہی آگ ہو گئے۔ کہنے لگے "اچھا یہ ریاکاری!" بے تحاشا دوڑ کے مولانا ثناء اللہ کے پاس پہنچ گئے اور اپنے سرحدی لہجے میں کہنے لگے "تم ریاکار ہے۔ جبہ کھدر کا ہے اور اندر ولایتی کپڑا پہنتا ہے!" مولانا ثناء اللہ کو کاٹو تو لہو نہیں۔ عزیر گل صاحب دست درازی کرنے ہی والے تھے کہ مولانا آزاد نے روکا اور بیٹھ جانے کو کہا۔ واقعی مولانا ثناء اللہ مرحوم کا اندرونی لباس، ولایتی کپڑے ہی کا تھا!

اجلاس کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا، آخر اس بوڑھے مولوی (مولانا ثناء اللہ) کا کب تک پیچھا لیے رہو گے؟ آپ بہت خطرناک مذاق کر جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا، تو کانفرنس کا خدا حافظ ہے! مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور سچے دل سے وعدہ کیا کہ پھر ایسی حرکت نہ ہوگی۔ وعدہ تو کر لیا، مگر جانتا تھا کہ خود مولانا کو بھی اس قسم کے مذاق سے تفریح ہوتی ہے اور کانفرنس کا معاملہ نہ ہوتا تو ان مذاقوں سے خوش ہی نہ ہوتے، حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ مولانا کی طبیعت پر ظرافت و مذاق کا

غلبہ تھا مگر ذہن کچھ ایسا تھا کہ مصلحت کے وقت طبیعت اِس طرح قابو میں رہتی تھی کہ بالکل دوسرے آدمی معلوم ہوتے تھے۔

لاہور ہی میں مولانا سے معلوم ہوا کہ خود مولانا ثناء اللہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ الٰہ آبادی صوفی اور عزیز گل صاحب کے واقعات کا بانی میں ہوں اور انہوں نے مولانا سے درخواست کی کہ ہم میں صفائی کرا دیں۔ یہ سن کر میں مولانا ثناء اللہ سے بیچ میں ملا اور پورے اخلاص سے معافی چاہی۔ مرحوم عالی ظرف بزرگ تھے۔ کھلے دل سے مجھ گناہ گار کو معاف کر دیا اور عمر بھر محبت و شفقت فرماتے رہے۔ خدایا، پھر کبھی ہماری اِس زمین پر ایسے نیک لوگ دکھائی دیں گے؟

لالہ لاجپت رائے

لالہ لاجپت رائے ہندوستان کے ایک بہت بڑے لیڈر تھے اور ''شیر پنجاب'' کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ کانفرنس کے بعد لاہور سے واپسی پر یہ بھی شریک سفر ہو گئے۔ کلکتہ جا رہے تھے۔

میرے ساتھ پاندان تھا اور مولانا کے ٹفن بکس میں رکھا تھا۔ مولانا پان نہیں کھاتے تھے لیکن جب کھانے پر آتے تھے تو ہر پانچ سات منٹ پر طلب کرتے تھے اور تمباکو اتنی بہت ڈالتے تھے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔

ہم دونوں بار بار پان کھا رہے تھے اور لالہ جی کھلی بیزاری سے دیکھ رہے تھے۔ سیاسیات پر باتیں کرتے کرتے دفعتاً کہنے لگے مولانا، تعجب ہے کہ آپ بھی پان کھاتے ہیں۔ بڑی میلی اور مُضرِ صحت عادت ہے!

مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے جواب دیا ''اِن حضرت سے کہیے۔ یہی کھلا رہے ہیں ساتھ ہی میری طرف خاص نظروں سے دیکھا اور میں سمجھ گیا کہ لالہ جی کو بنانا مقصود ہے۔ اشارہ پا کر عرض کیا ''لالہ جی، آپ نے کبھی پان کھایا نہیں، اسی لیے مذمت فرما رہے ہیں''

کہنے لگے ''واہ، کئی مرتبہ کھایا ہے۔ بہت بدمزہ ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''پان کھاتے تو بدمزہ ہرگز نہ کہتے۔ میرے ہاتھ سے ایک پان کھایئے۔ پھر مزے کا فیصلہ کیجئے گا''

مولانا نے بھی تائید کی اور لالہ جی پان کھانے پر راضی ہو گئے۔ میں نے توجہ کے ساتھ پان بنایا۔ کتھا چونا برابر رکھا۔ چھالیا، الائچی، لونگ دی اور لکھنوٴ کی تمباکو کی دو تین پتیاں بھی ڈال دیں۔

لالہ جی نے گلوری ہاتھ میں لے کر کھولنا چاہی۔ میں چیخ اٹھا، کیا غضب کرتے ہیں، گلوری کھولتے ہی ہوا لگ جائے گی اور پان کڑوا ہو جائے گا۔ فوراً منہ میں رکھ لیجئے! لالہ جی نے گھبرا کر جلدی سے گلوری منہ میں داخل کر لی اور چبانے لگے۔ جلد ہی ایک عجیب سی شکل ان کی بن گئی۔ آنکھیں پھیل گئیں اور مولانا سے کہنے لگے، واقعی ایسا پان تو میں نے کبھی کھایا نہیں۔ بڑے مزے کا ہے!

اب تو لالہ جی جیسے مسحور ہو گئے ہوں۔ گلوریوں پر گلوریاں مانگنا شروع کر دیں۔ میں ہر گلوری میں تمباکو کی مقدار بڑھاتا جاتا تھا اور لالہ جی ہر گلوری کو پہلی سے لذیذ بتاتے اور تعریف میں رطب اللسان ہو ہو جاتے۔ اُدھر مولانا کی تقریر جاری تھی۔ پان کی تاریخ، پان کی قسمیں، مختلف زمانوں اور ملکوں میں پان بنانے کی ترکیبیں، غرض کہ پان کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سنائیں، ایسے ایسے نکتے بیان کیے کہ لالہ جی ہکا بکا رہ گئے، حالانکہ خود بھی بڑے لسان اور مانے ہوئے مقرر تھے۔

ہوڑہ اسٹیشن پر جب ہم سب اترے اور لالہ جی رخصت ہونے لگے، تو بڑی حسرت سے فرمایا "اب ایسے پان کہاں ملیں گے؟" میں نے عرض کیا، ہر جگہ ملیں گے۔ پان بنانے والے یا بنانے والی سے کہہ دیجئے گا کہ کتھا چونا برابر رکھے اور آپ ہر پان میں تمباکو ڈال لیا کیجئے گا!

لالہ جی حیرت سے تقریباً چیخ اٹھے "تمباکو؟......... میں نے تو کبھی تمباکو چکھی تک نہیں!"

عرض کیا "آپ چکھنا کہہ رہے ہیں، حالانکہ تمباکو کھاتے چلے آرہے ہیں!"

اِس پر مولانا نے فرمایا "پان بغیر تمباکو کے کھانا، گناہِ بےلذت ہے اور مذاقِ سلیم کی عدالت میں سنگین جرم!"

بعد میں مولانا برسوں اس واقعہ کو یاد کر کے لطف اُٹھاتے رہے!

دلچسپ مکالمہ

لاہور کے سفر نے ایک اور سفر یاد دلا دیا۔ امرتسر سے کلکتہ لوٹ رہے تھے۔ یکا یک ایک لحیم شحیم، بلند بالا پنجابی بزرگ بھی ڈبے میں آدھمکے۔ ان کی برتھ ٹھیک مولانا کی برتھ کے سامنے تھی اور میں مقابل میں اوپر کی برتھ پر تھا۔ یہ صاحب بوڑھے تھے، داڑھی اور پٹے مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ وضع قطع دہقانیوں کی تھی۔ لمبا کرتا، لٹھے کی تہبند، سَر پر بے ہنگم پگڑ۔ امیر آدمی تھے۔ نوکر، پنجابی ساخت کا بھدا بھیانک حقّہ سامنے رکھ کر چلا گیا۔

بیٹھنے کے بعد حضرت کچھ دیر تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مولانا کو دیکھتے رہے، پھر گفتگو شروع کر دی۔ گفتگو ایسی دلچسپ تھی کہ میں نے ریل ہی میں قلم بند کر لی۔ اب سنیے یہ گفتگو۔ پنجابی کی باتیں زیادہ تر میرے لفظوں میں ہیں:

پنجابی: میاں صاحب، آپ کہاں جا رہے ہیں؟

مولانا: دور پورب میں۔

پنجابی: دور پورب میں کہاں؟

مولانا: جہاں کالی مائی کا استھان ہے!

پنجابی: آپ ہندو ہیں؟

مولانا: استغفر اللہ!

پنجابی: تو آپ مسلمان ہیں؟

مولانا: الحمد للہ!

پنجابی: مگر کہتے ہیں، وہاں کالی مائی کا استھان ہے!

مولانا: واقعہ یہی ہے۔

پنجابی: آپ کالی کو مانتے ہیں؟

مولانا: معاذ اللہ!

پنجابی: تو اس جگہ کا نام کیا ہے؟

مولانا: کلکتہ!

پنجابی: آپ پہلے ہی کہہ دیتے کہ کلکتہ جا رہے ہیں۔

مولانا: اس طرح کہنے کی عادت نہیں۔

پنجابی: (ہنس کر) اور کہاں سے آ رہے ہیں۔

مولانا: یہیں امرتسر سے۔

پنجابی: یہاں کس مطلب سے آئے تھے؟

مولانا: ایک تقریب تھی۔

پنجابی: تکریب کیا ہوتی ہے؟

مولانا: زواج!

پنجابی: جواز کیا؟

مولانا: عرس!

پنجابی: کسی پیر کے عرس میں آئے تھے؟

مولانا: پیر کے عرس میں نہیں، شادی میں۔

پنجابی: میاں صاحب، ابھی تو آپ عرس کہہ رہے تھے؟

مولانا: شادی کو عرس بھی کہتے ہیں!

پنجابی: میاں صاحب، ہم بے پڑھے یہ سب کیا جانیں۔ تو کس کی شادی تھی؟

مولانا: امت مسلمہ کی!

پنجابی: اچھا۔ کسی بڑے مَلِک کی لڑکی کی شادی تھی۔ کس سے ہوئی؟

مولانا: انقلاب سے!

پنجابی: اکبال سے؟ وہی اکبال، جو سنتے ہیں کوئی شاعر ہے؟

مولانا: اقبال سے نہیں، انقلاب سے!

پنجابی: تو یہ بھی کسی بڑے ملک کا لڑکا ہوگا؟

مولانا: ملک کا لڑکا نہیں ہے، بلکہ خود اللہ میاں کا پیارا ہے!

پنجابی: (ہکا بکا ہو کر) اللہ میاں کا پیارا؟ ارے یہ تو............

مولانا: ارے ورے کچھ نہیں اور یہ انقلاب کہتا ہے کہ انگریز کو نکال دے گا اور سب ملکوں کی جائدادیں چھین کر غریبوں کو بانٹ دے گا!

پنجابی: ارے غضب............اور میاں صاحب ہماری جائیداد؟

مولانا: اور انقلاب کہتا ہے کہ ملکوں کی گردنیں ماردی جائیں گی کیونکہ غریبوں کا خون چوستے ہیں!

پنجابی: (ہاتھ جوڑ کر) میاں صاحب، آپ اس اکبال......ارے توبہ......انقلاب کو جانتا ہے؟

مولانا: اسی کی شادی سے تو لوٹ رہا ہوں۔

پنجابی: (اور زیادہ خوشامد سے) تو میاں صاحب، آپ اس سے ہماری سفارش کردیں۔

مولانا: میں آپ کو جانتا نہیں۔

پنجابی: ہم بھی ملک ہیں مگر ہم نے کبھی رعیت پر ظلم نہیں کیا ہے، میاں صاحب ہماری سفارش کردو گے، تو ہم تمہیں خوش کردیں گے!

مولانا: ہم رشوت نہیں لیتے۔

پنجابی: یہ تو دل کی خوشی کی بات ہے۔ رشوت کی نہیں۔

مولانا: ہم یہ سب نہیں جانتے۔

پنجابی: (افسردہ ہو کر) تو آپ بھی ملک ہیں؟

مولانا: خدا نہ کرے۔

پنجابی: تو آپ غریب ہیں؟

مولانا: ہاں۔

پنجابی: مگر سیکنڈ کلاس میں چلتے ہیں!

مولانا: ہاں۔

پنجابی: تو آپ کو روپیہ کہاں سے ملتا ہے؟

مولانا: کاروبار سے۔

پنجابی: کیا کاروبار ہے؟

مولانا: کاغذ بیچتے ہیں!

پنجابی: اچھا نفع ہوتا ہے؟

مولانا: ہاں۔

پنجابی: بال بچے ہیں؟

مولانا: سب مر گئے۔

پنجابی: اور شادی نہیں کی؟

مولانا: نہیں۔

پنجابی: کیوں؟

مولانا: جی نہیں چاہا۔

پنجابی: اکیلے رہنے سے تو تکلیف ہوتی ہوگی۔

مولانا: ہوا کرے۔

پنجابی: آپ کا نام؟

مولانا: محمد علی!

پنجابی: شوکت علی کے بھائی؟

مولانا: بلکہ شوکت علی کے چچا!

پنجابی: میاں صاحب تمھاری عمر تو زیادہ دکھائی نہیں دیتی۔ تم چچا ہو تو شوکت علی اور اس کے بھائی محمد علی کی عمر کیا ہوگی؟

مولانا: شوکت بارہ برس کا ہے اور محمد علی گیارہ برس کا!

پنجابی: اس پر بھی یہ لڑکے ایسے ہیں کہ انگریز کانپ رہا ہے!

مولانا: آخر انقلاب کے ساتھ بڑھے پلے ہیں!

پنجابی: اب ہمیں سمجھ آئی!

اور لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ نہ جانے سو گیا تھا، یا اس عجیب وغریب گفتگو پر اپنی موٹی عقل دوڑا رہا تھا!

پولیس کا چھاپہ

پرنس آف ویلز آرہا تھا اور پیغام کلکتہ میں آگ لگا رہا تھا۔ انگریزوں کا سب سے بڑا گڑھ کلکتہ میں تھا اور وہ پرنس کا بائیکاٹ برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے گورنمنٹ پیغام کی آواز بند کردینے پر تلی ہوئی تھی، مگر کوئی بات گرفت میں نہ آتی تھی۔

میں احتیاطاً اخبار کا وہ نمبر مرتب کر گیا تھا، جسے میرے لاہور جانے کے بعد نکلنا تھا۔ اخبار، جمعہ کے دن صبح کو نکلا کرتا تھا، مگر میں جمعرات کی صبح ہی کلکتہ واپس آگیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ پولیس نے چھاپہ مارا اور اخبار کے سب مضمون اور کاپیاں اُٹھا لے گئی۔

بڑا غصہ آیا۔ مولانا دہلی میں رہ گئے تھے۔ اب جو کچھ کرنا تھا، اپنی ذمہ داری پر کرنا تھا۔ اخبار آٹھ صفحے کا ہوتا تھا لیکن میں نے منشی صاحب کو بلا کر کہا، اخبار ٹھیک وقت پر نکلے گا اور آٹھ کا نہیں، سولہ صفحے کا ہوگا! منشی صاحب گھبرا گئے کہ اتنے کم وقت میں کچھ نہیں ہو سکتا، مگر میں نے تعریفیں کر کے انھیں آمادہ ہی کر لیا کہ آٹھ صفحے لکھ ڈالیں۔ باقی آٹھ صفحے ٹائپ میں کمپوز کرائے اور سرخ روشنائی میں چھاپے۔ جمعہ کے دن صبح ہی اخبار، ڈبل نمبر کی شکل میں ہر طرف بک رہا تھا۔ یقیناً یہ حکومت کی ایک شکست تھی۔

گرفتاری

جانتا تھا، حکومت جلد گرفتار کر لے گی کیونکہ کلکتہ میں پیغام ہی اکیلا اردو اخبار تھا، جو پرنس کے بائیکاٹ کی زور شور سے تبلیغ کر رہا تھا، بلکہ حقیقت میں پیغام برطانی راج کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی آتشیں دعوت دیتا تھا۔

کلکتہ میں سب سے پہلے حکیم سعید الرحمان دہلوی گرفتار ہوئے ان کی گرفتاری پر کلکتہ میں ایسا مظاہرہ ہوا، جیسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں مظاہرے میں پیش پیش تھا۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ پیغام کی ایڈیٹری کے ساتھ مظاہرے کی قیادت بھی۔ آخر حکومت کہاں تک ضبط کرتی؟

ایک صبح میں اپنے ٹاٹ کے "محل" میں شان سے بیٹھا تھا۔ سامنے ناشتہ رکھا تھا۔ اور میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک یورپین افسر نے دروازے سے منہ نکالا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ لال بازار تھانے لے گئے اور ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ کوٹھری میں چور، گرہ کٹ اور قسم قسم کے جرائم پیشہ بھرے ہوئے تھے۔ فحش مذاق ہو رہا تھا۔ گالیاں چل رہی تھیں۔ سخت تعفن پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اسی کوٹھری میں پیشاب کرتے تھے۔ میں ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا۔ شام کو مجرموں کے ساتھ قیدیوں کی گاڑی میں اِس "مجرم" کو بھی جیل لے گئے!

یہ پریسیڈنسی جیل تھا۔ یہاں پتہ چلا کہ پرنس کی آمد کے سلسلے میں دو ہی گرفتاریاں ہوئی ہیں: میری اور پروفیسر جتیندر لال بنرجی کی۔ اس کے بعد سلسلہ شروع ہو گیا، مولانا محمد اکرم خاں اور دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ پریسیڈنسی جیل میں کچھ چینی بھی بند تھے۔ یہ لوگ آب کاری کے سلسلے میں پکڑے گئے تھے۔ کوئی افیون باہر سے لایا تھا تو کوئی خفیہ طور پر شراب بناتا تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر چینیوں نے، جو ہماری زبان نہیں جانتے تھے، بڑی ہمدردی سے صرف تین لفظوں میں سوال کیا: "اوپیم؟ (افیون) وائن؟ (شراب) گاندھی؟" چینیوں کے خیال میں صرف تین ہی جرم ایسے تھے جو آدمی کو جیل پہنچا سکتے تھے، افیم، شراب اور گاندھی!

پہلی پیشی پر معلوم ہوا کہ مجھے پیغام کے کسی مضمون کی بنا پر گرفتار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ کسی تقریر پر لیکن سزا ہو جانے پر ایک اور مقدمہ کھڑا کیا گیا، یہ پیغام کی بعض تحریروں کی بنا پر تھا۔ اتفاق سے ان "قابلِ اعتراض" تحریروں میں میری تحریر کوئی نہ تھی۔ سب مولانا کی تھیں۔ مولانا، اخبار نویسی کے بھی امام تھے اور میں اس وقت نوسیکھیا تھا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ انتہائی جوش و خروش سے لکھنے پر بھی ناتجربہ کار چیلا، گرو جی سے "بازی" لے گیا۔ درتوں مولانا سے اس پر خوب خوب نوک جھونک رہی!

کچھ دن بعد مجھے علی پور سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ ابھی تک سزا نہیں ہوئی تھی، اس لیے قیدیوں سے الگ رکھا گیا تھا۔ ایک رات اپنی سیل میں ٹنڑوں ٹوں اکیلا بیٹھا تھا کہ ناگہاں کیا دیکھتا ہوں، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیش بندھو سی، آر داس سامنے کھڑے ہیں۔ عجیب نظارہ تھا۔ میں چیخ مار کے رونے لگا اور چلا اٹھا ''گورنمنٹ آپ کو بھی کھسیٹ لائی!'' دو تین منٹ باتیں ہوئیں اور دونوں بزرگ، پولیس کے پہرے میں جیل کے کسی اور حصے میں چلے گئے۔

میرا اور جتندر لال بنرجی کا مقدمہ پیش ہوا اور دو دو سال کی سزا کا حکم دیا گیا، حالانکہ سی۔ آر۔ داس اور مولانا آزاد کو جو اصلی لیڈر تھے، بعد میں ایک ہی ایک برس کی سزا ملی!

مولانا کی محبت

میری گرفتاری پر مولانا نے پیغام میں جو نوٹ لکھا تھا، ان کی محبت اور قدر دانی کا ثبوت ہے۔ پہلی سرخی تھی ''ایڈیٹر پیغام کی گرفتاری'' دوسری تھی:

لِمِثْلِ هٰذا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُون! نوٹ نیچے نقل کرتا ہوں:

''کل چار بجے جب میں بمبئی میل سے کلکتہ پہنچا اور متوقع تھا کہ حسب معمول اسٹیشن پر مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات ہوگی، تو ان کی جگہ ان کی گرفتاری کی خبر نے میرا استقبال کیا۔ وہ اسٹیشن پر ملتے، تو میرے دل میں ان کی محبت بڑھتی، جو گزشتہ دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے، مگر وہ نہ ملے اور جیل خانے چلے گئے۔ اس طرح انہوں نے صرف اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزت کے لیے بھی میرے دل سے تقاضا کیا۔ اب میں ان سے صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی عزت بھی کرتا ہوں۔

ان کی گرفتاری کے لیے کوئی وارنٹ نہیں جاری کیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ پولیس کمشنر نے بلایا ہے۔ جب وہاں گئے تو گرفتار کر لیا گیا اور دو گھنٹے کے بعد میرے مکان پر ٹیلی فون سے اطلاع دی گئی کہ ان کے لیے کھانا بھیج دیا جائے۔ گرفتاری کی کوئی معین بنا ابھی ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پچھلے دنوں کلکتہ میں کوئی تقریر کی تھی اور اسی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ ۶ دسمبر کو مقدمہ پیش ہوگا۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کا وطن، ملیح آباد (لکھنؤ) ہے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم ندوہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد قاہرہ (مصر) چلے گئے اور مدرسہ دعوۃ وارشاد میں داخل ہو گئے، جسے شیخ

سید رشید رضا صاحب ایڈیٹر "المنار" نے جاری کیا تھا۔ تقریباً تین سال تک ۸ وہاں علوم ادبیہ اور تفسیر قرآن وغیرہ کی تحصیل کرتے رہے اور خود وہاں کے مصری طلبا پر اپنے ذوق علم اور طلب صادق سے بدرجہا فوقیت لے گئے۔ مصر سے قسطنطنیہ گئے اور وہاں بھی ایک مدت رہے۔ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان واپس آئے اور اس وقت سے اب تک برابر علمی وقومی خدمات میں مشغول رہے۔ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے جوشِ ایمان اور حُبِّ اسلامی کے اعتبار سے اخلاص وعمل کا ایک قابلِ عزت گھرانا ہے۔ ان کے والد اور تینوں بھائی ہمیشہ راہِ حق وعمل میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ ان کے بڑے بھائی، ملیح آباد میں اِس لیے گرفتار کر لیے گئے تھے کہ انہوں نے مقاصدِ خلافت کی تبلیغ کے لیے ایک اعلان شائع کیا تھا اور اصلی سبب یہ تھا کہ وہ کسان سبھا اور خلافت کمیٹی کے قیام کے لیے بے باکانہ کوششیں کرتے تھے۔ وہ عرصہ تک قید خانے کی سخت مشقتیں برداشت کرتے رہے اور حال میں رہا ہوئے ہیں۔

دو سال ہوئے جب یہ مجھ سے ملے اور میں نے ان میں بہترین قابلیتِ علم وعمل نمایاں پائی۔ یہ ملک کے ان مخصوص اہلِ علم نوجوانوں میں ہیں، جن کی غیر معمولی قابلیتوں سے بہترین امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے خدمتِ خلق ودعوت کی راہ میں مجھ سے جو رشتہ رفاقت و اخوت جوڑا تھا، وہ روز بروز قوی ہوتا گیا اور ایک سچے رفیق اور بھائی کی طرح اِن کی صداقت میرے دل کو جذب کرتی رہی۔ پچھلے دنوں جب مدرسہِ جامع مسجد عربی کا افتتاح ہوا، تو میں نے انہی ں کلکتہ بلا لیا اور انہی کی محنت وسعی سے مدرسہ قائم ہوا۔ یہ مشغولیت اِن کے لیے کم نہ تھی لیکن ان کا ولولہ خدمت زیادہ وسیع میدان ڈھونڈتا تھا۔ بالآخر پیغام جاری ہوا اور اس کی ترتیب و اشاعت کا تمام بار انہوں نے اپنے سر لے لیا۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس بار کے وہ اہل تھے اور نہایت مستعدی وقابلیت سے تن تنہا اس کی ایڈیٹری کرتے رہے۔ قارئین پیغام میں کوئی شخص نہ ہوگا، جو ان کی تحریروں کو دلچسپی وشوق کے ساتھ نہ پڑھتا ہوگا۔

اب وہ گرفتار ہو گئے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ نے ان کی حسن نیت اور حسن عمل کو قبول کر لیا۔ اس بارے میں انسانی قلب کی درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ میں اگر کہوں کہ میرے دل پر کوئی صدمہ نہیں، تو یقیناً میں اپنے قدرتی جذبات کے لیے پردہ پوش ہوں گا۔ میں اپنے دل کو راز بنانا پسند نہیں کرتا۔ میرے دل کو ایسے موقعوں پر غم ہوا ہے۔ میں نے برادر عزیز محمد علی وشوکت علی کی گرفتاری کی جب خبر سنی اور جب کراچی میں ان سے ملا، تو میں اپنے دل کو صدمے

سے نہ بچا سکا، اور نہ میری آنکھیں آنسوؤں کو روک سکیں۔ یقیناً اس وقت بھی میرا دل غم کرنا چاہتا ہے لیکن الحمدللہ کہ دل کے جذبے پر دماغ کا ایمانی یقین واعتقاد غالب ہے اور گو کشمکش ہوتی ہے لیکن بالآخر غلبہ اعتقاد ہی کو ملتا ہے۔ جذبات نابود نہیں ہوسکتے مگر مغلوب ہو جاسکتے ہیں۔ میں خوش ہوں اور سچے دل سے اپنے عزیز ورفیق کو مبارک باد دیتا ہوں۔ وہ بے گناہ ہیں اور ان کی گرفتاری، ان کے لیے ایک پاک عبادت ہے۔ انہوں نے جس سچی اور بے تکلف ہمت وبشاشت کے ساتھ اپنی گرفتاری کا استقبال کیا اور جس اطمینان واستقامت کے ساتھ اس وقت قید خانے میں ہیں، خدا تعالیٰ وہ جوہر ہر مسلمان کو عطا کرے!

البتہ میں اپنے دل کی اس خلش کو دور نہیں کر سکتا کہ رفیقان راہ ایک ایک کر کے قید ہو رہے ہیں اور میں اب تک چھوڑ دیا گیا ہوں:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاتِيَنِىْ بِهِمْ جَمِيْعًا ، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ! (یوسف ۱۲: ۸۳)

جیل میں

سیاسی قیدی، علی پور سنٹرل جیل میں رکھے گئے تھے۔ میرے اور پروفیسر جتندر لال کے سوا کسی اور کو دو برس کی سزا نہیں ملی تھی۔ اس امتیاز پر مجھے فخر ہونا چاہیے تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ شروع شروع اُداسی نے مجھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُداسی کی وجہ بدرالدین مرحوم سے محبت تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ مرحوم میری جدائی برداشت نہ کر سکیں گے۔

میں اُداس اور بجھا بجھا سا رہنے لگا حالانکہ مولانا بھی قید تھے اور آپس میں ملنے جلنے پر پابندی نہ تھی۔ جیل میں مولانا کی عظمت کا پورا پورا ثبوت مجھے مل گیا۔ مجھے اُداس دیکھتے تو اپنے لطیفوں سے، جن کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا تھا، خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ دنیا جہان کی باتیں شروع کر دیتے اور میں حیرت میں ڈوب ڈوب جاتا کہ اس شخص کی معلومات کتنی وسیع ہیں اور یہ شخص کیسی لطیف اور انوکھی ظرافت کا مالک ہے۔

جیل میں مولانا میرے ساتھ ''مولانا'' نہیں رہے تھے۔ محض ایک ساتھی بن گئے تھے۔ لوگوں کی کامیاب نقلیں اتارتے تھے۔ ہر وقت خود بھی ہنستے رہتے تھے اور مجھے بھی ہنساتے رہنا چاہتے تھے۔ میری اداسی دور نہ ہوتی تو شفقت سے فرماتے ''مولوی صاحب، آخر کیا بات ہے؟

پہلے کی طرح آپ کھکھلاتے کیوں نہیں آپ کی ہنسی ہمیں اچھی لگتی ہے۔ ہنستے کیوں نہیں؟'' میں کیا جواب دیتا؟ چپ ہو کر رہ جاتا تھا۔

جیل میں واقعی مولانا کی عظمت مجھ پر چھا گئی تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ مولانا چائے کے عاشق تھے اور مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب، آپ بھی چائے کا کچھ ذوق رکھتے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے کہ میں ایرانی، ترکی، بخاری، حجازی ہاتھوں سے لطیف سے لطیف چائے پی چکا ہوں۔ اتفاق سے مولانا کا اور میرا چائے کے معاملے میں ذوق یکساں رہا، اگرچہ میں بلانوش، دُردِتہِ جام کو بھی موقع پر گوارا کر لیتا ہوں!

جیل میں چائے کا ایک دور صبح چلتا اور ایک سہ پہر کو۔ رات کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کر دیئے جاتے تھے۔ بہت کوشش کی کہ چائے بنانے کا کام اپنے ذمے لے لوں، مگر مولانا راضی نہ ہوئے۔ عرض کیا، آپ فرماتے ہیں مجھے چائے بنانا نہیں آتی۔ اچھا نہ سہی۔ برتن تو دھونا پوچھنا آتے ہیں۔ فرماتے، یہ بھی نہیں آتا! خود ہی برتن دھوتے۔ خود ہی چائے بناتے اور مجھے پلاتے لاکھ لاکھ کہتا، مولانا آپ تو اِس طرح مجھے مار ڈالیں گے۔ ہنستے اور فرماتے، شاید کسی پٹھان کا مار ڈالنا، ثواب ہی ہو!

جیل میں چار باورچی خانے تھے اور ان کا انتظام، قیدیوں کے ہاتھ میں تھا۔ ایک باورچی خانہ بنگالی ہندوؤں کا تھا۔ ایک بنگالی مسلمانوں کا۔ ایک ہندوستانی مسلمانوں کا اور ایک مارواڑیوں کا۔ یہ گویا ''اپ کنٹری'' ہندوؤں کا باورچی خانہ تھا۔ ایسے ہندو بھی تھے جو چھوت چھات کے قائل تھے اور کسی باورچی خانے میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ اپنی رسَیں الگ رکھتے تھے اور اپنے ہاتھ سے پکا کر کھاتے تھے۔

مولانا کے سامنے یہ سوال پیش آیا کہ اپنا کھانا کس باورچی خانے سے متعلق کریں؟ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ بنگالی ہندوؤں اور مسلمانوں سے تو ہمارا ساتھ ہو نہیں سکتا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا باورچی خانہ بہت مَیلا رہتا تھا اور بنگالی صرف مچھلی پر دَم دیتے تھے۔ آخر طے پایا کہ مارواڑی باورچی خانہ ٹھیک رہے گا۔

مارواڑی باورچی خانے میں، ظاہر ہے، گوشت کا گزر کہاں، مگر صاف ستھرا باورچی خانہ تھا۔ دن میں پوریاں، حلوا، بھاجی دیتا تھا اور رات میں روٹی کے ساتھ بھاجی۔ کھانا اتنا بہت ہوتا کہ ہم کھاتے کھاتے تھک جاتے وہ باقی رہ جاتا تھا۔

گوشہ نشینی

مولانا کو میں نے کبھی کسی قسم کی ورزش کرتے نہیں دیکھا۔ چلنے پھرنے، چہل قدمی کرنے کی بھی عادت نہ تھی۔ بس بیٹھے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ٹانگیں کمزور پڑ گئیں۔ ذرا میں گر پڑتے تھے۔ عمر کے ساتھ کولہے بھاری پڑ گئے اور ٹانگوں کے لیے ان کا بوجھ زیادہ ہو گیا تھا۔

جیل میں مولانا کو ورزش سے مطلب نہ تھا۔ یا تو روزانہ غسل کے عادی تھے، مگر نہ جانے کیوں، جیل میں نہانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ شروع شروع یورپین بارک کی ایک سیل (کوٹھری) میں رکھے گئے تھے اور سیل کے آہنی سلاخوں والے دروازے پر انہوں نے موٹا کالا کمبل منڈھوا لیا تھا۔ اس طرح دروازہ بند ہوتا تو سیل، کال کوٹھری بن جاتی اور مولانا اپنے دن اور راتیں اسی تاریک کوٹھری میں بسر کرتے۔ جب میں آتا، تو دروازہ کھلا رہتا ورنہ ہر وقت بند۔

جیل میں آتے ہی مولانا اپنی بنائی ہوئی کال کوٹھری میں بیٹھ گئے۔ کسی وقت باہر دیکھے نہیں جاتے تھے۔ حوائج ضروریہ سے بھی اس ٹوکری میں فارغ ہوتے تھے، جو ہر سیل میں اِسی غرض سے رکھی جاتی تھی اور تمام ساتھی قیدی حیرت میں تھے کہ مولانا آخر کیا ہیں؟ بیت الخلا بھی نہیں جاتے! خود مولانا لوگوں کے یہ چرچے بیان کرتے اور ہنستے۔

لگاتار تین مہینے مولانا، اِسی کوٹھری میں بند رہے۔ غُسل خانے بھی نہیں گئے۔ گرمی سخت تھی اور بند کوٹھری میں ہوا کا گزر نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام جسم، گرمی دانوں سے پھل آیا اور تکلیف نا قابل برداشت ہو گئی میں برابر عرض کرتا کہ گوشہ نشینی ٹھیک نہیں۔ باہر نکلا کیجیے، مگر مولانا اُلٹے مجھے بنانے لگتے اور میں چُپ ہو ہو جاتا۔

مگر اب گرمی دانوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اسپرٹ کی مالش ہو جائے، تو دانے سوکھ جائیں گے، مگر مولانا راضی نہ ہوئے۔ کئی دن بحث و حجت میں نکل گئے۔ آخر ایک روز میں پیچھے پڑ گیا تو راضی ہو گئے، مگر سوال پیش آیا کہ مالش کون کرے؟ عرض کیا، خادم تو ہوں، میرے سوا یہ خدمت کون انجام دے سکتا ہے؟ بہت انکار کے بعد راضی ہو گئے۔

اب جو ٹانگیں کھلیں، تو خون کبوتر کی طرح لال۔ جسم بھر کی یہی حالت تھی۔ دانوں کی تہوں پر تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دل کو بڑا دُکھ ہوا کہ ایسی سخت تکلیف چپ چاپ جھیلتے رہے۔ بہرحال اسپرٹ کی مالش ہو گئی۔ گرمی دانے مُرجھا گئے اور مولانا نے روز کم سے کم دو دفعہ نہانا بھی شروع کر دیا۔

اب گوشہ نشینی ختم ہو گئی۔ کبھی کبھی سیل کے باہر برآمدے میں ٹہلنے بھی لگے۔ میری سیل کی طرف بھی آ جاتے، جوانہی کی سیل کی قطار میں تھی اور کچھ دور نہ تھی۔

حجامت

یہ مشکل بھی پیش آئی کہ مولانا کی حجامت بڑھ گئی، مگر جیل کے حجام سے کام لینا منظور نہ تھا۔ مولانا کی داڑھی تو بس کہنے ہی کو داڑھی تھی۔ البتہ سر کے بال بہت گھنے تھے اور بہت سخت۔ جیل کے باہر کلکتہ میں ایک نائی منتخب ہو چکا تھا۔ وہی آیا کرتا تھا۔ اور اس زمانے میں بھی جب حجام کی اُجرت، چار آنے تھی، مولانا اپنے نائی کو پانچ روپیہ سے کم نہیں دیتے تھے!

مجھے برابر تعجب ہوتا تھا کہ مولانا نے اِس نائی کو کیوں منتخب کیا ہے؟ بڑا موٹا، بڑا بھدا، بڑا باتونی، بڑا گھمنڈی تھا۔ دکان پر لمبا چوڑا بورڈ لگا رکھا تھا اور اپنے نام کے ساتھ بہت جلی حرفوں میں لکھا تھا ''پریسیڈنٹ اینڈ ماسٹر کلکتا باربرس!''

ایک دفعہ میں نے بھی امتحاناً حجامت بنوائی کہ کلکتہ کے نائیوں کا قائداعظم اور معلم اکبر ہے۔ نہ جانے کتنا بڑا استاد ہو گا۔ اِس شخص نے یہ کمال تو ضرور دکھایا کہ تین چار منٹ میں میرا پیچھا چھوڑ دیا اور یہ کہہ کر چلایا ''بن گئی حجامت!''

اب جو سر پر ہاتھ پھیرتا ہوں، تو واقعی ''حجامت'' بن چکی تھی۔ یہ تو مجھے اس کی قینچی کی کھچ کھچ اور ہاتھوں کی دھاچوکڑی سے ہی شبہ ہو چکا تھا۔ نائی نے کیا یہ کہ پہلے مشین سے کنارے کے بال مہین کر دیئے۔ پھر ٹھیک اسی طرح جس طرح دُنبے کے بال کاٹے جاتے ہیں، پوری بے پروائی اور بے رحمی سے بالوں میں زور زور سے انگلیاں ڈال کر باہر نکلے ہوئے بال اُڑا دئے۔ پھر دو منٹ کے اندر اوپر نیچے کے بالوں میں ہمواری پیدا کر دی۔ حجامت کے بعد میں نے آئینہ دیکھا عجیب طرح کا لنڈورا دکھائی دیا۔ عرض کیا، واہ خلیفہ جی، آپ کلکتہ کے باربروں کے صدر اور استاد ہی نہیں ہیں، کلکتہ بھر کی ناک بھی ہیں! بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا ''جبھی تو مولانا صاحب مجھی کو بلاتے ہیں۔ کسی اور کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے!'' میں نے ایک روپیہ نذر کیا اور توبہ کر لی کہ اس بھوت کو کبھی اپنے سے کھیلنے کا موقعہ نہ دوں گا۔

لیکن مولانا اسی بھوت کے قائل تھے۔ اِسی سے خط بنواتے تھے، مگر جیل میں تو اِس ''صدر الصدور اور استاد باربراں'' کا آنا ممکن نہ تھا۔ بال بہت بڑھ گئے تھے اور اس مشکل کا حل نکلنا

چاہیے تھا۔عرض کیا، اجازت ہو، تو میں ہی بال کاٹ دوں۔ ہنسے۔ خوب بنایا۔ کہنے لگے، آپ تو ہر فن مولا تھے، حجام بھی ہو گئے! میں نے کہا، آپ کا فرمانا اِس لحاظ سے بجا ہے کہ بہت سے کام جانتا ہوں۔ خود آپ دیکھ چکے ہیں کہ آپ ہی کے مکان پر بغیر فرمے کے جوتا بنا رہا تھا۔ آپ ہنستے تھے اور فرماتے تھے "مولوی صاحب، آپ کو وقت ضائع کرنے کا ہنر خوب آتا ہے" لیکن جب جوتا تیار ہو گیا تو آپ ہی نے تعریف کی تھی۔

پھر عرض کیا، موچی کا کام تو سیکھا نہیں تھا، مگر حجامی واقعی سیکھی ہے۔ فرمایا، کیسے؟ عرض کیا، ایک زمانے میں آپ پاسنگ شو سگریٹ پیا کرتے تھے۔ میں نے اس کے ڈبوں سے انعامی ٹکٹ جمع کئے اور ہیڈ آفس لندن بھیج دیئے کہ انعام میں بال کاٹنے کی مشین ضرور بھیجی جائے۔ اسی مشین کی برکت سے میں "باربر" بن گیا۔

مولانا نے فرمایا "محض مشین کسی کو کچھ نہیں بنا سکتی۔ آپ ڈینگ مار رہے ہیں۔ عرض کیا، بے شک مشین آدمی کو کچھ نہیں بنا سکتی، جب تک مشین سے کام نہ لیا جائے۔ یہ موٹی بات میں بھی جانتا تھا۔ بال کاٹنے کی مشین میرے قبضے میں آ چکی تھی اور میں واقعی اچھا باربر بننا چاہتا تھا لیکن ضرورت تھی کہ ایسے لوگ ملیں، جنھیں تختہ مشق بنا سکوں۔ آسان نسخہ سوجھا۔ آپ ہی کے پھاٹک پر کھڑا ہو جاتا اور دیکھا کرتا کہ ایسا غریب لڑکا کون گزر رہا ہے، جس کے بال بڑھے ہوں۔ ایسے لڑکوں کی کمی نہ تھی۔ روز دو چار مل جاتے اور میں توجہ اور محنت سے ان کے بال کاٹتا۔ اِس طرح جلد اِس فن میں کمال نہیں تو اچھا خاصہ درک حاصل ہو گیا اور اب آپ کے بال تراشوں گا تو ثبوت خود ہی مل جائے گا۔

بڑی حجتوں کے بعد راضی ہوئے۔ مجبور تو تھے ہی۔ میں نے قینچی چلانا شروع کی، تو دخل دینے لگے، مولوی صاحب، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اِس طرح نہیں، اس طرح! کبھی سر ہٹا لیا۔ کبھی ہاتھ پکڑ لیا! عرض کیا، یہ نہ کیجئے۔ کہیں دو ملاؤں میں مرغی حرام نہ ہو جائے۔ مجھے اپنا کام کرنے دیجئے۔ بال تو بہر حال کٹ ہی جائیں گے۔ بُرے کٹے تو بھی چند روز میں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کو کہیں جانا تو ہے نہیں۔ اسی کوٹھری میں بند رہنا ہے۔

پھر بھی مداخلت جاری رہی۔ عرض کیا، قینچی لگ گئی تو ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔ اب چین سے بیٹھئے۔ میں نے کام ختم کیا اور بال جھاڑ دیئے۔ تو بڑی ناقدانہ نگاہوں سے آئینہ دیکھا۔ پھر ہنسے اور کہنے لگے "واہ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ میں تو سمجھتا تھا، بھیٹر بنا ڈالیں گے مگر نہیں واقعی آپ خوب حجامت بناتے ہیں!"

بنانے کا سوال

دیر تک بناتے رہے۔ دھیمے پڑے تو عرض کیا، مولانا آپ آئینہ دیکھ رہے تھے، تو مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مصنوعی شوق سے فرمایا ''کون واقعہ'' میں نے کہا، ایک دن ''ہمدم'' (لکھنؤ) کے ایڈیٹر سید جالب مرحوم سے ملنے گیا۔ وہ چٹائی پر بیٹھے ایک گنوار نائی سے حجامت بنوا رہے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ لکھنؤ شہر، سید جالب اور میلا کچیلا چھوکرا نائی! آپ تو جانتے ہیں، سید صاحب کتنے بڑے باتونی تھے۔ باتوں میں ایسے غرق ہوئے کہ اپنی حجامت ہی سے غافل ہو گئے۔ نائی نے کام پورا کر لیا، تو جیسا کہ گنوار نائیوں کا دستور ہے، آئینہ صاحب کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ سید صاحب باتوں میں محو تھے۔ نگاہ آئینے پر پڑ گئی اور ساتھ ہی زور سے ایک ''چٹ'' کی آواز بھی سنائی دی۔ سید صاحب کا تھپڑ، نائی کے منہ پر تھا!

مولانا ہنسنے لگے۔ میں نے کہا اور سنیے بھی تو، تھپڑ کیوں مارا؟ کہنے لگے یہی تو میں بھی پوچھنے والا تھا۔ عرض کیا، سید صاحب سے میں نے کمال حیرت سے پوچھا، کیا ہوا میر صاحب؟ جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ انتہائی غیظ و غضب سے چیخ اٹھے ''آپ نے دیکھا نہیں کہ اس پاجی نے کیا ظلم کیا ہے۔ بیس سال ہو گئے کہ میں نے اپنی شکل نہیں دیکھی تھی۔ شکل قریب قریب بھول چکا تھا اور اطمینان سے کام کر رہا تھا، مگر اس کم بخت نے پھر میری شکل مجھے دکھا دی۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کب تک دل پر یہ نقشہ بیٹھا رہے گا اور کب اطمینان واپس آئے گا!''

مولانا نے یہ سنا، تو سناٹے میں آ گئے مگر جلد ہی سنبھل کر کسی قدر جھجک سے کہنے لگے، کیوں، جالب کو اپنی شکل سے یہ بیزاری کیوں تھی؟ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، یہی بات تو میں نے بھی میر صاحب سے پوچھی تھی۔ اِس پر وہ خود مجھ سے، قریب تھا کہ لڑ پڑیں۔ کہنے لگے ''نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھے بنانا چاہتے ہیں۔ ارے صاحب، یہ شکل جو میری ہے، دنیا میں کسی اور آدمی کی کبھی ہوئی تھی، یا ہوئی ہے، یا ہو گی۔ میں تو ماننے پر کسی حال میں آمادہ نہیں۔ نہ جانے کیوں خدا نے مجھے بغیر کسی خطا کے یہ سزا دے دی کہ میری صورت سے جن و انس و ملک سبھی پناہ مانگتے ہیں!''

مولانا نے بڑے غور سے مجھے دیکھا، کچھ دیر دیکھتے ہی رہے۔ پھر کہنے لگے ''اب میں سمجھا۔ یہ کہیے کہ آپ مجھے بناتے رہے ہیں! عرض کیا، معاذ اللہ! میری مجال کہ آپ کو بناؤں! فرمانے لگے، نہیں مولوی صاحب، میں خود زندہ دلی پسند کرتا ہوں۔ اب ہم مل کر دوسروں کو بنایا کریں

کے! میں نے لاکھ لاکھ کہا کہ وہ بات نہیں، جس کا آپ کو شبہ ہوا ہے، مگر ہنستے اور کہتے رہے، اب لوگوں کے بنانے میں مزہ آئے گا، اکیلا آدمی بنائے اور سمجھنے والا کوئی نہ ہو، تو اس کی مثال مور کی سی ہے، جو جنگل میں اکیلا ناچ رہا ہو!

اس دن سے لوگوں کو بنانا، میرا اور مولانا کا مشترک شغل بن گیا، مگر اس طرح کہ بننے والا سمجھنے نہ پائے۔ جب مولانا کسی کو بنانا چاہتے، تو مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے اور میں معاملہ سمجھ جاتا۔

میرے بھائی

بنانے کے سلسلے میں ایک بات، نہایت مضحکہ خیز ہے اور اِس مضحکے کا شکار بہت سے ''عقل مند'' بن چکے ہیں۔ مولانا جب کسی کو بنانا چاہتے تھے، یا اس سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے تو اکثر ''میرے بھائی'' کہہ کر باتیں کرتے تھے۔ یار لوگوں نے خود ہی طے کر لیا کہ مولانا کا ''میرے بھائی'' کہہ دینا ان کے لیے کوئی بڑا اعزاز ہے، حالانکہ خود مولانا نے مجھ سے کہا ''میرے بھائی'' کہہ کو لوگوں کو بناتا ہوں۔ کروں کیا۔ بھوت ٹلتے ہی نہیں۔ ''میرے بھائی'' کی رشوت پا کر خوش خوش چلے جاتے ہیں! لیکن بولتے بولتے یہ جملہ ان کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا اور آخر عمر تک زبان پر چڑھا رہا، مگر یاد نہیں پڑتا کہ مجھے بھی سنجیدگی میں ''میرے بھائی'' کبھی کہا ہو۔

جیل کے مذاق

مولانا آزاد سچ مچ از حد زندہ دل آدمی تھے۔ طبیعت میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، مگر زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور خشک سے خشک مباحث و معاملات کے لیے بھی ان کا ذہن ویسا ہی حاضر تھا، جیسا مزاح اور مذاق کے لیے۔ ایک ہی وقت میں مذاق بھی کر سکتے تھے اور سنجیدہ گفتگو بھی۔ بلکہ ان کی سنجیدہ گفتگو میں بھی ظرافت کی لطیف چاشنی رہا کرتی تھی۔ میں بھی ہنسنے بولنے والا آدمی تھا۔ کبھی کبھی پھکڑ بھی بن جاتا تھا، اس لیے ناممکن تھا کہ جیل میں جہاں بھانت بھانت کی مخلوق بھری تھی اور بدھوؤں، جانگلوؤں، گھامڑوں کی کمی نہ تھی، سنجیدہ اور خاموش رہا جا سکتا۔ روز کوئی نہ کوئی مذاق کیا جاتا۔ اسکیم، مولانا ہی کی ''رہنمائی'' میں بنتی۔ چند واقعات لکھتا ہوں:

بابا گردت سنگھ

اِن دنوں ''گوما گاٹا مارو[9]'' کے ہیرو، بابا گردت سنگھ کا بہت چرچا تھا، طے پایا کہ پنڈت شیام سُندر چکرورتی کو بابا گرُدَت سنگھ بنا کے جیل بھر پر ہنسا جائے۔ شیام بابو کی تعلیم تو میٹرک ہی تک تھی، مگر انگریزی کے ایسے ماہر تھے کہ بنگال بھر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ بعض چوٹی کے انگریزی اخباروں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، مگر بھولے ایسے تھے، جیسے معصوم بچہ۔ داڑھی مونچھ بھی تھی، سر پر لمبے بال بھی اور آسانی سے گردت سنگھ بن سکتے تھے۔

بابو مجھے بہت چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا، جیل میں کچھ ہنسی دل لگی بھی تو رہنا چاہیے۔ کہنے لگے ضرور، مگر ہم تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا، بوڑھے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ پھر میں تو ساتھ ہوں، کیوں نہ جیل بھر میں یہ کہہ کر ہلچل ڈال دی جائے کہ بابا گرُدَت سنگھ بھی آ گئے ہیں؟ کہنے لگے بہت اچھا خیال ہے۔ میں نے کہا، تو آپ ہی گرُدت سنگھ بن جایئے۔ راضی ہو گئے!

بابو کی داڑھی میں کنگھی کی۔ اسے چڑھایا اور ایک تاگا بیچ میں رکھ کر اسی وضع سے باندھ دی، جیسی سکھوں کی دیکھی تھی، حالانکہ بابا گرُدت سنگھ سے جب ملاقات ہوئی، تو ان کی داڑھی سیدھی تھی۔ پھر بابو کے بال چڑھا کے اوپر کر دیئے اور سر پر سکھوں جیسی بڑی پگڑی اِس طرح باندھ دی کہ کچھ کچھ بال دِکھتے رہے۔ پھر بابو کو ایک لمبی چوڑی بھاری چادر اُڑھا کر برآمدے میں بٹھا دیا۔ تاکید کر دی کہ آنکھیں بالکل بند رکھئے اور گوتم بدھ بُت کی طرح کمر سیدھی کیے بے حس و حرکت چُپ چاپ بیٹھے رہیے!

بابو نے ہر ''حکم'' کی حرف بحرف تعمیل کی اور ذرا دیر میں مشہور ہو گیا کہ بابا گرُدت سنگھ، جیل میں آ گئے ہیں۔ ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے۔ میں بابو کے پاس ہی کھڑا تھا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہہ رہا تھا کہ باباجی بہت تھکے ہوئے ہیں۔ صرف درشن کیجئے اور چلے جایئے۔ جیل میں کوئی ایسا نہ تھا ،جس نے بابا کو دیکھا ہو اور بابو کا روپ ایسا بدل گیا تھا کہ اس جلدی اور جوش میں انھیں کوئی پہچان نہ سکا۔ مسٹر سی۔ آر داس جیسے چوٹی کے لیڈروں کے سوا کوئی نہ تھا، جو بابا کے درشن کو نہ آیا ہو، حتیٰ کہ سبھاش چندر بوس (نیتا جی) بھی دوڑے آئے اور بڑی عقیدت سے ہاتھ جوڑ کر آداب بجالائے!

دیر تک تفریح جاری رہی، مگر بابو بیچارہ بوڑھا اور کمزور تھا۔ آخر تھک کر چور ہو گیا اور پگڑی اُتار پھینکی۔ اب جیل میں قہقہوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ بابو کے معتقدوں کو یہ سوانگ ناگوار

گزرا اور انھوں نے بابو سے کہا کہ آپ کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ بابو سیدھا آدمی تھا اور اس کی قربانیاں ایسی تھیں کہ اپنے آپ کو بنگال کا اصلی لیڈر سمجھتا تھا، مگر لیڈر مانا نہیں گیا، اس لیے دل میں غیظ و غضب کا ایک طوفان چھپائے ہوئے تھا، یہی وجہ تھی کہ جب اسے بتایا گیا کہ تماشہ بن گیا ہے، تو بہت برہم ہوا۔ منانے پر بھی نہ مانا اور جا کر مولانا سے شکایت کی، مگر مولانا نے چٹکیوں میں اسے خوش کر دیا۔

جیل میں لاش!

اخبار ''عصر جدید'' کلکتہ کے سابق مالک اور ایڈیٹر، مولوی شائق احمد عثمانی بھی جیل میں تھے۔ طے پایا کہ انھیں بے وقوف بنایا جائے، مگر یہ حضرت خود بھی بڑے تیز، طرار، ہنسوڑ، کائیاں تھے۔ پھر بھی مہم جاری رکھی گئی۔ آخر راضی ہو گئے کہ جیل والوں کو ڈرانے کے لیے ''مر جائیں'' اور ان کی ''لاش'' کمبلوں میں کفنا کے اٹھائی اور پھرائی جائے!

موصوف کو دو کمبلوں میں اس طرح لپیٹ دیا گیا کہ سانس لینے کے لیے ہوا اندر جاتی رہے۔

اب ''میت'' پر بین شروع ہوئے۔ ہمارے ساتھ دو آدمی بڑے پھکڑ تھے: حکیم سعید الرحمان دہلوی اور مولانا محمد یعقوب دیوبندی[1]۔ حکیم صاحب کے سر پر لمبے لمبے پٹے تھے۔ یہ مرنے والے کی ماں بنے۔ بنگالی ساتھیوں سے مانگ کر ساری باندھ لی۔ دوپٹہ اوڑھ لیا۔ پٹے گرا کر ماتھے پر پھیلا لیے اور اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا اور بین کرنا شروع کیا، جیسے سچ مچ کسی بڑھیا کا اکلوتا مر گیا ہو۔ مولانا یعقوب باپ بنے بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ آہیں بھرتے تھے۔ کبھی غم نصیب بیوی کو تسلی دیتے تھے اور کبھی خود پچھاڑیں کھانے لگتے تھے!

آخر جنازہ اٹھا اور سنگری گیشن کی عمارت ''اللہ اکبر'' کی تکبیروں سے گونج اٹھی۔ شیام بابو سو رہے تھے۔ غل سن کر اُٹھ بیٹھے، مگر جنازہ دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ اندیشہ ہوا کہیں بوڑھے بابو کا دل بیٹھ نہ جائے۔ جنازہ رکھ دیا گیا اور ہم بابو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب شائق صاحب نے کمبلوں میں بری طرح کلبلانا شروع کیا۔ گھٹی ہوئی چیخیں مارنے لگے کہ کھولو مگر میں نے کسی کو ''لاش'' کے پاس جانے نہ دیا۔ جب خوب ہلکان ہوئے تو کھولے گئے۔ اب ادھر یہ خفا کہ مجھے بے دم کر ڈالا، اُدھر بابو کو شکایت کہ یہ سوانگ اسی کو پریشان کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا!

مصری قرأت

مرحوم مولوی عثمان صاحب میرے پرانے ساتھی تھے۔ مصر میں بھی ساتھ رہا۔ وہاں مدرسے میں قرأت سیکھنا لازمی سبق تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر نہ سیکھی کہ گلے بازی سے شرم آتی تھی اور مولوی صاحب، کوشش کرنے پر بھی سیکھ نہ سکے مگر جیل میں آئے تو اپنی فضیلت جمانا چاہی اور تو کوئی ملا نہیں، ایک بنگالی مسلمان پھنس گیا کہ مصری قرأت سیکھے گا۔

میری سیل کے سامنے سگری گیشن تھا۔ یہاں مولوی صاحب بھی بند ہوتے تھے اور وہ بنگالی بھی۔ مولوی صاحب نے قرأت کی تعلیم اس طرح شروع کی کہ کئی دن خود عجیب عجیب آوازیں، حلق سے نکالتے رہے اور جب بنگالی کو ویسی آوازیں نکالنا آ گیا، تو مولوی صاحب کے منہ سے ایک نیا سر نکلنا شروع ہو گیا۔ تجوید تو کیا خاک آتی مگر وہ بنگالی گھنٹوں بھیانک آواز سے چنگھارتا رہتا اور میں سخت پریشان ہوتا۔ آخر مولانا سے فریاد کی اور ان کے ہاتھ ایک نئی تفریح کا سامان لگ گیا۔ فرمایا۔ مولوی عثمان کو لے آؤ مگر کچھ بتانا نہیں۔

میں نے خبر کی، تو بہت بدکے۔ کہنے لگے، کیوں؟ آخر کس لیے بلاتے ہیں؟ میں نے کہا، معلوم نہیں۔ بہت دن ملے ہو گئے ہیں شاید ملنا چاہتے ہوں۔ مولوی صاحب پہنچے، تو مولانا نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چائے بنائی اور بڑے اہتمام سے ایک پیالی ان کی طرف بڑھائی۔ مولوی صاحب یہ سب تعجب مگر کھلی خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ گمان تک نہ تھا کہ یہ خاطر کیوں ہے؟ اب مولانا نے دنیا جہان کے قصے چھیڑے۔ آخر مصر پر اور مصری تجوید پر پہنچے، نہایت مفید تقریر کی۔ قلم بند کر لی جاتی، تو فن تجوید پر عجیب چیز ہوتی۔

ان مرحلوں سے گزر کر مولانا نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ حضرت اتنے برس مصر میں رہے اور فن تجوید جیسے فن شریف سے کورے ہی رہے۔ اب تو مولوی صاحب خوشی سے پھولنے لگے۔ آخر مولانا نے کہا یہ سن کر میرے بھائی، خوشی ہوئی کہ آپ اِس فن لطیف کو جیل میں بھی پھیلا رہے ہیں۔ یہ قرآن کی بڑی خدمت ہے اور آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ حسبۃً للہ خدمت انجام دے رہے ہیں! اب تو مولوی صاحب پھول کے کپا ہو گئے مگر معاملے کی اصلیت سے بے خبر تھے۔

مولانا ذرا دیر چپ رہے۔ پھر کہنے لگے، مدت سے کان اچھی ترتیل کو ترس رہے ہیں۔ مولوی صاحب، مصری تجوید کے مطابق کوئی رکوع تو سنایئے! اب مولوی صاحب کو کاٹو تو لہو نہیں۔

دیر تک دم بخود رہے، پھر میری طرف اشارہ کر کے مریل آواز میں کہنے لگے "یہ صاحب ہر وقت مذاق کرتے رہتے ہیں۔ انہی نے آپ سے کہا ہو گا کہ میں قاری ہوں، حالانکہ قاری نہیں ہوں!"

مولانا نے بہت سنجیدہ ہو کر فرمایا، میں سمجھ گیا میرے بھائی۔ آپ تکلف کر رہے ہیں۔ اہل کمال تکلف کیا ہی کرتے ہیں، مگر رکوع شروع کیجئے! مولوی صاحب نے اگاڑی پچھاڑی بہت تڑائی، مگر گرفت سے نکلنا ممکن نہ تھا۔ مجبوراً سورہ بقرہ کا پہلا رکوع شروع کیا مگر اس بچے کی طرح، جس کی سبق سنانے سے پہلے اچھے طرح کندی کر دی گئی ہو۔ تجوید کی الف بے بھی نہ جانتے تھے، اس لیے قواعد تجوید کے مطابق پڑھنے کا سوال ہی نہ تھا مگر جس آفت میں پڑ گئے تھے، اس نے عقل بھی چر لی۔ ایک دو آیت پڑھتے اور بھول بھول جاتے!

بڑی مشکل سے رکوع پورا کیا۔ پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ مولانا نے جو تعریف کی، بہترین طنز کا نمونہ تھی۔ گڑ گڑ گئے۔ واپسی پر کئی دن مجھ سے لڑتے رہے مگر قرات کی تعلیم ختم ہو گئی اور بنگالی کی بھیں بھیں سے سب کو نجات مل گئی۔

انگریزی سیکھنا

مولانا کی ذہانت کے بارے میں کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ انگریزی پڑھی نہیں تھی، پھر بھی انگریزی اخبار سمجھ لیتے تھے۔ یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے لیکن جب میں مولانا کی رفاقت میں آیا، تو انگریزی سے قطعاً نابلد تھا جیل کے باہر تو کام چلتا رہا۔ کسی نہ کسی سے ترجمہ سن لیتا تھا مگر جیل میں یہ سہولت میسر نہ رہی۔

بڑی پریشانی تھی۔ آخر طے کیا کہ انگریزی سیکھ لینا چاہیے مگر کیونکر؟ رٹنا اور حفظ کرنا میرے لیے ناممکن تھا اور زبان کو جانے بغیر گرائمر سے سر پھوڑنا بھی مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ سوچا کہ مجھے سب سے پہلے انگریزی زبان کے اسٹائل سے مناسبت پیدا کرنا چاہیے۔ اس مقصد سے انگریزی اور اردو میں بائبل کے ترجمے مہیا کیے۔ انگریزی کی ہر آیت کے الفاظ کا ترجمہ پہلے ڈکشنری میں دیکھتا اور جب لفظ حل ہو جاتے تو اردو بائبل میں وہی آیت پڑھتا اور اسٹائل پر غور کرتا۔ چند روز میں محسوس ہوا کہ خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے۔ بائبل کا اس طرح مطالعہ تو جاری رکھا۔ ساتھ ہی انگریزی میں مختصر افسانے منگا لئے اور ڈکشنری کی مدد سے ان کا ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ رمضان کا زمانہ تھا۔ سب قیدیوں کی طرح میں بھی سیل میں مغرب سے بند کر دیا جاتا تھا۔ نیند اُڑ گئی تھی اور

میں رات بھر انگریزی سے چمٹا رہتا تھا۔ ایک مہینے کے بعد "اسٹیٹس مین" دیکھا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ خبریں سمجھ میں آنے لگی تھیں!

یہ واقعہ مولانا کو معلوم ہوا تو خوش ہوئے، مگر فرمایا، تمہارا طریقہ غلط ہے یہاں جیل میں فرصت ہی فرصت ہے۔ دیکھئے اب میں باقاعدہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرتا ہوں!! اس غرض کے لیے انہوں نے چودھری نذیر احمد کو منتخب کیا۔ یہ صاحب گریجویٹ تو تھے مگر چاٹگام کے باشندے اور نرے احمق۔ اب پہلا سبق شروع ہوتا ہے۔ نذیر احمد نے کہا "اگر ہمیں انگریزی میں کہنا ہے کہ حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے زید کو پیٹا ہے، تو یوں کہیں گے اور اگر ہمیں کہنا ہے کہ زید نے حضرت مولانا آزاد کو پیٹا ہے، تو......" مولانا نے ہاتھ ہلا کر بڑی درشتی سے چودھری صاحب کو روک دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ انگریزی میں مولانا کا یہ پہلا اور آخری "باقاعدہ" سبق تھا۔

علامہ شبلی نعمانی

جیل میں ایک دن مولانا نے مرحوم علامہ شبلی نعمانی کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے، مولانا شبلی نہایت زندہ دل صاحب ذوق آدمی تھے۔ حسن پرست بھی تھے اور موسیقی وغیرہ فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، مگر مولوی تھے۔ عام رائے سے ڈرتے تھے اور بڑی احتیاط سے اپنا ذوق پورا کرتے تھے۔

ایک دفعہ موصوف دہلی میں حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے کہ خواجہ حسن نظامی ملنے آئے اور کہنے لگے، آج میرے ہاں قوالی ہے۔ دہلی کی مشہور طوائف...... (میں نام بھول گیا ہوں) گائے گی۔ محفل بالکل خاص ہے۔ میرے اور آپ کے سوا وہاں کوئی نہ ہوگا۔

مولانا شبلی نے دعوت قبول کر لی۔ کشمیری شال اوڑھی۔ وضع بدلی، بند گاڑی میں بیٹھے اور خواجہ صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ واقعی کوئی تیسرا آدمی مدعو نہ تھا۔ قوالی شروع ہوئی اور مولانا نے اپنے آپ کو نکتہ چینوں سے محفوظ پا کر ضرورت سے زیادہ آزادی سے کام لیا۔ دل کھول کے گانے کی اور گانے والی کی تعریف کی۔ طوائف سے ہنستے بھی رہے اور اسے چھیڑتے بھی رہے!

طوائف کا طبلچی، ایک لحیم شحیم سن رسیدہ آدمی تھا۔ سر پر پٹے تھے اور منہ پر چوکور بڑی سی داڑھی، پٹے اور داڑھی خضاب سے بھونرا ہو رہے تھے۔ محفل جب برخاست ہونے لگی تو طبلچی دونوں ہاتھ بڑھائے مولانا کی طرف لپکا اور بڑے جوش سے مولانا کے ہاتھ پکڑ لیے۔ چومے

آنکھوں سے لگائے اور جوش سے کہنے لگا "کس منہ سے خدا کا شکر ادا کروں کہ عمر بھر کی آرزو آج پوری ہوئی! مولانا، سبحان اللہ ماشاء اللہ، آپ نے "الفاروق" لکھ کر وہ کام کیا ہے، جو نہ کسی سے ہوا نہ ہو سکے گا۔ بخدا آپ نے قلم توڑ دیا ہے! بندے کی کتنی تمنا تھی کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہو، سو آج بائی جی اور خواجہ صاحب کی بدولت یہ سعادت اس گنہگار کو نصیب ہو گئی!"

مولانا آزاد نے فرمایا، علامہ شبلی بڑے ذکی الحس تھے۔ اس غیر متوقع واقعہ نے ان کی ساری خوشی کرکری کر دی۔ شرم سے عرق عرق ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ طبلچی کو کیا جواب دیں؟ کس طرح محفل سے غائب ہو جائیں؟ بے جان بت کی طرح بیٹھے رہ گئے۔ خواجہ صاحب نے موقع کی نزاکت محسوس کی اور طائفے کو فوراً رخصت کر دیا مگر علامہ کو سخت ذہنی صدمہ پہنچ چکا تھا۔ ہفتوں شگفتہ نہ ہو سکے۔

مولانا نے فرمایا، یہ واقعہ خود علامہ شبلی نے ان سے بیان کیا تھا۔ بیان کرتے وقت بھی متاثر تھے اور بار بار کہتے تھے، کاش "الفاروق" میرے قلم سے نہ نکلی ہوتی اور نکلی تھی تو اسے پڑھنے والا طبلچی اس قوالی سے پہلے ہی ناپید ہو چکا ہوتا، یہ نہیں تو مجھے موت آ گئی ہوتی کہ اِس ذلت سے بچ جاتا!

خفگی

جیل میں ایک دفعہ مولانا مجھ پر جھنجلائے اور ایک دفعہ خفا بھی ہو گئے تھے۔ جھنجلائے اس لیے کہ ایک دن میں نے عرض کیا، سر دھوتا ہوں تو مٹھی مٹھی بھر بال اُتر آتے ہیں۔ کوئی نسخہ معلوم ہو تو بتائیے۔ یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ خود مولانا بیان کر چکے تھے کہ انہوں نے طب بھی پڑھی ہے، مگر مولانا کو میرا سوال برا معلوم ہوا۔ چمک کر تلخی سے کہنے لگے "پھر سر نہ دھویا کیجئے!" میرا سوال واقعی احمقانہ تھا بھی۔

خفا اس لیے ہوئے کہ ایک بنگالی نوجوان ان کے پاس آیا۔ یہ شخص جیل بھر میں مقبول تھا، کیونکہ بہت اچھا گاتا تھا اور بڑا تیز طرار تھا۔ مولانا، چائے بنا چکے تھے۔ پیالی میری طرف بڑھائی، مگر میں نے وہ پیالی بنگالی کے سامنے رکھ دی۔ رکھتے ہی احساس ہوا کہ میری حرکت، آدابِ مجلس کے خلاف ہے۔ نگاہ اُٹھائی، تو مولانا کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ اب میں نہایت نادم تھا۔ مولانا نے ایک اور پیالی میری طرف بڑھا دی اور خود چائے نہیں پی۔ عجیب قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میری حالت یہ تھی کہ نہ بیٹھا رہ سکتا تھا نہ بھاگ ہی سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے اٹھا اور اپنی سیل میں چلا آیا۔

اسی وقت مولانا کی خدمت میں رقعہ بھیجا کہ اس یقین کے باوجود، اپنی غلطی پر سخت متاسف ہوں کہ آپ اس بنگالی کو بھی چائے ضرور دیتے۔ بڑی لجاجت سے معذرت پیش کی۔ دوسرے دن صبح حاضر ہوا، تو اس ناگوار واقعہ کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور ہمیشہ کی طرح دل کھول کر ہنستے بولتے رہے۔

جیل میں کانفرنس

جیل میں ہم سب کو آئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ میرے اور پروفیسر جتندر لال بنرجی کے سوا کسی قابل ذکر آدمی کو سزا نہیں ہوئی تھی کہ مہاتما گاندھی کا تار دیش بندھو سی۔ آر۔ داس اور مولانا آزاد کے نام آیا کہ اگر پرنس ویلز کے خلاف مظاہرہ نہ کیا جائے تو گورنمنٹ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دے اور قومی مطالبات پر بات چیت کرے گی۔

اس پر سر برآوردہ لوگوں کی کانفرنس، وہیں جیل میں بلائی گئی۔ مولانا کی اور میری رائے تھی کہ حکومت کی پیش کش قبول کر لی جائے، مگر اس شرط سے کہ پرنس کے بائیکاٹ کا اعلان واپس نہیں لیا جائے گا، البتہ عمداً مظاہرہ بھی نہیں کیا جائے گا۔ یہ رائے اس خیال پر مبنی تھی کہ ملک نے پہلی مرتبہ حکومت سے کھلم کھلا ٹکر لی ہے اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے مناسب ہے کہ پہلی آزمائش کی مدت کم سے کم رہے۔ اندیشہ تھا کہ حکومت کی دار و گیر سے ملک کا جوش ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ پھر یہ بھی یقین تھا کہ پرنس کے بائیکاٹ کا پروپیگنڈا اِس قدر ہو چکا ہے کہ پبلک کسی حال میں پرنس کا استقبال نہیں کرے گی۔

بحث کے بعد مسٹر سی۔ آر۔ داس بھی اس رائے سے متفق ہو گئے، مگر سبھاش چندر بوس وغیرہ جوشیلے نوجوانوں نے مخالفت کی اور زور دیا کہ حکومت، علی برادران اور ان کے ساتھیوں کی رہائی بھی منظور کرے، جنھیں کراچی کے مقدمہ میں سزائیں ہو چکی ہیں۔

یہ بات بھی معقول تھی اور تار دیتے وقت شاید مہاتما کے ذہن میں نہ تھی، لہٰذا کانفرنس میں طے پایا کہ پہلے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھی جائے۔ تار دیا گیا اور جواب یہ ملا کہ حکومت ان لوگوں کو فی الحال نہیں چھوڑے گی۔ جن کے مقدموں کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

اس جواب پر کانفرنس پھر بیٹھی اور طے پا گیا کہ حکومت سے سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ یاد نہیں، مولانا کا کیا خیال تھا مگر خود میں سمجھوتے ہی کے حق میں تھا۔ اگرچہ علی برادران کی طرح مجھے بھی سزا

بھگتنا تھی۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ ہماری کانفرنس کا فیصلہ غلط تھا۔ قومی تحریک دب ہی نہیں گئی بلکہ فرقہ وارانہ تعصبات کے سیلاب میں غرق ہو گئی۔

حلوائی کی دکان!

ساری عمر اس آفت میں گزری ہے کہ لوگ مجھ سے روپیہ مانگتے ہیں۔ کوئی قرض چاہتا ہے، مگر کبھی ادا نہیں کرتا اور کوئی مدد کا طلبگار ہوتا ہے۔ جیل میں بھی نجات نہ ملی۔ مانگنے والے غیب سے نکل ہی پڑے۔ سخت پریشان ہوتا اور مجبوراً مولانا کو تکلیف دینا پڑتی۔ وہ خندہ پیشانی سے مطالبے پورے کرتے مگر ایک دفعہ پوچھ ہی بیٹھے، یہاں جیل میں روپیہ کی کیا ضرورت پڑتی ہے؟ جواب کیا دیتا؟ لاجواب رہ گیا۔ بے شک جیل میں ضرورتمندوں کے کام آتا رہا، مگر مولانا کی جیب سے......

''حلوائی کی دُکان اور نانا جی کا فاتحہ'' اسی کو کہتے ہیں!

جیل کے حاکم کی سختی

سپرنٹنڈنٹ، جیل کا مطلق العنان بادشاہ ہوتا ہے۔ ہمارے جیل میں جب سیاسی قیدیوں کی بھیڑ چھٹ گئی، تو ایک مغرور بدتمیز انگریز سپرنٹنڈنٹ آیا اور آتے ہی حکم دے دیا کہ یورپین بارک خالی کر دی جائے اس بارک میں مولانا، میں اور دس بارہ دوسرے قیدی رہتے تھے۔

مولانا کے لیے اور لیڈر قسم کے قیدیوں کے لیے ادھر اُدھر کوٹھریاں خالی کر دی گئیں لیکن میرے جیسے لوگوں کو سگری گیشن میں چلے جانے کا حکم ملا۔ میں نے نرمی اور ادب سے عذر کیا کہ لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں۔ تنہائی پسند ہوں۔ اختلاج کا دورہ بھی پڑ جاتا ہے۔ لوگوں کے ہجوم میں رہنا مشکل ہے۔ کوئی کوٹھری مجھے بھی دے دی جائے، تو فوراً اٹھ جاؤں گا مگر اس فرعون نے ایک نہ سنی اور سختی سے کہا، حکم کی تعمیل کرو!

واقعہ کی اطلاع مولانا کو دی اور کہا، تعمیل حکم مجھ سے ممکن نہیں مقابلہ کروں گا۔ مولانا نے حوصلہ افزائی کی۔ کہنے لگے، جیل کی ڈسپلن کا برقرار رکھنا تو ہمارا اصول ہے، مگر ظالمانہ حکم مان لینا بھی ہماری روح کے لیے پیامِ موت ہے!

سپرنٹنڈنٹ کہہ گیا تھا کہ شام تک سگری گیشن چلے جانا مگر میں نہیں گیا۔جیلر کی رپورٹ سے میری عدول حکمی اسے رات ہی کو معلوم ہوگئی ہوگی۔صبح راؤنڈ میں آیا،تو خلاف معمول دس بارہ گورکھے سپاہی ساتھ تھے۔بندوقوں سے مسلح تھے اور سنگینیں چڑھی تھیں۔

پوری بارک میں اکیلا میں ہی رہ گیا تھا۔سپرنٹنڈنٹ میری سیل کے سامنے آکر رکا۔غصے سے بھوت ہورہا تھا۔بے تحاشا چلانے لگا۔میں نے ٹھنڈے دل سے مگر کڑی آواز سے کہا،دھمکانا فضول ہے۔سیل کا بندوبست ہو جائے،تو ابھی چلا جاؤں گا،ورنہ یہیں رہوں گا!

یہ سن کر وہ اور خفا ہوا۔میں اردو بول رہا تھا۔سمجھا،معمولی آدمی ہے۔کہنے لگا،گورکھے ابھی دماغ ٹھیک کردیں گے!میں نے جواب دیا،مجھے کوئی چھو بھی نہیں سکتا!

دیر تک گڑبڑ رہی اور سپرنٹنڈنٹ یہ کہتا ہوا چلا گیا ''ابھی تیس منٹ میں دیکھ لوگے کیا ہوتا ہے!'' مگر تیس منٹ گزرنے سے پہلے ہی جیلر نے...... جو شریف آدمی تھا کیونکہ انگریز نہیں،آئرش تھا......خبر دی کہ سیل کا بندوبست ہو گیا ہے،چلو۔

سپرنٹنڈنٹ کی اس کارروائی پر تعجب ہوا۔سخت دھمکی دے گیا تھا،مگر اب میرے مطالبے کے سامنے جھکا ہوا تھا۔قریب تھا کہ اس انگریز کو شریف سمجھنے لگوں۔اتنے میں یہ خود آ گیا اور بڑی تلخی سے کہنے لگا،جیل میں میری زبان قانون ہے!میں نے کہا لیکن مولانا آزاد کی سیل میں جاتا رہوں گا!کہنے لگا،تو سزا پاؤ گے اور تمہیں یہ پان کھانے اور سگریٹ پینے کی بھی اجازت نہیں۔میں نے کہا، پان بھی کھاتا رہوں گا اور سگریٹ بھی پیتا رہوں گا۔جو کر سکتے ہو،کر گزرو مگر میں گورنمنٹ کو تمہارے برتاؤ کی رپوٹ بھیجوں گا۔کہنے لگا،جیل سے ہر رپورٹ میرے ہی ذریعہ سے جاسکتی ہے۔میں نے کہا،تمہارے علاوہ اور ذریعے بھی میرے ہاتھ میں ہیں۔پھر لیجسلیٹو اسمبلی میں بھی تمہارے اس وحشیانہ سلوک پر بحث ہوگی!شاید یہ دھمکی اس وحشی انگریز پر کام کر گئی۔تنا تنا تو رہا مگر پھر کبھی مخاطب نہ ہوا۔اس پوری لڑائی میں مولانا میری ہمت بڑھاتے رہے۔

دینی مسلک

مولانا مذہباً سلف صالحین کے مسلک پر استوار تھے اور عقائد میں مسلک سلف سے تجاوز گوارا نہ تھا لیکن عمل میں بڑے روادار تھے۔

ہندوستان میں مسلک سلف کے ماننے والے اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہتے ہیں اور عرب ملکوں میں ان کا نام "سَلَفِی" ہے لیکن ان لوگوں پر عموماً خشونت، یبوست، تنگ نظری، ظاہر پرستی چھائی ہوئی ہے۔ ظواہر میں پھنس کر دین کے جوہر کو کھو بیٹھے ہیں۔

مولانا محمد علی کی فنی دولت

ایک عبرت انگیز واقعہ سنیے۔ مولانا محمد سورتی مرحوم کھرے اہل حدیث تھے۔ مرحوم مولانا محمد علی کو ہندوستان ابھی بھولا نہیں ہے۔ آکسفورڈ کا یہ گریجویٹ، یورپین فیشن کا یہ پیکر، آخر میں بڑا دیندار بن گیا تھا۔ داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ جبہ پہنتا تھا مگر فنون لطیفہ سے کیونکر بے گانہ ہو جاتا؟ ایک دن مولانا سورتی، مولانا محمد علی کے کمرے میں جاتے ہیں۔ دیواروں پر مشہور مصوروں کے شاہکار دیکھتے ہیں اور آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ۔ لٹھ اٹھا لیتے ہیں اور آرٹ کے بہترین نمونوں کو برباد کر ڈالتے ہیں!

مولانا سورتی نے جو کچھ کیا، ایمانی جذبہ و جوش سے کیا ہوگا، مگر یہ ظاہر پرستی اور تنگ دلی تھی۔ وہ بھول گئے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے جب مدائن فتح کیا اور کسریٰ کے محل میں داخل ہوئے تو محل تصویروں اور اسٹیچوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ حضرت سعد نے یہ نہیں کیا کہ محل کو ان چیزوں سے خالی کرا دیا ہو بلکہ تصویروں اور اسٹیچوؤں کے جھرمٹ میں رب العٰلمین کے حضور جھک گئے اور سجدۂ شکر بجالائے۔

اور مولانا سورتی کو، یہ فنی دولت تباہ کرتے وقت نہ حضرت سلیمانؑ یاد آئے نہ حضرت سلیمان کے آرٹ کے مجسمے اور اسٹیچو قرآن میں خدا کی وہ نعمتیں مذکور ہوئی ہیں جو حضرت سلیمانؑ پر ارزاں کی گئی تھیں:

> يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ، اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ، وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ. (سلیمان ۳۴:۱۳)
>
> وہ سلیمانؑ کے لیے وہ سب چیزیں بناتے، جو وہ چاہتے، بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن ایسے بڑے، جیسے حوض اور بڑی بڑی دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔ اے خاندان داؤد تم سب شکریہ میں نیک کام کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

اہل حدیث کی خفگی

ایک دفعہ مولانا کے ساتھ امرتسر جانا ہوا۔ مشہور غزنوی خاندان میں قیام تھا۔ جمعہ آیا اور ہم مسجد اہل حدیث میں نماز پڑھنے گئے۔ مولانا نے امامت کی۔ میں بھی ایک صف میں کھڑا ہو گیا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ دائیں طرف کا آدمی ہاتھ پکڑ کے اپنی جانب جھٹکا دے رہا ہے اور بائیں طرف کا اپنی جانب۔ معاملہ تو میں سمجھ گیا تھا مگر انجان بن کے عرض کیا ''خیریت تو ہے؟'' پنجابی لہجے میں بولے ''ہم سے ایڑیاں ملاؤ'' میں نے کہا ''یہ سزا کس قصور کی ہے؟'' آنکھیں نکال کر کہنے لگے ''سزا کیا معنی؟ حدیث کا حکم ہے کہ صف میں ایڑیوں سے ایڑیاں جڑی رہیں'' عرض کیا ''بجا ارشاد ہے لیکن میرا قد اور جسم دیکھیے، پاؤں ٹیڑھے کر کے ایڑیاں آپ سے ملا دوں گا، تو گر پڑوں گا، یا ایسے کرب میں مبتلا ہو جاؤں گا کہ نماز دوبھر ہو جائے گی!'' اور زیادہ لال پیلے ہو کر فرمانے لگے ''ہم یہ کچھ نہیں جانتے۔ سنت پر عمل کرنا ہو گا!'' اس پر مجھے جھڑکنا پڑا ''نماز پڑھو اور پڑھنے دو'' انتہائی غیظ و غضب میں انہوں نے بھی نیت باندھ لی اور میں نے بھی لیکن غصہ کی وجہ سے نہ میری نماز ہوئی، نہ شائد ان کی ہوئی ہو گی۔

بعد میں نمازیوں کا وفد، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میری شکایت کی۔ مولانا سمجھ گئے اور وفد سے فرمایا ''نوجوان ہیں۔ سمجھا دوں گا اطمینان رکھئے'' پھر تنہائی میں مجھ سے کہا ''مولوی صاحب، آخر آپ سب سے کیوں اُلجھتے پھرتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کی ذہنیت آپ سے چھپی ہوئی ہے؟'' عرض کیا ''مولانا، اس جہل کو کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ غور تو کیجئے، لمبے لمبے کُرتے، آدھی پنڈلیوں پر رُکے ہوئے بدوضع پائجامے، لمبی لمبی داڑھیاں۔ صف میں ٹانگیں چیرے، پاؤں گھمائے کھڑے ہیں اور سینوں پر ہاتھ بندھے ہیں! سچ عرض کرتا ہوں، یہ نظارہ دیکھ کر مجھے چمگادڑ یاد آ جاتے ہیں، جنھیں بچپن میں ملیح آباد کے ایک پرانے پیڑ پر الٹا لٹکا دیکھا کرتا تھا! جو شکل انسانوں کو پسند نہیں کیونکر مان لوں خدا کو پسند ہو گی:

ان الله جميل و يحب الجمال !

مولانا یہ سن کر ہنسنے لگے اور فرمایا ''آپ میں ابھی تک بچپن کی شرارتیں موجود ہیں۔ ہمیں لوگوں کی ذہنی مجبوریوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اصلاح کا طریقہ لٹھ ماری نہیں ہے۔ ذرا اپنے اندر اعتدال پیدا کیجئے۔''

جامع مسجد دہلی کے لطیفے

اور سنیئے دہلی آنے کے بعد[1] پابندی سے جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتا تھا۔ ایک دفعہ پچھلی صف سے آواز آئی ''پاجامہ اوپر اُٹھایئے'' سمجھ گیا کہ مخاطب یہی گناہ گار ہے، مگر انجان بن گیا۔ ادھر سے مطالبہ جاری رہا اور میں چپ کھڑا رہا۔ آخر آواز کڑکی ''آپ سے کہہ رہا ہوں، جن کے سر پر گاندھی کیپ ہے'' مجبوراً مڑ کے دیکھنا پڑا۔ ایک ثقہ بزرگ ''دینی جوش'' سے بھرے ہوئے تھے۔ عرض کیا ''اِس عاجز کو کیوں جھڑکا جا رہا ہے؟'' جھنجھلا گئے۔ ''عجیب آدمی ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ڈھکے ہوئے ٹخنے، دوزخ میں جاتے ہیں!۔'' مسکینی سے عرض کیا ''اتنا تو جانتا ہوں مگر جنت کی قدر کیا معلوم ہوگی جب تک دوزخ کا مزا بھی نہ چکھا جائے!'' بزرگ نے یہ سن کر زور سے لاحول کہا اور نیت باندھ لی!

ایک اور جمعہ کو جامع مسجد میں پھر پائجامہ اچھلا۔ لگاتار ایک کرخت آواز پیچھے پڑی تھی ''پائنچے اُٹھاؤ'' میں نے پروانہ کی، مگر وہ شخص بڑا ضدی تھا چیخے ہی چلا گیا۔ آخر مخاطب ہونا پڑا۔ ریٹائرڈ بزرگ تھا۔ کہنے لگا ''شرم نہیں آتی! ٹخنوں پر پائجامہ لٹکائے کھڑے ہو!'' اس جہالت پر سخت غصہ آیا مگر نرمی سے کہا ''حضرت، خدانخواستہ کبھی کتے نے تو نہیں کاٹا!'' بڑی برہمی سے کہنے لگا ''میں دین کی بات بتا رہا ہوں اور تم مسجد میں کتے کا نام لیتے ہو!'' عرض کیا، جناب، میں نے ہمدردی سے سوال کیا تھا۔ معاف کیجئے! دھیما پڑ گیا اور شائستگی سے کہنے لگا ''شکل سے تو آپ مرد معقول دکھائی دیتے ہیں۔ پائجامہ اونچا کر کے ٹخنے کھول دیجئے'' میں نے بھی بشاشت سے جواب دیا ''مگر اس شرط سے کہ آپ اپنا دل کھول دیں!''

مولانا سے ان لطیفوں کا تذکرہ ہوا تو ہنسے۔ یاد رہے، مولانا زور زور سے قہقہے نہیں لگاتے تھے۔ البتہ دل کھول کر ہنستے تھے۔ لطیفے سن کر فرمایا ''مولوی صاحب، بڑھاپے میں بھی لڑکپن کی شوخیاں!''

ملاؤں پر غصہ

غالباً ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ مولانا سے الگ ہو چکا تھا اور مضافات کلکتہ، دم دم چھاؤنی میں قیام تھا۔ امان اللہ خاں اور بچہ سقا کا قصہ چل رہا تھا۔ انگریز، امان اللہ کو نکال دینا چاہتے تھے اور ملائے شور بازار وغیرہ ملا اور پیر، انگریز کے پٹھو بن چکے تھے۔ اِن دنیا پرست ملاؤں نے مذہب

کے نام پر افغانستان میں فتنہ اٹھایا۔ جاہل افغانی صرف داڑھیوں، پگڑیوں، تسبیحوں کو دیکھتے تھے۔ حق و باطل کی ان میں تمیز نہ تھی۔ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی حالت بھی یہی تھی اور آج تک ہے کہ علم و معرفت کی ترازو، داڑھی بن گئی ہے جس مولوی کی داڑھی سب سے بڑی ہے، وہی سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا ہے۔

اس صورت حال پر مجھے طیش آیا، مولانا سے ملا اور عرض کیا، یہ جہل و دجل وفریب آخر کب تک جھیلا جائے گا؟ فرمایا، ''مگر اس کا علاج؟'' عرض کیا ہم اصلاح پسند لوگ اپنی وضع بدل دیں۔ داڑھی منڈا ڈالیں اور مسلمانوں سے کہیں کہ لوگوں کی صورتیں نہ دیکھو۔ ان کی باتیں پرکھو اور اپنی عقل سے کام لو۔ مولانا پہلے کلین شیور رہتے تھے، مگر نظر بندی کے بعد داڑھی رکھ لی تھی۔ میری تجویز سن کر مسکرائے۔ پھر سنجیدہ ہو کر کہا ''آپ بھی کس خرافات میں پڑ گئے ہیں۔ ملک غلام ہے۔ اس راہ سے اصلاح نہیں ہو سکتی۔''

میں اپنا سا منہ لئے واپس آیا، مگر غصہ ایسا تھا کہ مولانا کی بات نہ مانی اور منہ پر استرا پھیر دیا۔ اب دل ذرا ہلکا ہوا اور کچھ ایسا محسوس کیا جیسے امان اللہ خاں کا بھی بدلہ لے لیا ہے اور ہندوستان کے کٹھ ملاؤں کی بھی کمر توڑ ڈالی ہے! بڑے فخر سے کوٹھی کے احاطے میں ٹہلنا شروع کیا مگر دفعتاً ایک ایسی بات پیش آئی جس نے سارا گھمنڈ کرکرا کر دیا۔

کوٹھی کی مہترانی اپنی کوٹھڑی کی چوکھٹ پر بیٹھی تھی۔ اڑیسہ کی رہنے والی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتی تھی۔ وہم بھی نہ تھا کہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ آخر اٹھی اور بالکل میرے سامنے آ کر ٹھٹھک کے رُک گئی۔ آنکھیں پھاڑ کے دیکھا اور میرے منہ کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگی ''برا، اب برا! پہلے ٹھیک، بیش ٹھیک'' (یعنی اب شکل بگڑ گئی ہے۔ پہلے بہت ٹھیک تھی) مجھے تعجب ہوا پھر جب مولانا سے ملاقات ہوئی تو یہ قصہ سنایا۔ دیر تک ہنستے اور ہنساتے رہے پھر عورتوں کے ذوق پر تقریر شروع کر دی۔

لیکن میری منڈی داڑھی پر معترض نہیں ہوئے۔ آخر میں مزاحاً لمبی ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگے ''دس پندرہ برس پہلے یہ معاملہ پیش آیا ہوتا، تو؟'' عرض کیا ''مولانا، ہمارے خاندان میں ساٹھ برس کی عمر سے جوانی شروع ہوتی ہے۔ ساٹھا پاٹھا تو آپ نے سُنا ہی ہوگا!''

دیکھا آپ نے! عقائد سلف پر نہایت پختگی سے استوار ہونے پر بھی مولانا تنگ دلی، تنگ نظری، تعصب سے مُبرا تھے۔ جوہر کو، لب کو، مغز کو دیکھتے تھے۔ چھلکوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

بڑے روادار تھے۔ گمراہوں کو بھی برداشت کرتے تھے اور انتہائی نرمی و ہمدردی سے حق کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کا منہاج یہی تھا اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ تو اس بارے میں ایسا تھا کہ خود رب العالمین فرماتا ہے

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ . فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. (آل عمران ۳: ۱۵۹)

خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لیے استغفار کر دیجئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدائے تعالیٰ پر اعتماد کیجئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

حدیث و قرآن

موضوع شرح و بسط چاہتا ہے۔ اور اس کا یہاں موقع نہیں۔ ایک دن جیل میں مولانا سے عرض کیا "حدیث کی تدوین، تیسری صدی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ دو سو سال تک زبانی روایت ہوتی رہی۔ روایت بھی لفظاً نہیں معناً، راوی اپنے فہم کے مطابق اپنے لفظوں میں روایت کرتا تھا۔ اور ظاہر ہے اُ ․ ․ کا فہم ضرور ․ ․ نہیں کہ صحیح ہو۔ پھر معلوم ہے کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم حدیث لکھنے کی ممانعت فرماتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اپنے عہد خلافت میں راویوں کی دروں سے خبر لیتے تھے جب حالات یہ ہیں، تو حدیث شریعت اور قانون کا سرچشمہ کیونکر مانی جاسکتی ہے؟

فرمایا "مولوی صاحب، آپ نے ٹھیک کہا۔ حدیث صحیح عبادات میں تو حجت ہے۔ اخلاق و معاشرت کے سلسلے کی احادیث ایسی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا مگر حدیث انسانی سوسائٹی کے لیے قانون کا سوتا نہیں ہو سکتی۔ عالمگیر ہدایت کا ضامن قرآن ہے اور قرآن معدودے چند قوانین کا حامل ہے۔ یہ اس لیے کہ کوئی قانون بھی اختلاف ازمنہ و حالات کی وجہ

سے ساری دنیا پر نہ نافذ ہو سکتا ہے نہ مفید ہو سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود منصوص قوانین قرآنیہ کے التوا کا اختیار، امام المسلمین کو بخش دیا گیا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منصوص قانون طلاق میں ترمیم کر دی۔ عام الرّمادہ میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کیا کیونکہ لوگ قحط زدہ تھے اور مؤلفتہ القلوب کو مسلمانوں کا مال دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب اسلام طاقتور ہو چکا ہے اور غیر مسلموں کے تالیف قلب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ فیصلے، صحابہ نے قبول کر لئے۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ دراصل شریعت کی اساس، جلب مصالح اور دفع مفاسد پر ہے۔

فوٹو اور اسٹیچو

ایک دن عرض کیا کہ ''تذکرہ'' کے دیباچہ میں فضل الدین احمد نے لکھا ہے کہ آپ تصویر اتروانا درست نہیں سمجھتے۔ فرمایا ''ہاں، اس وقت ذہن اس بارے میں صاف نہ تھا۔ بعد میں ایک مستفتی کے جواب میں فوٹو اور اسٹیچو کے معاملے پر میں نے کچھ لکھا تھا۔ اس کا مسودہ غالباً میرے اٹاچی کیس میں پڑا ہے۔ آپ کو دے دوں گا۔ دوسرے دن وہ تحریر میرے حوالے کر دی، جو دراصل فتویٰ ہے۔ نیچے نقل کرتا ہوں:

بسم اللہ الرحمان الرحیم. حبی فی اللہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، والا نامہ پہنچا۔ تاخیر کے لیے خواستگار معافی۔ آپ نے جواز وعدم جواز فوٹو کی نسبت دریافت فرمایا ہے۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔ سردست چند اشارات پر اکتفا فرمایئے اور ان شاء اللہ آپ کے لیے اشارات ہی مطلوب۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ ہر امر ونہی شرعی کسی نہ کسی علت پر مبنی اور بنیاد کار جلب مصالح ودفع مفاسد۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بذات مضر ومفسد اور کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ گو بذات نہیں مگر مفاسد کے لیے مقدمات ووسائل کا کام دیتی ہیں۔ شارع کا فرض ہے کہ وہ جس طرح مفاسد کو روکے، اسی طرح مقدمات ووسائل کو بھی روکے کہ کسی نہ کسی وقت مفاسد تک منجر ہوں گی۔ فقہاء نے اسی لیے محرمات لغیرہ کی اصطلاح قائم کی ہے اور آپ کو اس کی تفصیل معلوم ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ انسان کی تباہی وہلاکت کا اصلی مرض مفاسد کا عشق نہیں ہے بلکہ وسائل ومقدمات کا فریب ہے۔ دنیا میں ہمیشہ مفاسد کے قیام ودوام کا ذریعہ، وسائل ومقدمات ہی

ہوئے ہیں۔ مفاسد صریحہ سے نفرت، خود طبیعتِ انسانی میں موجود ہے، اسی لیے کوئی قوم کسی فساد صریح وحقیقی کو باسم وشکل فساد یکا یک قبول نہیں کر سکتی۔ یہ وسائل ومقدمات ہی ہیں جو بوجہ عدم مضرت بالفعل شائع ہو جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مفاسد قطعیہ وَ اصلیہ تک منجر ہوتے ہیں۔ شرک و بت پرستی، قتل اولاد، انسانی قربانی، غلامی، جنگ وقتال بغیر حق وغیرہ تمام مفاسد وخبائث کے شیوع کی تاریخ پر غور کیجئے، ان سب کی ابتدا مقدمات ووسائل ہی سے ہوئی ہے۔

اسلام سے پہلے جن شرائع کا ظہور ہوا، ان سب نے اپنی تمام توجہ محض مفاسد کے دفع ومنع میں محدود رکھی، وسائل ومقدمات مفاسد سے چنداں تعرض نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا عہد، ابتدائی عہد تھا اور سلسلۂ ارتقاء مذہب کی وہ ابتدائی کڑیاں تھیں، جو بتدریج حسب استعداد اُمم ظاہر ہوتی رہیں اس وقت اقوام کی استعداد یہاں تک نہیں پہنچی تھی کہ منع وسائل کے نازک ودقیق احکام کی متحمل ہو سکیں۔ ان کی کوتاہی نظر وحداثۂ فکر کا تو یہ حال تھا کہ صریح بت پرستی سے بچنے کا صاف و واضح حکم بھی بار خاطر ہوتا تھا۔ مصر سے نکلتے ہی بنو اسرائیل نے فرمائش کر دی تھی:

اَجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ، قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ [12] (الاعراف ۷:۱۳۸)

لیکن جب وہ وقت آ گیا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [14] (المائدہ ۵:۳)

(اور اسلام کا ظہور ہوا تو ضروری ہوا کہ آئندہ کے لیے مفاسد کا قطعی سد باب کر دیا جائے اور ان تمام سوراخوں کو بند کر دیا جائے جہاں جہاں سے شر وفساد کو ابھرنے کے لیے راہیں ملتی ہیں۔ تمام شرائع کا اِس اساس اور اصلاح عالم کی اصل بنیاد، عقیدۂ توحید خالص اور منع شرک، وماسوی اللہ پرستی ہے۔ آغاز ظہور ہدایت سے اسی کی تبلیغ ہوتی رہی اور تمام انبیاء ورسل اسی کے قیام واعلان کے لیے آئے لیکن اب تک جو کچھ ہوا تھا، وہ صرف اسی قدر تھا کہ شرک صریح سے روکا گیا تھا۔ وسائل ذرائع شرک کے سد باب کا کچھ انتظام نہیں ہوا تھا اور اسی وجہ سے تمام پیروان رسل، توحید سے آشنا ہو کر پھر دوبارہ شرک واصنام پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پس اسلام نے تکمیل شریعت کے کام کو یوں پورا کیا کہ پہلوں کی طرح صرف بت پرستی اور شرک صریح ہی سے نہیں روکا بلکہ ان تمام عقائد واعمال کو جرم ومعصیت قرار دیا، جو کسی نہ کسی رنگ میں وسائل ومقدمات شرک ہو سکتے ہیں

اور گو ان میں فی نفسہ کوئی مضرت نہیں ہے لیکن وسیلہ و مقدمہ مضرات و مفاسد ضرور ہیں۔ اسلام کی حقیقت بینی نے اعمالِ انسانیہ کو صرف اِسی نظر سے نہیں دیکھا کہ ان میں مضرت بالفعل ہے یا نہیں؟ بلکہ ہمیشہ اس پر نظر رکھی کہ وہ موصل الی الفساد تو نہیں ہیں؟ اور دنیا اپنی اصلاح آخری کے لیے صرف اسی نظر کی منتظر تھی۔

جب یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی تو اب آپ دیکھیں گے کہ بہت سے امور ایسے ہیں، جن میں فی نفسہ شرک وفساد کو کوئی دخل نہیں لیکن شارع سے ان کی نسبت نہی منقول ہے اور علت نہی کی یہی ہے۔ بزرگوں اور پیشواؤں کی تعظیم میں فی نفسہ کوئی بُرائی نہ تھی لیکن یہی تعظیم مفرط ہے جو پہلوں کے لیے وسیلہ ہوئی ہے۔ لہٰذا قیام تعظیمی سے بھی روک دیا کہ: لَا تَقُوْمُوا کَالْاَ عاجم بادشاہوں اور بزرگوں کے آگے زمین بوس کورنش بجالاتے تھے اور مقصود بجز احترام کے اور کچھ نہ تھا، مگر شارع نے سجدۂ تحیہ کو بھی روک دیا۔ قیس بن سعد نے جب کہا: أتیت الحیرۃ فرأیتم یسجدون طرزبان لھم ، فانت احق بان یسجدلک فقال لا تفعلوا. زیارتِ قبور میں فی نفسہ کیا مضرت ہے بلکہ ذریعہ عبرت ودفع غفلت مگر زورات قبور پر لعنت بھیجی اور ابتداء میں بالعموم روک دیا جیسا کہ حدیث بخاری: کنت نھیتکُمْ عن زیارۃ القبور. رسول کی محبت و طاعت، عین طاعت ومحبت حق ہے اور خود قرآن ناطق ہے کہ رسول اللہ کی تعظیم وتکریم میں غفلت نہ کرو: تُعَزِّ روہ وتُوَقِّرُوہ اور: لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُم فَوقَ صَوتِ النَّبِیِّ اور: اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَا دُونَک مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَات اور: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤمِنِیْنَ (الخ) اور حدیث عمر کہ: لَا یُؤْمِن احدکم الخ بایں ہمہ فرمایا کہ: لَا تُطْرُوْنِي اور حدیث انس کہ: انی لَا اریدان ترفعونی فوق منزلتی، انا محمدبن عبداللہ (الخ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیداخلاق وامم ہونے میں کیا شک ہے اور اس تمام کرۂ ارضی میں بجز اس وجود کے کون ہے جس کو سیادت عالم پہنچتی ہو؟ بایں ہمہ جب وفد بنی عامر آیا اور لوگوں نے کہا کہ "انت سیدنا" تو آپ نے فرمایا: السیّد اللہ اور قولوا اقولکم اوبعض قولکم انبیاء میں ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے: فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ اور خیر الامم اور آخر الاویان کے داعی کے افضل الرسل ہونے میں کسی کو تامل ہوسکتا ہے تاہم فرمایا کہ: لَا تفضلونی علی یونس بن متی (الخ) اور ان تمام باتوں سے مقصود یہی تھا کہ گو فی نفسہ ان امور میں کوئی فساد نہیں بلکہ بعض بحالت صحت نیت وفکر، و جمع شروط، مستحسن و مامور بہ لیکن آگے چل کر یہی چیزیں وسیلہ شرک وفساد ہو جاتی ہیں اور پچھلی

قوموں نے اسی تعظیم و مدح و اطراء کے غلو سے انبیاء کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا ہے۔ اسی طرح منع حلف بغیر اللہ پر غور کیجئے کہ: لا تحلفوا بالطواغی و لا باابائکم کہ حدیث مسلم ہے اور حدیث حذیفہ کہ: لا تقولوا ماشاء اللہ و شاء فلان ولکن قولوا ماشاء اللہ ثم شاء فلان (ای لمافیہ من التسویۃ بین اللہ و بین عبادہ) اور روایت قتیلہ مندرجہ نسائی کہ اعتراض یہود کے بعد کعبہ کی قسم سے روکنا اور فرمانا کہ: قولوا و رب الکعبۃ اور اسی طرح حکم لایقولن احد کم عبدی و اَمَتی ولٰکن یعقل غلامی و جَاریتی (الخ) بھی اسی علت پر مبنی کہ اس قسم کی نسبتیں انسانوں کو اربابا من دون اللہ بنادیا کرتی ہیں۔ حدیث تابیر نخل بھی اس پر شاہد ہے کہ ممانعت کی بنیاد یہی علت تھی اور یہ جو مدّاحین کی مذمت کی اور تمدیح و توصیف سے روکا، تو اِس کا سبب بھی بجز اس کے کچھ نہ تھا۔

اب اصل مسئلے پر غور کیجئے۔ تصویر و تماثیل کا مسئلہ بھی دراصل اسی سلسلے میں داخل ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت آلات و وسائل بت پرستی و شرک میں سے ایک موثر ترین آلہ فن مصوری و تماثیل سازی بھی تھا۔ دنیا کی تمام بت پرست قوموں نے جب بت پرستی کی ابتدائی منزلوں سے ترقی کی (یعنی ان ابتدائی منزلوں سے جبکہ محض غیر مصنوع مظاہر فطرت کی پرستش کی جاتی تھی) تو یہی چیز (مصوری) آلہ بت پرستی بنی اور جب آپ مصوری کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بت پرستی ہی کی وجہ سے یہ فن دنیا میں شائع و مقبول ہوا۔ مصوری میں ایک چیز تو خطی ہے اور ایک تجسم و تمثل ہے۔ یعنی یا تو کپڑوں اور چمڑوں پر تصویر بنائی جاتی تھی اور یا پتھر اور مٹی کے مجسمے اور بت بنائے جاتے تھے لیکن اس عہد میں یہ دونوں طریقے صرف بت پرستی اور اس کے اقسام و وسائل کے لیے مخصوص تھے جس قدر تصویریں کھینچی جاتی تھیں اور مجسموں کی شکل میں بنائی جاتی تھیں، سب کی سب یا تو ان دیوتاؤں اور اوتاروں کی ہوتی تھیں، جن کی پرستش کی جاتی تھی، یا قومی پیشواؤں اور مقدس و محترم انسانوں کی جن کو مثل دیوتاؤں کے پوجا جاتا تھا، یا کم سے کم ان کی تصویروں کو تعظیم و تکریم سے رکھنا اور دیکھنا موجب برکت و سعادت سمجھا جاتا تھا کہ یہ بھی: لِیُقَرِّبُونَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی میں داخل ہے۔ دجلہ و فرات کے کناروں کی تمام متمدن آبادیاں (بابل وغیرہ) میں فن تصویر کو بت پرستی ہی سے ترقی ہوئی۔ یونان اور روم کی بت پرستی نے مجسمہ سازی کو منتہاء ترقی تک پہنچا دیا۔ ایران کے کھنڈر، مصریوں کے قدیم آثار اور ہندوستان کی زندہ بت پرستی، ان سب کے اندر اس فن کا آلۂ بت پرستی ہونا دیکھا جا سکتا ہے۔ عیسائیوں نے حضرت مریم اور

حضرت مسیح کے بت بنا کر گرجوں میں سجائے اور ان کی تصویروں کو تبرک وسعادت کے لیے اپنے گھروں کے اونچے طاقوں میں رکھا۔ رومن کیتھولک چرچ اب تک یہی کر رہا ہے۔ عرب جاہلیت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا۔ غرض کہ ظہور اسلام کے وقت فن مصوری صرف بت پرستی کا ایک آلہ تھا اور اس کے سوا اس سے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

علاوہ بریں غور کیجئے تو فن مصوری ویسے بھی بہر حال وسیلہ اصنام پرستی ہے۔ انسان کو قدرتی طور پر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اپنے بزرگوں اور محبوبوں سے جدا ہونے کے بعد ان کی تصویروں کے نظارے سے اپنے جی کو تسلی دے۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں تبرک و تقدس کا خیال شامل ہو جاتا ہے۔ تبرک و تقدس کا اعتقاد پرستش تک پہنچتا ہے۔ اور اس کے بعد وہی حال ہو جاتا ہے، جو قوم نوح علیہ السلام کا ہوا تھا کہ:

قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا [15] (۷۱:۲۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ سواع اور یغوث ان کے قومی پیشوا تھے۔ تعظیم و احترام ویاد آوری و تذکار کے لیے ان کے بت بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کو دیوتا سمجھ کر پرستش کرنے لگے۔

ایسی حالت میں ناگریز تھا کہ اس سب سے بڑے موثر و عامل وسیلہ و مقدمہ شرک کا انسداد کیا جائے اور یہی سبب ہے کہ شارع نے نہایت سختی کے ساتھ مصوروں اور تصویروں کی مذمت کی۔ ان کو لعن و غضب کا مورد قرار دیا اور ان گھروں کو سعادت و برکت سے محروم بتلایا، جن میں پرستش کے صور و اصنام موجود ہوں اور امید ہے کہ وہ تمام احادیث آپ کے پیش نظر ہوں گی۔

پس تصویر و تماثیل کی ممانعت کو بھی اسی سلسلے میں لانا چاہیے جس سلسلے مین تمام ایسی چیزوں کو روک دیا گیا ہے، جو گو خود کوئی برائی نہیں رکھتیں لیکن برائیوں کا وسیلہ و مقدمہ ہیں جس طرح قیام تعظیمی سے روکا، جس طرح عورتوں کو زیارت قبور سے روکا اور جس طرح مداحوں کی نسبت وعید آئی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح تصویر سازی کو بھی ممنوع قرار دیا۔ فی نفسہ تصویر بنانے میں کوئی مضرت نہیں ہے۔ یہ بھی ایک شکل خطی ہے، جس طرح صُوَرَ الفاظ و معانی، اشکال خطیہ میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ ایک قوی و عام تر وسیلہ اصنام پرستی ثابت ہوئی ہے، اس لیے سد باب شرک و بت پرستی و قیام توحید کامل و خالص و محفوظ کے لیے ضرور تھا کہ اس کو بھی سختی کے ساتھ روک دیا جائے۔

یہاں یہ بات بھی مسئلہ آپ پر ظاہر ہو گئی کہ ان نبی کی جو تاویل بعض فقہاء نے کی ہے اور یہ سبب حرمت بیان کیا ہے کہ تصویر بنانے میں خدائے تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کی نقل اتاری جاتی ہے اور بوجہ اشتراک فعل ایسا کرنا ناجائز ہوا، تو یہ کسی طرح درست نہیں۔ اگر مصوری کی ممانعت میں فقہ یہی ہے، تو کونسی وجہ ہے کہ یہی فقہاء غیر حیوانات کی تصویروں کو ناجائز نہیں قرار دیتے؟ کیا صرف انسان و حیوان ہی اللہ کی خالقیت کا ظہور ہیں؟ درخت اور پہاڑ اس کے پیدا کیے ہوئے نہیں؟ یہ تمام کائنات اسی کی مخلوق ہے، تو جس طرح ایک حیوان کی شکل بنانے سے خدا کی خالقیت کی نقالی ہوئی ہے، اسی طرح ایک درخت کے بنانے سے بھی اور ایک پہاڑ کے نقشے سے بھی یہ کہنا کہ حیوانات میں روح ہے اور ان میں نہیں، بالکل فضول ہے کیونکہ اول تو اشتراک تخلیق وجود و جسم میں ہے نہ کہ روح میں، مصور جسم کی صورت کھینچتا ہے نہ کہ روح کی اور جسم جیسا انسان کا ہے ویسا ہی پتھر کا اور ثانیاً یہ کون کہتا ہے کہ نباتات میں روح نہیں ہے؟ قرآن حکیم نے جا بجا ارواح نباتیہ کی خبر دی ہے اور علم بھی اس کی تصدیق کر چکا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کو بعض احادیث و آثار صحابہ سے دھوکا ہوا، جن میں مصورین سے مطالبہ نفخ روح کا ذکر ہے، حالانکہ ان کا مطلب دوسرا ہے۔ چونکہ مصوروں سے مقصود وہ مصور تھے۔ جو پرستش کے لیے تصویریں اور بت بنایا کرتے تھے، اس لیے فرمایا کہ ان سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اگر واقعی یہ اصنام و صور تمہارے لیے وسیلہ رزق و رفع حوائج و دفع مشکلات تھے اور صاحب ارادہ وقوت و صفاتِ الوہیت، تو جہاں تم نے ان کے جسم بنائے ہیں، وہاں ان میں روح بھی پیدا کرو، اگر ایسا نہیں ہے تو کیا ایک بے جان صورت مستحق عبادت و پرستش ہو سکتی ہے؟ پس ان روایات میں مطالبہ نفخ روح کی اصلی علت بھی وہی پرستش و شرک ہے نہ کہ تسویہ تخلیق۔

ممکن ہے کہ ان فقہاء کو یہ خیال بخاری و مسلم کی روایت ابو ہریرہ سے ہوا ہو جس کے الفاظ غالباً یہ ہیں کہ: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول قال الله تعالى و من اظلم ممن ذهب يخلق كخلقي فيخلقوا ذرة أو ليخلقوا حبه أو شعيرة الخ لیکن اس حدیث سے بھی علت وہ نہیں نکلتی، جو ان فقہاء نے سمجھی ہے۔ اصلی علت وہی شرع و پرستش طواغیت ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ نے بھی اصلی علت منع تصاویر کی یہی قرار دی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

و منها صناعته التصاویر فی الثیاب و الجدران و الانماط ، فنهی عنها النبی صلعم و مدار النهی شیئان احدهما، انها احد وجوه الارفاه و الزینة فانهم کانوا یتفاخرون بها ویبذلون اموالا خطیرة فیها فکانت کالحریر وهذا لمعنی موجود فی صورة الشجر و غیرها و ثانیهما أن المخامرة بالصور و اتخاذها وجریان الرسم بالرغبة فیها یفتح باب جارة الاصنام و ینوه امرها وینذ کرها لا هلها ، و ما نشأت جارة الاضنام فی أکثر الطوئف الامن هذه ، و هذا لمعنی یختص بصورة الحیوان ، ولذلک أمر بقطع رأس التماثیل لتصیر بهیئة الشجر الخ

شاہ صاحب نے عمومِ منع کی علت، اسراف وتبذیر وتزئین بے جاو مفرط کو قرار دیا ہے اور صور حیوانات کی نہی کا سبب سدباب شرک وعبادت اصنام بتلائے ہیں۔ یہ ان کے کمال فقہ کی دلیل ہے۔

جب یہ مراتب واضح ہو چکے، تو اب اصلی سوال کی جانب توجہ کیجئے۔ جب حرمت تصویر کا مسئلہ بھی ان نواہی میں داخل ہے جو وسیلہ مفاسد ہونے کی وجہ سے ممنوع قرار پائے، تو بلاشبہ اس کے احکام بھی وہی ہوں گے، جو اس قسم کے نواہی کے ثابت ہو چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس بارے میں شارع کا طریق کار یہ رہا ہے کہ علت حکم کے رفع کے بعد حکم بھی اُٹھ گیا ہے، یعنی ان امور کو جو اسباب کی بنا پر روکا جاتا ہے، جب ان میں تغیر ہو جاتا ہے تو اس تغیر کا اثر، نفس حکم پر بھی پڑتا ہے، کیونکہ حکم اُنہی اسباب کا نتیجہ تھا۔ مثال میں اُنہی چیزوں کو دیکھئے، جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اگر ایک طرف: لاتقوموا کما یقوم الا عاجم یعظم بعضها بعضا ہے تو دوسری طرف واقعہ بنی قریظہ میں: قوموا الی سیدکم بھی ہے اگر آغاز اسلام میں بالعموم زیارت قبور سے روک دیا گیا کہ: نهیتکم عن زیارة القبور تو پھر یہ بھی ہے کہ: زوروها فانها تذکرکم الموت ترمذی میں ہے کہ: قال رجل یا رسول الله ، الرجل منا یلقی أخاه أو صدیقه أینحنی له؟ قال لا أفیلتزمه و یقبله ؟ قال لا . قال أفیا خذه بیده و یصافحه، قال نعم [1] لیکن ساتھ ہی اسی ترمذی کے اسی باب میں حدیث صفوان بن عال بھی ہے کہ: فقبلوا ایریه ورجلیه اور ابوداؤد میں روایت زارع وفد عبدالقیس کہ: فجعلنا نتبادر

من رواحلنا فنقبل ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجلہ اور حدیث ابن ماجہ عن ابن عمر کہ "قبلنا یدہ" (الخ) اگر ایک موقع پر فرمایا کہ: لا تفضلونی علیٰ یونس بن متی تو دوسرے موقعہ پر یہ بھی ہے کہ: لو کان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی اور: اٰدم ومن دونہ تحت لوائی ، وفد بنی عامر کی روایت میں اس سے روکا کہ مجھے سیدنا نہ کہو: "السیّد اللّٰہ" لیکن پھر خود ہی فرمایا: انا سید ولد اٰدم ولا فخر رُقی وتمائم کے متعلق کس قدر شدت کے ساتھ نہی آئی ہے۔ ابوداؤد اور احمد کی روایت ابن مسعود میں ہے کہ: ان الرقی و التمائم و التولتہ شرک اور امراۃ عبداللہ بن مسعود کا واقعہ کہ: ان عبداللہ رائی فی عنقی خیطا فقال ماھٰذا؟ فقلت خیط رقی لی فیہ ، قالت فاخذہ ثم قطعہ ثم قال سمعت رسول اللہ (الخ) لیکن ساتھ ہی مسلم کی روایت عوف بن مالک کو دیکھیے: اعرضوا علیٰ رقاکم مالم یکن فیہ شرک اور بکثرت احادیث موجود ہیں کہ اس کی اجازت دی اور صحابہ نے کیا۔ واقعہ تابیر نخل بھی اسی سلسلے میں داخل، کہ ابتدا میں بخوف شرک روکا مگر پھر اجازت دی اور فرمایا: انتم اعلم باموردنیاکم اسی طرح وجوہ مداحین کے لیے: احثوا التراب فرمایا اور نہایت شدت کے ساتھ خود اپنی مدح وتوصیف کے اغراق سے روکا مگر ساتھ ہی بکثرت احادیث وآثار موجود ہیں، جن میں صحابہ کرام کے مدح وتوصیف کرنے اور آپ کے سننے اور نہ روکنے کا ذکر ہے اور اس بارے میں صحابہ کرام کے استغراق واستہلاک کا قولاً وعملاً جو حال تھا وہ محتاج بیان ہیں۔ شعراء اہل اسلام کی تمدیح وتوصیف اور آپ کا تحسین فرمانا معلوم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: لقد بلغ من فضیلتک عند اللہ ان اقسم بتراب قدمیک ، فقال لا اقسم بھٰذا البلد وانت حل بھٰذ البلد.

بظاہر دیکھیے تو ایک ہی چیز کے متعلق ایک موقع پر نہی ہے اور دوسرے موقع پر نہ صرف جواز بلکہ امر وتحسین۔ اہل علم نے ان اختلافات احکام پر مختلف پہلوؤں سے بحثیں کی ہیں مگر فی الحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں اور اختلاف حکم کی علت، اختلاف حالت اور وجود وعدم وجود علت نہی ہے۔ دنیا میں انسانی پرستش کا ایک بڑا وسیلہ: یعظم بعضھا بعضا رہا ہے کہ تعظیم مفرط پرستش تک پہنچ گئی ہے۔ علی الخصوص ایسی حالت میں کہ پیشوایان ملت ورؤسا دینی کی کی جائے، اس لیے انسداد شرک کے لیے اس سے روکا مگر: قوموا الیٰ سید کم کا موقعہ دوسرا تھا اور تواضع وادب ومراعات حقوق میں داخل، لہٰذا خود حکم دیا۔

دنیا میں فتنہ قبور، شرک کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے، اس لیے زیارت قبور سے روکا گیا لیکن جب توحید اسلامی دلوں میں راسخ ہوگئی تو "فزوروھا" فرما کر حکم دے دیا کہ اب وسیلۂ شرک ہونے کی جگہ تذکرۂ موت و عبرت کا ذریعہ تھا۔ گزشتہ قوموں کی ایک بڑی ضلالت مرتبہ نبوت و الوہیت کا اختلاط و اتحاد تھا۔ مسیحی تحریک اسی گمراہی کی بدولت رائیگاں گئی، اس لیے شارع نے ہمیشہ اپنی تعظیم مفرط و مدح و اطراء و غلو و اغراق سے روکا "لا تطرونی" اور "لاتفضلونی" اور "السید اللہ" وغیرہ ارشادات و احکام اسی علت پر مبنی تھے لیکن جن جن مواقع میں یہ علت ہی باقی نہ رہی، وہاں منع و نہی کا بھی وجود نہ رہا اور کبھی فرمایا اور کبھی "ادم و من دونہ تحت لوائی" اور کبھی "لو کان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی" اور مرتبہ شناسان رسالت نے بھی جو کچھ کہا، اس کو بسمع رضا و استحسان کے ساتھ قبول فرمایا و نعم ما قیل:

ماشئت قل فیہ فانت مصدق

فالحب یقضی و المحاس تشھد

پس یہ حالت دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ تصویر کا معاملہ بھی اِسی سلسلے میں داخل ہے۔ دراصل علتِ نہی، شرک و اصنام پرستی تھی۔ اگر یہ علت باقی نہ رہے، تو کیوں تصویر ممنوع ہو؟ اگر زیارت قبور (جو وسیلۂ مفاسد ہونے کے لحاظ سے کم از تصویر نہیں) بحالت تذکرۂ موت و رفع خوف شرک جائز ہوگئی اور اسی طرح اور بہت سی چیزیں، تو بحالتِ عدمِ خوف پرستش و باغراض مستحسنہ علمیہ و اخلاقیہ تصویر کشی کیوں جائز نہ ہو؟ (انتہیٰ)

مولانا میں مذہبی انقلاب

ہم جیل میں تھے اور یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ مولانا اپنے مفصل حالات مجھے لکھا دیں، لیکن ان میں جو مذہبی انقلاب ہو چکا تھا، اس کی تفصیل جاننے کی فکر تھی، ایک دن عرض کیا "آپ نے پیر گھرانے میں آنکھ کھولی پھر آپ کے مذہبی خیالات میں یہ حیرت انگیز انقلاب کیونکر ہوگیا؟ کہنے لگے "لکھ کر جواب دوں گا" چند روز بعد ذیل کی تحریر میرے ہاتھ میں دے دی جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے:

آپ کا یہ سوال میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ میں پیدائشی طور پر مسلمان ہوں لیکن آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ پیدائشی اور خاندانی ورثے میں مجھے جو مذہب ملا تھا، میں اس پر

قانع نہیں رہا اور جوں ہی مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہوئی کہ کسی چیز کو اپنے سے الگ کر سکوں، میں نے اسے الگ کر دیا اور پھر ایک خالی دل و دماغ لے کر طلب و جستجو میں نکلا۔ اس جستجو میں مجھے بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑا اور پے درپے کئی ذہنی انقلاب میرے دماغ پر طاری ہوئے۔ بالآخر میں نے اپنا مقصود حاصل کر لیا اور یہ وہی مقام ہے، جہاں اپنے آپ کو اب پاتا ہوں بلاشبہ یہ اسلام ہے لیکن وہ اسلام نہیں ہے، جو محض رسم وتقلید کا مجموعہ تھا اور مجھے پیدائشی ورثے میں ملا تھا۔ میں اب اس لیے مسلمان نہیں ہوں کہ مجھے خاندانی طور پر ایسا ہی ہونا چاہیے، بلکہ اس لیے ہوں کہ میں نے اپنی طلب وجستجو سے اس کا سراغ پایا ہے۔ مجھے یقین اور اطمینان کی تلاش تھی اور وہ مجھے یہیں ملا۔

انسانی دماغ خاندان، تعلیم، سوسائٹی اور گرد و پیش کے موثرات کی مخلوق ہوتا ہے، علی الخصوص مذہب کے بارے میں خاندانی تقلید کا اثر اس درجہ قوی ہے کہ اس سے باہر نکلنے کا کبھی ہمیں وہم و گمان بھی نہیں گزرتا۔ کتنے ہی انسان ہیں جو اپنی شہ زوری میں بڑی بڑی آہنی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے لیکن وہ اس رشتے کو چھو بھی نہیں سکتے جو آبائی تقلید کا ان کی گردن میں پڑا ہے۔ فی الحقیقت انسان کی تمام غفلت وگمراہی کی اصلی بنیاد یہی ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ یہ خدا کا بڑا ہی فضل و احسان تھا کہ مجھے اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی حصے ہی میں اس قید و بند سے نجات حاصل ہو گئی۔ میرے موجودہ مذہبی عقائد نہ تو مجھے خاندان سے ملے ہیں نہ میرے استادوں نے ان کی تلقین کی، نہ میری سوسائٹی ان کے لیے رہنما ہو سکتی تھی۔ یہ تمام چیزیں تو موافق ہونے کی جگہ میری راہ میں رُکاوٹ کا حکم رکھتی تھیں۔ انہوں نے مجھے جو کچھ دیا، وہ میں نے کھو دیا اور مجھے جو کچھ مطلوب تھا، وہ خود اپنی طلب وجستجو سے ڈھونڈ نکالا۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ مذہب کے بارے میں انسانی عقائد کی جتنی اصولی قسمیں ہیں، ان میں سے کوئی قسم ایسی نہیں، جو کچھ عرصے تک مجھ پر حاوی نہ رہ چکی ہو۔

اس راہ میں جتنے قدم اُٹھے ہیں، سب کو تقریباً یکساں حالتیں پیش آئی ہیں۔ پہلے تقلیدی اور رسمی مذہب کی بے فکری اور مدہوشی میں دل سرشار ہوتا ہے۔ پھر شک اور اضطراب کی خلش پیدا ہوتی ہے اور شک آہستہ آہستہ انکار تک پہنچا دیتا ہے۔ مجھ پر بھی بتدریج یہ تمام حالتیں طاری ہوئیں۔ مجھ کو تقلیدی اور رسمی مذہب کی پرستش سے شک اور اضطراب نے نکالا اور شک نے بالآخر انکار اور دہریت کی صورت اختیار کی۔ میں مدتوں مذہب اور عقل کی آمیزش و آویزش کی گھاٹیوں میں سرگرداں رہا۔ عرصے تک میٹریلزم اور ریشنلزم کے جلوۂ سراب کو آبِ حیات سمجھتا رہا۔ اس راہ

کی جتنی بیماریاں ہیں، وہ بھی مجھے لگیں اور جتنے نسخے ہیں، وہ بھی میں نے استعمال کیے۔ بالآخر جب قدم جستجو سے تھک گئے اور ہمت نے جواب دے دیا، تو اچانک پردۂ ظلمت چاک ہوا اور نظر اُٹھائی تو حقیقت گم گشتہ کا چہرہ بے نقاب سامنے موجود تھا!

اس منزل پر پہنچ کر یہ سب سے بڑی بنیادی سچائی مجھ پر کھل گئی کہ مذہب کی راہ، عقل و ادراک سے نہیں بلکہ خالص اور بے میل جذبات سے طے کی جاسکتی ہے اور مذہبی سچائی کا پالینا اس لیے کٹھن نہیں ہے کہ وہ مشکل ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ بہت ہی آسان ہے اور انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ سامنے کی آسان اور عام چیزوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے!

ایک راہ گم کردہ مسافر برسوں تک کوہ وصحرا کی خاک چھان کر بالکل مایوس ہو گیا ہو اور عالم مایوسی میں کسی درخت کے نیچے گر کے بے ہوش ہو گیا ہو لیکن جب بے ہوشی سے بیدار ہو، تو دیکھے کہ اپنے وطن میں خاص اپنے محبوب گھر کی چھت کے نیچے پڑا آرام کر رہا ہے! یہ دیکھ کر اس کا کیا حال ہو گا؟ یقین کرنا چاہیے۔ میرا یہی حال ہوا۔

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی، جو صدیوں سے مذہبی بزرگی اور پیشوائی رکھتا تھا اور ہزاروں لاکھوں آدمی اس کے سامنے اطاعت اور تعظیم کا سر جھکاتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف بزرگی اور تقدس کا جلوہ دیکھا اور ایک بت کی طرح اپنے خاندان کو معظم و محترم پایا۔ میں ابھی بچہ ہی تھا کہ ہزاروں آدمی آتے تھے اور بوجہ پیر زادہ ہونے کے میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔ اپنے بزرگوں کے سوا جس آدمی کو دیکھتا تھا، اپنے آگے جھکا ہوا اور ادب و تعظیم سے مرعوب پاتا تھا۔ بڑے بڑے قابل اور معمر آدمی آتے تھے اور وہ میرے سامنے (جبکہ میری عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی) اس ادب واحترام سے بیٹھتے تھے، گویا میں سچ مچ کا ان کا بت ہوں۔ میرے منہ سے جو بات نکلتی، خواہ وہ کتنی ہی فضول اور بے معنی ہوتی لیکن وہ بڑے ہی اعتقاد اور احترام کے ساتھ سر جھکائے ہوئے سنتے اور ہر بات پر آمنا اور صدقنا کرتے!

ظاہر ہے کہ ایسی فضا میں پرورش پانے کا قدرتی اثر میرے دماغ پر کیا پڑ سکتا تھا؟ سب سے پہلے تو یہ کہ میں اپنا خاندانی شان وشکوہ دیکھ کر اسی میں سرشار رہ جاتا اور تحصیل علم کے لیے میرے اندر کوئی طلب و کاوش پیدا ہی نہ ہوتی، جیسا کہ بڑے بڑے پیروں اور پیشواؤں کی اولاد اپنے موروثی عزت واحترام کی وجہ سے عموماً بے پرواہ ہو جاتی ہے اور اکثر صورتوں میں جاہل واپاہج بن کر رہ گئی ہے۔ پھر اگر والد مرحوم کی کوشش، خاندانی روایات کا اثر اور ذاتی شوق وطلب کی وجہ سے

ایسا نہ ہونے پاتا جب بھی ظاہر ہے کہ ایسی موروثی اور گہری مذہبی فضا میں کسی نئی فکر اور جستجوؤں کی راہ کا کھلنا، تقریباً محال تھا۔

اپنی موجودہ حالت سے بلند تر حالت کی طلب جبھی پیدا ہوسکتی ہے جب کوئی نہایت ہی قوی خارجی محرک موجود ہو لیکن یہاں نہ صرف یہ بات تھی کہ کوئی ایسا محرک موجود نہ تھا بلکہ ایسے محرکات کے لیے اس کی آب وہوا موافق ہی نہ تھی۔ میرے خاندان کی تمام پرانی روایات نہایت سخت راسخ الاعتقادی کی چلی آتی تھیں۔ گھر میں شب وروز ان تمام باتوں کا چرچا اور اعتقاد رہتا تھا، جو ایسے اعتقاد کا لازمی نتیجہ ہیں۔ والد مرحوم بھی نہایت سخت راسخ الخیال شخص تھے "کیوں"؟ اور "کس لیے؟" کی ان کے اعتقاد میں گنجائش ہی نہ تھی۔ مسلمانوں میں جو مذہبی عقائد کے اسکول آزاد خیال اور اعتقادی امور کو فکر واجتہاد کے ساتھ قبول کرنے والے ہیں، وہ ان کے بھی سخت مخالف تھے اور تمام عمر ان کے رد میں قلم وزبان سے کام لیتے رہے تھے۔ ان کی دوتہائی تصنیفات انہی کے رد میں ہیں۔ میرے تمام استاد جن سے میں نے ابتدا سے لے کر آخر تک تعلیم حاصل کی، ایسے ہی خیالات کے تھے اور اب میں سوچتا ہوں، تو ان میں سے بعض کی سختی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک خفیف سے اختلاف رائے پر بھی بالکل کافر، یعنی اسلام سے خارج ہوجانے کا فتویٰ دے دیتے تھے۔ جو نصاب تعلیم میں مجھے پڑھایا گیا اور مذہبی علوم کی جن کتابوں کی تعلیم دی گئی، وہ بھی سرتاسر اسی مسلک پر مشتمل تھیں۔

پس ایسی حالت میں کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی میرا دماغ اس دائرے سے باہر کا کوئی تخیل کرسکتا، یا کسی مزید طلب اور جستجو کی خلش میرے اندر پیدا ہوسکتی؟ قدرتی طور پر میری بڑی سے بڑی ترقی بھی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی کہ میں اپنی خاندانی روایات کے مطابق ایک اچھا کامیاب پیر اور مولوی ہوتا، جس کے ہاتھ چومنے والوں کا حلقہ بہت دور تک پھیلا ہوا نظر آتا!

لیکن شائد یہ بات نہایت عجیب سمجھی جائے گی کہ نتیجہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیوں؟ تو میں اس وقت بھی اِس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا لیکن یہ واقعہ ہے کہ ابھی میری تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ میرا دل اچانک اپنی موجودہ حالت اور اردگرد کے منظر سے اُچاٹ ہوگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کسی اچھی حالت میں مبتلا نہیں ہوں۔ یہ بے اطمینانی بڑھتی گئی، حتیٰ کہ مجھے ان ساری باتوں سے، جو لوگوں کی نظروں میں انتہا

درجہ عزت واحترام کی باتیں تھیں، ایک طرح کی نفرت ہوگئی اور میں اندر ہی اندر ان باتوں پر شرم اور ذلت محسوس کرنے لگا۔ اب جو لوگ میرا ہاتھ پاؤں چومتے، تو مجھے محسوس ہوتا کہ گویا ایک بہت ہی سخت برائی کا کام ہو رہا ہے۔ چند دن پہلے یہی منظر میرے لیے نہایت ہی فخر وغرور کا باعث تھا!

چند دنوں کے بعد یہ جذبہ ایک دوسرے رخ پر بہنے لگا۔ اپنی حالت کے احتساب نے اپنے عقائد وافکار کے احتساب پر توجہ دلائی، اور اب جو میں نے اپنے مذہبی عقائد کا جائزہ لیا، تو اس میں بجز آبائی تقلید، دیرینہ رسم پرستی اور موروثی اعتقاد کے اور کچھ نہ تھا۔ ''میں ایسا کیوں یقین کرتا ہوں؟'' اِس کا جواب مجھے اِس کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا کہ ''چونکہ ایسا ہی مجھے بتایا گیا ہے'' یا ''چونکہ ایسا ہی میرے باپ دادا کا اعتقاد تھا'' یہ جواب میرے دل میں شک اور اضطراب کا ایک طوفان برپا کر دیتا اور میں اپنے تمام پُرشکوہ عقیدوں اور سارے طلسم نما خیالات کے ساتھ بے اختیار بہنے لگتا!

''کیا فی الحقیقت خدا کا وجود ہے؟ اور کیا واقعی مذہب کے تمام بتلائے ہوئے عقائد حقیقت رکھتے ہیں؟''

''اگر ایسا ہی ہے، تو پھر اتنی بڑی حقیقت اور سچائی میں اتنا اختلاف کیوں ہے؟ مذہب اگر ہدایت اور امن کے لیے ہے، تو پھر وہی انسان کے تمام اختلافوں اور جھگڑوں بلکہ انتہا درجہ خونریزیوں کا سبب کیوں بن گیا ہے؟ حقیقت ایک ہی ہو سکتی ہے۔ ایک سے جو زیادہ ہے وہ تو حقیقت نہیں ہے۔''

''پھر اگر دنیا کے اتنے بے شمار مذہبوں میں سے کسی ایک مذہب کو مان بھی لیا جائے، تو بھی مشکل کہاں ختم ہوتی ہے؟ ہر مذہب کے اندر بھی تو بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں اور بہت سی جماعتوں میں اس کے ماننے والے بٹ گئے ہیں؟ ایک کیوں حق پر ہے اور دوسرا کیوں حق پر نہیں؟''

یہ تین سوال تھے، جو ۱۴ برس کی عمر میں مجھ پر اس طرح چھا گئے تھے کہ خون اور گوشت کی جگہ میرے اندر صرف اِنہی کی گونج بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ گرہ کو جس قدر کھینچا جائے اُتنا ہی اور زیادہ اُلجھ جاتی ہے۔ اِسی طرح میں جس قدر حل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اُتنا ہی زیادہ اُلجھاؤ بڑھتا جاتا تھا۔

میں نے ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مختلف مذہبوں کی کتابیں بار بار دیکھ ڈالیں۔ میں اس وقت بمبئی میں تھا۔ وہاں مجھے متعدد عیسائی، یہودی، پارسی، بہائی، ناستک اور ہندو عالموں سے ملنے اور بحث ومباحثہ کا موقعہ ملا لیکن ان کی باتیں میری اُلجھن کو اور زیادہ کرتی تھیں۔ ان کے جوابات اور مباحث سن کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میری پریشانی اس سے کہیں زیادہ

ہونی چاہیے۔ جس قدر میں سمجھے ہوا تھا۔ بالآخر یہ اندرونی تکلیف یہاں تک بڑھی کہ میں بیمار ہوگیا۔ غذا بند ہوگئی۔ نیند اُچاٹ ہوگئی۔

اِس اثنا میں میں نے ماڈرن فلاسفی اور سائنس کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کیا، جس قدر مطالعہ مشرقی زبانوں میں تراجم سے کرسکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کی طرف سے میری بے اطمینانی اور زیادہ گہری ہوگئی۔

اب مجھ پر وہ دروازہ کھلا، جو اس راہ میں ہمیشہ کھلا کرتا ہے۔ یعنی مذہب اور عقل کی تطبیق و اتحاد کا طریقہ۔ اس کے بھی متعدد اسکول ہیں۔ میں نے سب کا مطالعہ کیا اور اِس سے اتنا ضرور ہوا کہ ایک عارضی سکون مجھے ہوگیا۔ اِسی زمانے میں میں نے سرسید احمد خاں مرحوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا، جن کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے موجودہ زمانے میں مذہب اور ماڈرن سائنس کو ملانے کے لیے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ مجھ پر ان کی تصنیفات کا بہت اثر پڑا۔ حتیٰ کہ کچھ دنوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں بالکل ان کا مقلد اور پیرو ہوگیا تھا۔

مگر یہ وقفہ عارضی تھا۔ بہت جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ منزل مذہب کی طرف لے جانے والی نہیں ہے بلکہ مذہب سے انکار کی ایک نرم اور ملائم صورت ہے۔ آخری نتیجہ میرے دل و دماغ پر حاوی ہوگیا تھا، یعنی گو میں زبان سے صاف صاف اقرار نہیں کرتا تھا لیکن میرے اندر قطعی انکار و الحاد کی آواز گونج رہی تھی۔

میں اب پکا دہری ہوگیا تھا۔ میٹیریلزم اور ریشنلزم کے اعتقاد پر میرے اندر فخر و غرور تھا اور مذہب کے نام میں جہل و توہم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، تاہم وہ چیز کہاں تھی جس کی ڈھونڈھ میں نکلا تھا؟ یعنی دل کا اطمینان؟ وہ تو اب اور زیادہ دور ہوگئی تھی۔ میرے اضطراب کی اندھیاری میں تسلی کی ایک ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی!

۱۴ برس سے لے کر ۲۲ برس کی عمر تک میرا یہی حال رہا۔ میرا ظاہری روپ ایک ایسے مذہبی آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل و علم کے ساتھ ساتھ چلانا چاہتا ہے لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی الحاد تھا اور عمل میں قطعی فسق!

یہی منزل میری آخری مایوسی کی منزل تھی اور اسی کے بعد اچانک امید کی روشنی میرے سامنے چمکی۔ میں جس طرح اس ہاتھ کو نہیں بتلا سکتا، جس نے مجھے اندھیاری میں دھکیلا، اسی طرح میں اس ہاتھ کے لیے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، جس نے اچانک مجھے اُجالے میں پہنچا دیا، تاہم یہ

حقیقت ہے کہ روشنی نمودار ہوئی اور نو برس خاک چھاننے کے بعد میں نے اپنی منزل مقصود خود اپنے ہی پاس موجود پائی۔ تمام شکوک دور ہو گئے۔ تمام دھوکے مٹ گئے۔ جس یقین اور اطمینان کی تلاش تھی وہ مجھے حاصل ہو گیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ مذہب اور عقل کے میدان بالکل الگ الگ ہیں اور دونوں کا ایسا پوزیشن نہیں ہے کہ ان کو باہم مخالف سمجھ کر توڑنے یا جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ مادہ اور محسوسات کی راہ ہم ادراک سے طے کر سکتے ہیں، مگر مذہب جس عالم کا پیام لاتا ہے، اس کے لیے ہمارے پاس صرف جذبہ ہے اور یہ بڑی بھول ہے کہ چاندی سونا تولنے کے کانٹے سے ہوا اور روشنی کا بھی وزن معلوم کرنا چاہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ جس مذہب کو دنیا اسلام کے نام سے پہچانتی ہے، فی الحقیقت وہی مذہبی اختلافات کے سوال کا اصلی حل ہے۔ اسلام، دنیا میں کوئی نیا مذہب قائم نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اس کا مشن خود اس کے بیان کے مطابق صرف یہ ہے کہ دنیا میں تمام مذہبوں کے ماننے والے اپنی اصلی اور بے میل سچائی پر قائم ہو جائیں اور باہر سے ملائی ہوئی جھوٹی باتوں کو چھوڑ دیں۔ اگر وہ ایسا کریں، تو جو اعتقادان کے پاس ہوگا، اس کا نام قرآن کی بولی میں اسلام ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی سچائی ایک ہے۔ ابتداء سے موجود ہے اور تمام انسانوں اور قوموں کے لیے یکساں طور پر آتی رہی ہے۔ دنیا کا کوئی ملک، کوئی گوشہ نہیں، جہاں خدا کے سچے بندے نہ پیدا ہوئے ہوں اور انہوں نے سچائی کی تعلیم نہ دی ہو لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ لوگ کچھ دنوں تک اس پر قائم رہے، پھر اپنے خیال اور وہم سے طرح طرح کی نئی اور جھوٹی باتیں نکال کر اس طرح پھیلا دیں کہ وہ خدا کی سچائی، انسانی ملاوٹ کے اندر گم ہوگئی۔

اب ضرورت تھی کہ سب کو جگانے کے لیے ایک عالمگیر صدا بلند کی جائے۔ یہ اسلام ہے۔ وہ عیسائی سے کہتا ہے کہ سچا عیسائی بنے۔ یہودی سے کہتا ہے کہ سچا یہودی بنے، پارسی سے کہتا ہے کہ سچا پارسی بنے۔ اسی طرح ہندوؤں سے کہتا ہے کہ اپنی اصلی سچائی کو دوبارہ قائم کر لیں، یہ سب اگر ایسا کر لیں، تو وہ وہی ایک ہی سچائی ہوگی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ سب کو دی گئی ہے۔ کوئی قوم نہیں کہہ سکتی کہ وہ صرف اسی کی میراث ہے۔ اسی کا نام "اسلام" ہے اور وہی "دین الفطرۃ" ہے یعنی خدا کا بنایا ہوا نیچر، اسی پر یہ تمام کارخانہ ہستی چل رہا ہے۔ سورج کا بھی وہی دھرم ہے۔ زمین بھی اسی کو مانتے ہوئے ہر آن گھوم رہی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی ہی اور کتنی زمینیں اور دنیائیں ہیں اور ایک خدا کے ٹھہرائے ہوئے ایک ہی قانون پر عمل کر رہی ہیں!

پس قرآن لوگوں کو ان کے مذہب سے چھڑانا نہیں چاہتا، بلکہ ان کے اصلی مذہب پر ان کو دوبارہ قائم کر دینا چاہتا ہے۔ دنیا میں بے شمار مذہب ہیں۔ ہر مذہب کا پیرو سمجھتا ہے کہ سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے اور باقی سب باطل پر ہیں۔ گویا قوم اور نسل کی طرح سچائی کی بھی میراث ہے۔ اب اگر فیصلہ ہو تو کیونکر ہو؟ اختلاف دور ہو تو کس طرح ہو؟ اس کی صرف تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ سب حق پر ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ حق ایک سے زیادہ نہیں۔ اور حق میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ دوسری یہ کہ سب باطل پر ہیں۔ اس سے بھی فیصلہ نہیں ہوتا کیونکہ پھر حق کہاں ہے؟ اور سب کا دعویٰ کیوں ہے؟ اب صرف ایک تیسری صورت رہ گئی، یعنی سب حق پر بھی ہیں اور سب ناحق پر بھی۔ یعنی اصل ایک ہے اور سب کے پاس ہے۔ ملاوٹ باطل ہے، موجب اختلاف ہے اور سب اس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ملاوٹ چھوڑ دیں اور اصلیت کو پرکھ کے صاف کر لیں، تو وہ ایک ہی ہوگی اور سب کی جھولی میں نکلے گی۔

''قرآن'' یہی کہتا ہے اور اس کی بولی میں اسی مشترک اور عالمگیر اصلیت کا نام اسلام ہے۔

شک اور انکار کے بعد یقین اور اعتقاد کے حصول میں میرے نظر و فکر کا کیا عالم رہا اور میرے تمام لاینحل سوالوں کے کیا کیا جواب ملے؟ یہ بہت لمبی چوڑی داستان ہے اور میری موجودہ تصنیفات انہی کی شرح ہیں۔'' (انتہیٰ)

قادیانی

کچھ مدت کے بعد مولانا نے اپنے حالات قلم بند کرانا شروع کیے اور جب سفر قادیان اور مرزا صاحب سے ملاقات کا تذکرہ آیا، تو میں نے سوال کیا کہ قادیانی فرقے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے دوران میں رک کر فرمایا، یاد پڑتا ہے اس بارے میں کسی کے استفتاء کا جواب لکھ کر میں نے تمہیں گرفتاری سے پہلے نقل کرنے کو دیا تھا۔ مجھے بھی یاد آ گیا۔ موجودہ کتاب کی تالیف کے وقت پھر یہ چیز مجھے یاد آئی۔ پرانے کاغذ اُلٹے پلٹے، تو مولانا کا یہ فتویٰ انہیں کے قلم سے لکھا ہوا مل گیا۔ یہاں پوری تحریر نقل کرتا ہوں۔

سوال: مرزا غلام قادیانی کے پیروں کی نسبت حکم شرعی کیا ہے؟ وہ مثل دیگر مبتدع فرقوں کے گمراہ ہیں یا قطعاً کافر ہیں؟ ان کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنا چاہیے؟ جواب دیتے ہوئے یہ بات بھی پیش نظر رکھ لی جائے کہ ان کی نسبت بیان کیا جاتا

ہے کہ ختم نبوت کے منکر ہیں، مرزا غلام احمد کو نبی تسلیم کرتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کلمات توہین ان کی کتب میں مرقوم ہیں نیز ان میں سے قادیانی فرقہ مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے۔

الجواب

بسم اللہ الرحمان الرحیم...... الحمد للہ وحدہ۔ جواب سے پہلے چند امور کا ذہن نشین ہو جانا ضروری ہے:

۱۔ ہر مدعی اسلام کی نسبت اصل، اثبات ہے کہ نفی۔

۲۔ سلف و اہل علم نے اس پر اجماع کیا کہ مول کا حکم، منکر کا نہیں ہے۔

۳۔ لزوم والتزام میں فرق ہے۔

۴۔ سلف کی اصطلاح میں کفر کا اطلاق، مختلف مراتب ضلالت پر بھی ہوا، جیسا کہ امام بخاری نے باب باندھا "کُفْرٌ دونَ کُفرٍ" لیکن وہ کفر جو مخرج عن الملت ہے، ان سے مختلف ہے۔

اب جواب سنئے۔ اگر آپ کا سوال یہ ہوتا کہ ختم نبوت کا انکار اور انبیاء کرام کی توہین کفر ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں ایک سے زیادہ حکم لگانے کی گنجائش نہیں، یعنی وہ قطعاً کفر ہے لیکن آپ کا سوال یہ نہیں ہے۔ آپ ایک معین جماعت کی نسبت دریافت کرتے ہیں، جس کے عقائد مسطور و مشہور ہیں۔ اب یہ ضروری ہوا کہ تحقیق کیا جائے کہ واقعی وہ ختم نبوت کی منکر ہے یا نہیں؟

مجھے جہاں تک ان لوگوں کی کتابیں دیکھنے اور ان کی زبانی ان کے عقائد سننے کا اتفاق ہوا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ گو ان کی تاویلات باطلہ سے ہمارے نزدیک قریب قریب انکار لازم آجاتا ہو لیکن انہیں اس کے التزام سے قطعاً انکار ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کا اقرار نہیں کرتے کہ انہیں آیہ ختم نبوت یا اس کے مسلم منطوق سے انکار ہے۔ البتہ وہ تاویلات کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ تمام تلاویلات باطل ہیں اور بدع وضلالت پر مبنی ہیں، تاہم جب کفر و اسلام کا سوال آئے گا تو ہم ان پر منکر کا حکم نہیں لگائیں گے اور اس میں احتیاط کریں گے۔

اِسی طرح حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت مرزا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے وہ اس معنیٰ میں تسلیم نہیں کرتے، جو ہمارے نزدیک لازم آجاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقصود اس سے اس رسول کی توہین نہیں ہے، جس کا قرآن مصدق ہے بلکہ اس یسوع کی نسبت بطور حجت الزامی کے عیسائیوں سے معارضہ مقصود ہے، جس کا حال ان کی بائبل میں مرقوم ہے۔ ان کا یہ بیان

اہل حق وعلم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ تاہم اس بیان کے بعد ہم ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کا الزام نہیں لگا سکتے۔

باقی رہا عامہ اہل اسلام کی تکفیر، تو بلاشبہ یہ اشد شدید ضلالت ہے لیکن اس کی بنا پر بھی انھیں ملت سے خارج نہیں کر سکتے۔ وھذہ لیست اوّل فاروقۃ کسُرت فی الاسلام۔ خوارج بھی تمام مسلمانوں کی تکفیر کرتے تھے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ مشہور و معلوم ہے۔ انہوں نے جمعہ کے دن خطبے میں فرمایا کہ گو تمہارے عقائد اس اس طرح کے ہیں لیکن جب تک تم قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے ہو، میں تمہیں مسلمانوں سے خارج نہیں کروں گا (حکاہ الذھبی فی التاریخ)

علاوہ بریں خود اس جماعت میں دو گروہ ہو گئے ہیں اور دونوں مرزا صاحب کے اقوال و عقائد کے تعیین میں باہم دگر معارض ہیں۔ لاہوری جماعت ان تمام باتوں کا کچھ دوسرا مطلب بتلاتی ہے ایسی حالت میں کیونکر یہ جائز ہوگا کہ ان پر ملت سے خارج ہو جانے کا حکم دے دیا جائے۔

میرے نزدیک ان کا شمار اسلام کے گمراہ فرقوں میں ہے اور جو ان میں غالی ہیں ان کی گمراہی کمال مرتبہ ضلالت تک پہنچی ہوئی ہے تاہم میں کسی ایسے فرد یا جماعت کو جو شہادتین کا اقرار کرتی ہو، یوم آخرۃ پر ایمان رکھتی ہو اور قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتی ہو۔ اِس معنیٰ میں کافر نہیں کہہ سکتا جس سے مقصود ملت اسلامیہ سے خارج ہو جانا ہے۔

میرے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا جائے۔ ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ بے جا تشدد ہوگا بلکہ ان کی جماعتی تقویت کا موجب ہوگا۔

ایک اور فتویٰ

پرانے کاغذوں میں مولانا کا ایک اور فتویٰ انہیں کے قلم سے لکھا ہوا مل گیا ہے۔ کسی نے سوال کیا تھا کہ نماز جمعہ کس قسم کی آبادی میں پڑھنا چاہیے؟ مولانا لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمان الرحیم　　　　الحمد للہ رب العالمین

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کے اقوال، مصر و قریہ کبیرہ کی تعریف میں حد درجہ مختلف ہیں اور کتب متداولہ فقہیہ میں کوئی متفق تعریف موجود نہیں۔ بعض کا قول ہے کہ مصر وہ ہے، جہاں ہر پیشہ ور سال بھر تک بلا احتیاج تغیر، اپنے پیشے کو جاری رکھ سکے: ان یعیش کل محترف بحرفتہ فیہ من سنۃ الیٰ سنۃ من غیر ان یحتاج الیٰ حرفۃ اخری (مضمرات) بعض نے صرف اس کو کافی

سمجھا ہے کہ وہاں ہر پیشے کے لوگ زندگی بسر کرتے ہوں۔ اور ہر پیشے سے مقصود ضروری پیشے ہیں: **ان یعیش فیه کل صنائع یصنعته** (ابوالمکارم) بعض نے کہا کہ دس ہزار آدمی ہوں (ابوالمکارم) بعض نے کہا کہ وہاں قاضی و مفتی ہو اور امیر ہو، جو احکام و حدود قائم رکھ سکے اور امام کرخی نے اسی کو اختیار کیا ہے (ہدایہ) ایک روایت یہ بھی ہے کہ اگر تمام آبادی کے وہ لوگ، جن پر جمعہ فرض ہے، اکٹھے ہوں، تو وہاں کی بڑی مسجد ان کے لیے کافی نہ ہو: **ممالا یسع اکبر مساجدہ اهله** (برخندی) پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ ''اکبر مساجد'' سے کیا مقصود ہے؟ بعض نے کہا کہ وہاں کی جامع مسجد لیکن زیادہ پسند تفسیر اس کی یہ سمجھی گئی کہ جو مسجدیں پانچ وقت کی جماعت کے لیے ہوں، ان میں سے بڑی مسجد کافی نہ ہو اور ایک جامع مسجد بنانے کی ضرورت پیش آئے: **لو اجتمعوا فی اکبر مساجدهم لا یسعهم حتی احتاجوا الی بناء المسجد الجامع** (برخندی) بعض نے کہا اتنے لوگ ہوں کہ اگر دشمن چڑھ آئے تو دفاع کر سکیں: **ان یکون بحال لو قصدهم عدو یمکنهم دفعه** (برخندی) سب سے زیادہ صاف اور سلجھی ہوئی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہاں انسان کے حوائج ضروریہ کے پورا کرنے اور حاصل کرنے کا سامان ملتا ہو، مثلاً کپڑا اور غلہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ کہاں تک اقوال نقل کیے جائیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس بارے میں سخت اختلاف واقع اور خود قدماء محققین حنفیہ کا مسلک متاخرین کی قیاس آفرینیوں میں مستور و مفقود۔ اسی اختلاف کو دیکھ کر بالآخر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو لکھنا پڑا کہ: **در بحث جمعه روایات فتاوی فی الواقع** (الخ)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصلی حقیقت اس مسئلے کی کیا ہے؟ تو اس بحث کو سردست نہ چھیڑیے۔ یہ بہت تفصیل طلب اور آپ کے لیے چنداں سودمند نہیں، مقصود اصلی ایک خاص موضع کے متعلق فقہا، حنفیہ رحمہم اللہ کا حکم معلوم کرنا ہے۔ سردست تعریف مصر کے طے کرنے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ فقیر نے حال میں ایک رسالہ، مقاصد جمعہ پر لکھا ہے اور اس میں یہ بحث بہ تفصیل مرقوم اور **الحمد لله** کہ تمام نزاعات و اختلافات کے لیے فیصلہ کن، وجوہ و غوامض اجتہاد ائمہ کے لیے کاشف و مبین۔ اگر اشاعت کی نوبت آئی تو ان شاء اللہ تمام رد و کد کے لیے تسلی بخش ہوگی۔

جس موضع کریم چک کا حال آپ نے لکھا ہے، وہاں مطابق احکام فقہ حنفی نماز جمعہ ضرور ہونی چاہیے اور ہرگز ہرگز اس عظیم ترین عبادت اسلامی و اہم ترین اجتماع دینی کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ آپ لکھتے ہیں کہ سو گھر مسلمانوں کے ہیں، علماء موجود ہیں، ضروریات و احتیاجات کے لیے دکانیں موجود،

حتیٰ کہ دوا دو یہ فروش تک وہاں موجود۔ یہ تمام باتیں اس کے لیے کافی ہیں کہ جس قریہ کبیرہ کا ہونا جمعہ کے لیے حنفیہ نے شرط قرار دیا ہے، اس کا اس پر پورے اطمینان کے ساتھ اطلاق کیا جائے۔

جوانی کی رنگین داستان

جیل میں مولانا جب اپنے حالات [18] لکھا رہے تھے، میرے دل میں گد گدی پیدا ہوئی کہ عہد شباب کی رنگینیاں بھی یاد کریں اور میں ان سے صفحۂ قرطاس کو آراستہ کرلوں۔ مزاج دان تھا اور انہیں پرچانے کا گُر جان گیا تھا۔ براہ راست مطالبہ وفرمائش کا مسترد ہو جانا معلوم تھا۔ اسی لیے کئی دن ٹالسٹائی اور روسو کی خودنوشت سوانح کا چرچا کرتا رہا۔ بار بار کہتا، کیسے نڈر تھے یہ لوگ کہ اپنا "کچا چٹھا" ہماری رہنمائی کے لیے چھوڑ گئے۔ پھر "تذکرہ" پر تبصرہ شروع کیا کہ مصنف نے اپنے حالات کچھ اس طرح لکھے ہیں کہ اسے نہ تیتر کہہ سکتے ہیں، نہ بٹیر۔ جرات کی کمی لفظ لفظ سے ظاہر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی شدید خوف ہے، جو قلم کو آگے بڑھنے نہیں دیتا۔

میری باتیں سنتے۔ کبھی مسکراتے، کبھی ہنستے، ایک دن کہنے لگے "مولوی صاحب میں سب سمجھ رہا ہوں! آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ ان ناگفتنی باتوں کو بھول جانا اچھا ہے، یا یاد رکھنا اور لکھ کر زندہ کر جانا؟"

لیکن میں پیچھے پڑا رہا۔ طرح طرح سے بہلاتا پھسلاتا، پرچاتا رہا۔ آخر راضی ہو گئے۔ فرمایا "بڑے ضدی ہیں آپ بھی۔ میری اس داستان سے آپ کا یہ شغف آپ کی طبیعت کے ایک ایسے گوشے کو اُبھار رہا ہے، جس سے میں بالکل بے خبر تھا!"

عرض کیا، مولانا اس قسم کی دھونسیں مجھے مرعوب نہیں کرتیں۔ آپ نے "تذکرہ" نہ لکھا ہوتا اور لکھا تھا، تو گول مول باتوں کی بھول بھلیاں میں پڑھنے والوں کو نہ ڈالا ہوتا۔ میں تو قارئین تذکرہ کی نمائندگی کر رہا ہوں! ہنسے اور دس بارہ دن میں اپنی طویل رنگین داستان لکھا دی لیکن دوسرے ہی دن یہ کہہ کر واپس بھی لے لی کہ نظر ثانی کرنا ہے۔ عرض کیا، مولانا میں سمجھ گیا۔ گئی ہمیشہ کے لیے یہ کہانی اور ہوا بھی یہی۔

کیونکر کہوں کہ اس داستان کو بھول گیا ہوں لیکن حقوق رفاقت کا تقاضہ ہے کہ جن باتوں کی اشاعت، مولانا کو گوارا نہیں ہوئی، انھیں کبھی زبان پر نہ لاؤں، حالانکہ ذاتی طور پر میں اس اخفا کا قائل نہیں ہوں۔ بزرگوں کی ٹھوکریں، چھوٹوں کے لیے نصیحتوں کا دفتر ثابت ہو سکتی ہیں۔

سیاسی مسلک

مولانا کو اٹھے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ان کے سیاسی مسلک پر بحث کی جائے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ پکے نیشنلسٹ اور ملکی آزادی و جمہوری نظام کے علم بردار رہے۔ ملک کی سیاست نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ بڑے بڑے لیڈر اِدھر سے اُدھر ہو گئے، مگر مولانا کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ ہمیشہ اپنے مسلک پر ڈٹے رہے اور اس راہ میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں وہ ظلم وستم بُردباری، خاموشی، ثابت قدمی سے جھیلے، جو انبیاء و مرسلین کو منکروں کے ہاتھوں جھیلنا پڑے تھے۔

لیکن یہ واقعہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ شروع شروع مولانا، تشدد پسند انقلابیوں کے ساتھ تھے اور ہندوستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف بنگال کے انقلابیوں سے تعلقات استوار تھے، دوسری طرف سرحد کے قبائل میں ان کے آدمی کام کر رہے تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم اور مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم سے بھی رشتہ مضبوط تھا اور خود ہندوستان بھر میں بیعت جہاد زور وشور سے جاری تھی۔

جب میں ان کی رفاقت میں ۱۹۲۰ء آیا، تو اس وقت تک مولانا، مسلح بغاوت ہی کے قائل تھے۔ ایک دفعہ خود مجھے ایک جگہ بھیجا تھا اور میں دو درجن پستول لے آیا تھا، جو انہوں نے کسی اور کے ہاتھ کہیں بھیج دیئے تھے، مگر اِسی زمانے میں ان کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور سمجھ گئے کہ ہتھیاروں کے زور سے انگریزوں کو نہیں نکالا جاسکتا۔ جیل میں جب ہم تھے، تو میں نے مولانا سے درخواست کی کہ اپنے سیاسی مسلک کی تشریح لکھ دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ سوال مرتب کرو۔ جواب میں لکھ دوں گا۔ میں نے سوال پیش کر دیئے۔ افسوس سوالوں کا مسودہ محفوظ نہیں رہا۔ مگر جواب میں مولانا کی تحریر محفوظ ہے، یہاں نقل کرتا ہوں:

۱۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ سوال قبل از وقت ہے۔ ابھی ہم نے سوراج کی ابتدائی منزلیں بھی سر نہیں کی ہیں۔ اس کی آخری منزل کے بارے میں بحث و گفتگو کرنا بالکل لاحاصل ہوگا۔

سوراج کے معنی ''اچھے راج'' کے ہیں۔ میرے اعتقاد میں اچھا راج وہی ہوسکتا ہے، جس میں دو شرطیں پائی جائیں: قومی ہو اور جمہوری ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان کی قدیم تاریخ میں جمہوری نظامِ حکومت کا کوئی سُراغ نہیں ملتا لیکن اسلام کی تمام روایات، تمام تر

جمہوریت پر مبنی ہیں، اس لیے بہ حیثیت مسلمان ہونے کے یہ قدرتی بات ہے کہ میں صرف جمہوری نظام ہی سے مطمئن ہوسکتا ہوں۔

۲۔ اِس بارے میں میرا جو خیال آج سے کئی سال پہلے تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہندوستان اِس طریقے پر چل کر ضرور آزاد ہوسکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر بردولی فیصلے کی یادگار غلطی نہ ہوئی ہوتی، تو ہمارا یہ پہلا تجربہ بھی بہترین فوری نتائج حاصل کرسکتا تھا۔

اس تجربے نے مجھے اور زیادہ نان وائیلنس نان کوآپریشن طریقے کی عملی صداقت کا یقین دلا دیا ہے۔ موجودہ حرکت عملاً ختم ہوچکی اور اب ملک کا کسی قدر ستانا ناگزیر ہے لیکن اگر اس کے بعد ایک قومی حرکت اسی اصول پر شروع ہوئی اور ان مرکزی اور انتظامی غلطیوں سے اجتناب کیا گیا، جو اِس مرتبہ ہوچکی ہیں، تو مجھے کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔

۳۔ بلاشبہ نان وائیلنس ان حالات میں ایک صحیح طریقہ ہے، جو ہندوستان اور ہندوستان جیسے ملکوں کے ہیں۔ باقی رہا ''نان وائیلنس'' کا اصول بہ حیثیت ایک اخلاقی اعتقاد کے، تو میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن اسی صورت میں جو قرآن نے پیش کی ہے اور اس تشریح کا یہ موقع نہیں۔ بعض حالتوں میں وائیلنس لا آف نیچر کی تعمیل ہے۔

۴۔ ہندو مسلم اتحاد یقیناً آج اس سے کہیں زیادہ موجود ہے، جتنے کی ۱۱۔۱۹۱۲ء میں میں امید کرتا تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اب تک اس درجے تک نہیں پہنچا کہ ہم اس پر پوری طرح اعتماد کرسکیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیال میں اب تک یہ ایک پالیسی سے زیادہ نہیں ہے۔ محض وقت کے مشترک حالات نے دونوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ ہزاروں مسلمان ہیں جنھیں اب تک ہندوؤں کی مجاریٹی سے دہشت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سِلف گورنمنٹ کے معنی ہندو گورنمنٹ کے ہوں گے۔ اسی طرح ہندوؤں کے دلوں میں بھی شمال کا خطرہ اب تک باقی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابدالی والی سڑک بند نہیں ہوئی ہے۔ جنسی تعصب کا اب تک سدّباب نہیں ہوا، چھوت کی ناقابلِ عبور خلیج اب بھی ہمارے ملنے میں حائل ہے، اس لیے سوراج کی اِس سب سے پہلی بنیاد کا کام کسی طرح بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ آئندہ سالہا سال تک ہمارے پروگرام میں سب سے پہلی چیز یہی رہنی چاہیے۔

البتہ میرا یقین ہے کہ کوئی حقیقی رکاوٹ اس کام میں حائل نہیں۔ دنیا کی قوموں سے کہیں زیادہ ہندو مسلمانوں میں دائمی اور حقیقی اتحاد ہوسکتا ہے، بشرطیکہ باہم دگر غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی انگلستان اور امریکا کی تاریخ اور لٹریچر حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس مذہب اور جماعت کو جاننے کی بالکل پروا نہیں کرتا، جو صدیوں سے اس کے ہمسائے میں موجود ہے۔

مجھے کس قدر حیرت ہوئی۔ جب میں نے سر رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک آرٹیکل ''فلاسفی آف انڈین ہسٹری'' دیکھا، جو ''ماڈرن ریویو'' میں نکلا تھا۔ اِس میں وہ اِس بات کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی بجائے خود معبود بن گئے ہیں، کرشن، مسیح اور چیتن کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یعنی کرشن اور مسیح کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں میں معبود کی طرح پرستش کیے جاتے ہیں! میں نے کہا کہ ہندوستان کا عظیم الشان شاعر امریکا کی سیاحت سے واپس آرہا ہے لیکن اسے ان لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی معلوم نہیں، جو خود اس کے گھر میں بستے ہیں! مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے، وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہتا۔ ایک دہقانی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اس کا پیغمبر، انسان تھا اور خدا کا ویسا ہی بندہ، جیسا وہ خود ہے، اسلام کا تو اصلی مشن ہی انسانی پرستش کو مٹا دینا ہے۔

اِسی طرح جب میں بنکم چندر چٹرجی کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو باوجود اس تعریف کے جو ان کے لٹریچر کی میرے دل میں ہے، ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری پر متعجب ہو کے رہ جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اُتنا ہی ناواقف ہے جتنا ایک امریکن۔ میں اس کے لیے ہندو بھائیوں کو ملامت نہیں کروں گا۔ بلاشبہ یہ مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اپنے آپ کو اچھی طرح واضح کر دیتے لیکن انہوں نے پوری طرح اس فرض کو انجام نہیں دیا۔

بہرحال مجھے ہندو مسلم اتحاد کی عملی حقیقت کا پورا پورا یقین ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ خیال سے تو اس میں کوئی روک بھی نہیں ہوسکتی، کیونکہ اسلام فی نفسہ ایک عالمگیر اور سب میں پھیلی اور بٹی ہوئی صداقت کا وعظ ہے۔ اس کی بنیاد ہی انسانی برادری اور مساوات پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مسلمانوں سے ہمیشہ التجا کرتا ہوں کہ وہ اس راہ میں خود پیش قدمی کریں۔ دوسرے فریق کی

پیش قدمی کا انتظار نہ کریں۔ میں گزشتہ دسمبر میں اس بات کا انتظام کر رہا تھا کہ ایک مرکزی انجمن صرف ہندو مسلم اتحاد کو ترقی دینے اور اس مقصد پر مفید لٹریچر تیار کرنے کے لیے قائم ہو جائے۔ میری گرفتاری سے کام رک گیا لیکن انتظامات جاری ہیں۔

ایک اور نہایت اہم بات ہے جس کی طرف مجھے اشارہ کر دینا چاہیے۔ اگر ہم ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مختلف صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روز بروز ایک نئی تفریق "پراونشیلوم" کی بڑھتی جاتی ہے۔ "مائی انڈیا" کی جگہ "مائی بنگال" کی صدائیں میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں۔ شاید کہا جا سکتا ہے کہ اور صوبوں کے مقابلے میں پراونشیلوم کا جذبہ بنگال میں زیادہ ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلٹی کے لیے سخت مضر ثابت ہوگی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انڈین نیشن کی کوئی قومی زبان اب تک نہیں ہے۔

۵۔ اِس کا مفصل جواب میں ایک رسالے میں دے چکا ہوں۔ جو گزشتہ سال چھپ چکا ہے لیکن اس موقع پر میں صرف اسی قدر کہوں گا کہ ہندوستان میں تیئس کروڑ ہندو ہیں اور سات کروڑ مسلمان۔ تیئس کروڑ ہندوؤں کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ اگر ایک لاکھ ترک یا افغانی پٹھان حملہ کر دیں، تو وہ اپنی حفاظت آپ کر سکیں۔ اگر اتنی طاقت ہم میں نہیں ہے، تو پھر واقعی سوراج کا خیال ہمیشہ کے لیے ترک کر دینا چاہیے۔

بعض اوقات مجھے بڑی ہی ہنسی آتی ہے جب میں اِس معاملے کو سوچتا ہوں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ڈر رہے ہیں اور دونوں کو اپنے اوپر اعتماد نہیں۔ مسلمان خیال کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی تعداد تین گنی زیادہ ہے۔ آزادی ملنے پر وہ مسلمانوں کو پامال کر دیں گے، اس لیے بہتر ہے کہ ہندوستان انگریزوں ہی کا غلام رہے۔ ہندو سوچتے ہیں کہ انگریزوں کے جاتے ہی خیبر کی بلندیوں سے پٹھان اُتر آئیں گے اور تمام ہندوؤں کو پامال کر دیں گے۔ اس لیے نجات اسی میں ہے کہ انگریز رہیں۔ دیکھئے، انگلستان کی یہ خوش قسمتی کب تک قائم رہتی ہے؟

۶۔ جہاں تک تعلق ہمارے موجودہ مقاصد کا ہے، نہ ایسا ہونا ضروری ہے اور نہ ہوتا نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ایک علیحدہ اور مستقل سوشل اور تمدنی مسئلہ ہے۔ اگر ہندوستان "سرمایہ" اور "مزدوری" کی اس عظیم الشان اور لاعلاج کشمکش سے بچنا چاہتا ہے جو بڑے بڑے کارخانوں کی بدولت یورپ میں پیدا ہو چکی ہے۔ تو بلاشبہ ابھی سے کوشش کرنی چاہیے کہ

محنت کو محدود کارخانوں میں روک دینے کی جگہ تمام قوم میں مشترک طور پر پھیلا دیا جائے اور اس کے لیے چرخے کا عام رواج یقیناً ایک عظیم الشان بنیاد ہو گی'' (انتہیٰ)

کیسی عجیب بصیرت تھی صوبہ پرستی اور زبان کے مسئلوں کی طرف مولانا نے جو اشارے کر دیئے ہیں، کیا آزادی کے بعد ہم انہی مسئلوں میں مبتلا نہیں ہیں؟

لیکن مولانا خاندان، تربیت، ماحول کی پابندیوں سے آزاد ہو جانے پر بھی بالکل آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ پیری مریدی کا جال توڑ سکے۔ مذہبی عقیدوں میں خاندانی تقلید کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں لیکن سیاسیات میں نیشنلزم اور مغرب زدہ جمہوریت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ کیمونزم کے برابر مخالف رہے۔ میں نے بارہا اصرار کیا کہ کیمونزم کا مطالعہ کریں مگر راضی نہ ہوئے۔ الہلال (دور دوم) میں ''کیمونسٹ مینی فسٹو'' کا خلاصہ تو شائع کرنے کی اجازت دے دی تھی مگر خود کبھی مطالعہ نہ کیا، اس لیے کہ کیمونزم ان کے مزاج، خاندانی روایات اور ماحول کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ بے شک عمر کے آخری دور میں سوشلزم تک آ گئے تھے، مگر یہ سوشلزم کانگریسی تھا، یا برٹش لیبر پارٹی کا، جو حقیقت میں سرمایہ داری ہی کا دوسرا نام ہے۔

تصانیف

مولانا کو قدرت نے حیرت انگیز ذہن و دماغ عطا فرمایا تھا، بلکہ یہ کہنا شاید صحیح ہو کہ قدرت نے خود اپنے ہاتھ سے ذہانت و فطانت کا ایک سانچہ تیار کیا اور صرف ابوالکلام کو ڈھال کے یہ سانچا توڑ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوالکلام، ذہانت و فطانت کے لحاظ سے بالکل منفرد اور انوکھی ہستی بنے رہے۔

بچپن ہی میں مولانا کا ذہن جاگ اٹھا تھا۔ جاگ ہی نہیں اٹھا تھا، جستیں مارنے لگا تھا۔ اس زمانے میں بھی لوگ ان کی تقریر و تحریر پر تعجب سے دانتوں میں انگلیاں دابنے لگے تھے۔ اس بارے میں ''آزاد کی کہانی'' پڑھیے اور حیرت میں ڈوب ڈوب جایئے''۔ آزاد کی کہانی'' میں خود مولانا کی زبانی جو کچھ روایت کر چکا ہوں، اسے یہاں دُہرانے سے یہ کتاب اپنی حدوں سے باہر نکل جائے گی لیکن ''آزاد کی کہانی'' میں جو تفصیل نہیں آئی ہے، اسے پیش کرتا ہوں۔

جیل میں مولانا سے عرض کیا کہ اپنی ابتدائی زندگی کی تالیفات کا بھی کچھ حال سنایئے۔ فرمایا لکھ کر جواب دوں گا۔ دوسرے دن مندرجہ ذیل تحریر میرے سپرد کر دی:

تصنیفات

علاوہ میگزینوں اوراخبارات کے آرٹیکل کے ۱۳ برس سے ۱۸ برس کی عمر تک

اعلان الحق

محمڈن لاء

احسن المسالک

صوفی ازم اور طریق ریاضت کے مختلف اسکولوں کی تشریح میں

دیوان غزلیات

شاعری

عمر خیام

بائیوگریفی اور ریویو

خاقانی

(فارسی شاعر) بائیوگریفی اور ریویو

ضوء غیر مرئی

(رانجن اکس ریز) سائنس

العلوم الجدیدہ والاسلام

اسلام اور ماڈرن سائنس

المرأۃ المسلمہ

اس میں عورتوں کے حقوق اور آزادی کے مسئلے پر بحث کی ہے اور آخر میں ثابت کیا ہے کہ

عورتوں کے بارے میں یورپ کی موجودہ آزادی اور مشرق کی قدیم سختی، دونوں قانون فطرت کے خلاف ہیں اور صحیح راہ درمیان کی ہے۔

الٰہیت

(اسٹرانومی) اس میں دکھلایا ہے کہ جدید اسٹرانومی کے تمام اصول مسلمان حکماء دریافت کر چکے تھے اور قدیم یونان، مصر اور ہندوستان کے عقائد کے برخلاف انہوں نے جدید نظام شمسی کے اصول تسلیم کر لیے تھے۔

المعتزلہ

(ناتمام)......اسلام کے فرقہ معتزلہ کی تاریخ

کشش مادہ اور کشش عشق

اس میں دکھلایا ہے کہ جس طرح عالم مادہ ہے اسی طرح جذبات کا عالم ہے اور دونوں کے قوانین یکساں ہیں۔

اسلامی توحید اور مذاہب عالم

اس میں دکھلایا ہے کہ اسلامی توحید کی جغرافیائی فتوحات سے اس کی روحانی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور گو ابتدا میں پیروان مذاہب نے اس سے تغافل کیا لیکن بتدریج یورپ اور ایشیا کے مذاہب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ مسیحیت میں رفارمیشن اور لوتھر کی تحریک کا ظہور ہوا، جس نے قدیم لاطینی ترجمہ قرآن کا مطالعہ کیا تھا اور ہندوستان میں بابا نانک اور کبیر کی تحریک اسلامی نفوذ ہی کا نتیجہ ہے۔ پھر یہی چیز راجہ رام موہن رائے اور دیانند سرسوتی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور برہموسماج اور آریہ سماج کی بنیاد پڑی۔ آخر میں مسلمانوں سے التجا کی ہے کہ وہ اس کا خیر مقدم کریں۔

چہار مقالہ

شاعری کے بعض مباحث میں

فرہنگ جدید

لغت کی تحقیق میں

۱۸ برس کی عمر کے بعد

قانون نشو و ارتقا اور قرآن...... اس میں دکھلایا ہے کہ نشو و ارتقاء (Evolution) کو ڈارون اور ویلس نے انیسویں صدی میں معلوم کیا ہے۔ اسے مڈل ایجز میں مسلمان حکماء نے منتہائے تحقیق تک پہنچا دیا تھا۔ ڈاروِن، ویلس، اسپنسر اور جرمن فلاسفر نیٹشے کے قدم مادیات کی آخری سرحد تک پہنچ کر رک گئے ہیں لیکن مسلمان حکماء کا دائرہ ارتقا اس سے کہیں وسیع تر ہے پھر واضح کیا ہے کہ خود قرآن نے اس کو اصل نظام کائنات بتلایا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ انسانی اعمال کی جزا و سزا اور قوموں کی حیات و ممات اسی قانون پر مبنی ہے۔ مادیات کی طرح افکار و اعمال میں بھی ایک معنوی تنازع للبقا (اسٹرگل فار اگزسٹنس) اور انتخاب طبیعی یعنی نیچرل سلیکشن جاری ہے اور بقاء اسی عمل و فکر کے لیے ہے جو اصلح ہو۔ پس سچائی کامیاب ہوگی اور باقی رہے گی۔ فساد و بطلان چھانٹ دیا جائے گا اور اسی کا نام عذاب ہے۔ آخر نیٹشے کے سپرمین آئیڈیا پر بحث کی ہے اور پھر دکھلایا ہے کہ نیٹشے وہاں تک نہ پہنچ سکا جہاں تک اسلام نے "انسان کامل" اور "بہترین امت" کے آئیڈیا کو پہنچایا۔

خصائص مسلم: مسلم زندگی کا کیرکٹر حسب تصریحات قرآن۔

القول الثابت: اس میں مذہب اور عقل کی باہمی آویزش پر بحث کی ہے اور دکھلایا ہے کہ سائنس کی حد محسوسات ہے اور مذہب کی ماورائے محسوسات۔ اسی لیے دونوں کا دائرہ نظر و علم الگ ہے اور دونوں میں اصلاً کوئی نزاع نہیں۔ البتہ نزاع اس وقت ہوتی ہے جب پیروان مذہب، مذہب کے نام سے جہل و توہمات کا علم اٹھا لیتے ہیں۔ ترتیب اس کی یوں ہے کہ پہلے ڈاکٹر جان ویلیم ڈریپر کی "کانفلکٹ بیٹوین ریلیجن اینڈ سائنس" پر نظر ڈالی ہے اور دکھلایا ہے کہ ڈریپر نے جن چار مسائل کو مابہ النزاع قرار دیا ہے وہ اصل مذہب کے نہیں ہیں، بلکہ صرف مسیحیت کے اور وہ بھی اصلی مسیحیت کے نہیں بلکہ رومانی پوپ ازم کے۔ قرآن و اسلام کی تعلیم ان سے بالکل صاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مقابلہ مسیحیت نے سائنس کا کیا وہ اسلامی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔ اس کے بعد پھر مبادیات مذہب یعنی وجود صانع اور مسائل ذات و صفات اور مسئلہ انفصال و انجذاب روح پر بحث

کی ہے اور آخر میں دکھلایا ہے کہ قرآن کی کوئی تعلیم، عقل کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام تر عقل اور عقل سے کام لینے کی ایک دعوت ہے، جو کہتی ہے کہ قانون نیچر ہی کا دوسرا نام، سچا مذہب ہے۔ اس کی تعلیم کے دو حصے ہیں، اعمال اور عقائد۔ اعمال انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے تمام تر مطابق عقل ہیں۔ عقائد ماورائے مادیات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے وہ ماوراء عقل ہیں۔

اتحاف الخلف: اس میں دکھلایا ہے کہ خدا کی ذات وصفات کا ادارک ہم بذریعہ عقل نہیں کر سکتے لیکن اس کا اعتراف ہماری فطرت میں موجود ہے اور جذبات کا صحیح اغراق ہمیں اس تک پہنچا سکتا ہے۔ پھر دکھلایا ہے کہ اس بارے میں مذہب جس عجز و بیچارگی کا اقرار کرتا ہے، بعینہ یہ اقرار فلسفہ وعقل کی راہ میں بھی کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ تمام قدیم وجدید فلاسفہ کو بھی کدوکاوش کے بعد یہی اعلان کرنا پڑا کہ ہمیں جو معلوم ہوا ہے وہ صرف یہی ہے کہ ”کچھ معلوم نہیں“ سائنس کا استقراً بھی صرف ترکیب وتفرید مادہ تک علم کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی بجز لاادری کے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پس ماوراء محسوسات کے لیے علوم وحی اور علوم عقلیہ دونوں ایک ہی نقطہ پر پہنچتے ہیں، فرق صرف اس قدر ہے کہ مذہب ایک جانے بوجھے شخص کی طرح پہلے ہی دن اس کا اعتراف کر لیتا ہے لیکن عقل جب تک حیران وسرگرداں نہیں ہو جاتی، اقرار نہیں کرتی۔

البرہان: اس کا موضوع یہ ہے کہ جن دلائل فطریہ سے قرآن نے کام لیا ہے، ان سب کو یکجا کر کے دکھلایا جائے کہ قرآن کا طریق استدلال کیا ہے۔ چنانچہ اس میں واضح کیا ہے کہ سائنس کے استقرائی علوم کو الگ کر دینے کے بعد (کیونکہ وہ نفیاً یا اثباتاً مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے) انسانی معلومات آج تک جو کچھ معلوم کر سکی، اس کی اونچی سے اونچی سرحد بھی صرف شک، ظن اور تخمین پر جا کر ختم ہو جاتی ہے لیکن مذہب حق وخالص جو کچھ بتلاتا ہے اس کی سب سے پہلی سرحد ہی یقین سے شروع ہوتی ہے۔ پس نوع انسانی کے سامنے دو مدّعی کھڑے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میرے پاس زیادہ سے زیادہ شک ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس کم سے کم یقین ہے۔ انسان کو کس کی طرف جھکنا چاہیے؟ شک کی دعوت کے آگے یا یقین کی دعوت کے آگے؟ یہی قرآن کا سب سے بڑا استدلال ہے۔

الدین الخالص: اس میں واضح کیا ہے کہ اسلام کی نسبت سب سے بڑی غلط فہمی دنیا میں یہ پھیل گئی ہے کہ یہ کوئی نیا مذہب ہے جو دوسرے مذاہب والوں کو ان کے مذاہب سے بالکل الگ کر کے اپنا حلقہ بگوش بنانا چاہتا ہے، حالانکہ ایسا سمجھنا قرآن کے ہر صفحے کو جھٹلانا ہے۔ قرآن

کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی طرح، خدا کی سچائی بھی دنیا کے لیے ایک ہی ہے۔ اس سچائی کا علم انسان کو اس کی ابتدائے آفرینش سے دیا گیا تھا لیکن مختلف اسباب سے (جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے) اس نے اس سچائی کو طرح طرح کی غلطیوں اور غلط عقیدوں اور عملوں سے آلودہ کر دیا۔ پس اس ابتدائی سچائی کے قیام و ذکر کے لیے مختلف وقتوں میں مختلف سچے انسان پیدا ہوتے رہے اور لوگوں کو اس کی طرف بلاتے رہے۔ دنیا کا کوئی حصہ اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے، جہاں حسب بیان قرآن، خدا کے سچے اور پاک انسان نہ پیدا ہوئے ہوں لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ ان کی تعلیم چند صدیوں تک صاف و خالص رہی لیکن پھر خود غرض مذہبی پیشواؤں اور انسانی عقل کی گمراہیوں سے محرف ہو ہو گئی۔ ہر چیز کی طرح مذہب بھی قانون ارتقاء کے مطابق ترقی کرتا رہا ہے۔ پس بالآخر جب نوع انسانی کے ذہنی ارتقاء کی تکمیل کا دور آیا، تو ضرورت ہوئی کہ سب کو اس عالمگیر اور حقیقی صداقت کے قیام کی دعوت دی جائے اسی اصلیت کا نام "اسلام" ہے۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ تمام مذاہب کے پیرو اپنے اپنے یہاں کی ملاوٹ اور آلودگیوں کو چھوڑ کے اصلی سچائی کو دوبارہ قائم کر دیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو پالیں گے کہ اصلیت وہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ پس قرآن کوئی نیا مذہب نہیں پیش کرتا، بلکہ نوع انسانی کو اس کی مشترک اور عالمگیر راہ حق کی طرف بلاتا ہے۔

الحریت فی الاسلام: اسلام اور انسانی آزادی...... اس میں دکھلایا ہے کہ اسلام نوع انسانی کو اس کی چھنی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا ہے۔ حریت و مساوات اس کے قومی نظام کی اصلی بنیاد ہے اور ان دونوں سچائیوں پر اس نے اس قدر زور دیا ہے کہ ایک مسلمان مسلمان ہو کر کبھی غلامی پر قانع نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اسلام اور آزادی لازم و ملزوم ہیں۔ پھر بہ تفصیل واضح کیا ہے کہ یورپ نے انقلاب فرانس کے بعد جس آزادی کا سراغ پایا، وہ تیرہ سو برس پہلے عرب میں قائم ہو چکی تھی۔ اسلام نے جو قومی نظام قائم کیا ہے وہ ایک خالص جمہوری (ری پبلک) نظام ہے اور فرانس اور امریکا کی ناقص جمہوریت سے زیادہ مکمل اور اصلی۔ وہ "پادشاہ" کے وجود اور کسی ارسٹوکریٹ طبقے کو تسلیم نہیں کرتا۔ "خلیفہ" صرف ایک پریسیڈنٹ ہے اور بلا ملک کی اجازت کے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ مختلف ابواب میں واضح کیا ہے کہ اسلام کا نظام حکومت کیا ہے۔

احرار اسلام: یعنی تاریخ اسلام کے ان سرفروشوں کی بائیوگرافی جنھوں نے سچائی اور آزادی کی راہ میں ہر طرح کی دنیاوی تکلیفیں برداشت کیں۔ اس ضمن میں قرآن وحدیث کے وہ تمام حصے جمع کیے ہیں جن میں حق پرستی اور حق پرستی کی راہ میں جان تک قربان کر دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔

سیرۃ ابن تیمیہ: ایک بڑے مسلمان عالم کی لائف

الدین القیم: اس کا موضوع نہایت ہی اہم ہے اور علم و مذہب، دونوں کے مباحث میں ایک نئی راہ کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس میں دکھلایا ہے کہ خدا ایک ہے، تو ضرور ہے کہ اس کے تمام کاموں میں یگانگت اور توحید ہو۔ پس اس کا قانون حیات بھی ہر گوشے اور خلقت میں ایک ہی ہے۔ البتہ ہم نے نادانی سے اس کے بہت سے نام رکھ دئیے ہیں۔ پھر علم ہیئت، ریاضی، ہندسہ، موسیقی، طب، علم الحیات، سائیکالوجی وغیرہ علوم کے حقائق پر بحث کر کے دکھلایا ہے کہ سب کے اندر ایک ہی حقیقت کام کر رہی ہے، اگرچہ ہر دائرے میں ایک نئے نام سے پکاری جاتی ہے۔ پھر آخر میں بتلایا ہے کہ وہی ایک حقیقت جب انسانی عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے تو مذہب اس کو کس نام سے موسوم کرتا ہے؟

جامع الشواہد: اس میں دکھلایا ہے کہ غیر مسلموں کو مسجد میں داخل کرنا اور مسجد کی مجالس میں شریک کرنا جائز ہے۔

تذکرہ: آٹو بایوگرافی

تاریخ دعوت اسلام: اس میں دکھلایا ہے کہ قانونِ ارتقاء کے بموجب خدا کے تصور اور اعتقاد میں بھی ارتقاء ہوا ہے اور آخری اور بے داغ تصور وہ ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور جو تمام تر محبت ہے۔

خلافت و جزیرۃ العرب: مطالبہ خلافت کی تشریح

ترک موالات: نان کوآپریشن کیا ہے؟

ہندوستان اور افغانی حملہ: اگر افغانستان حملہ کر دے تو ہندوستانی مسلمانوں کا از روئے مذہب کیا فرض ہوگا؟

ترجمان القرآن: ترجمہ قرآن

تفسیر البیان فی مقاصد القرآن: یہ سب سے اہم اور جامع کتاب ہے اور میری تمام فکر و نظر کا آخری نتیجہ ہے۔

مقدمہ تفسیر: غیر مکمل مسودات ترک کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار آرٹیکل ہیں جن میں اکثر چار چار پانچ پانچ نمبروں میں شائع ہوئے ہیں اور اگر کتاب کی صورت میں جمع کئے جائیں تو دس بارہ جلدیں ہو جائیں گی۔

پرہیزگار قیدی

جیل میں مولانا کی خدمت کے لیے ایک مسلمان قیدی دیا گیا تھا۔ نام تو یاد نہیں لیکن بظاہر تھا نیک اور پرہیزگار آدمی۔ منہ پر بڑی سی کھچڑی داڑھی، گلے میں موٹے دانوں کی تسبیح، ماتھے پر سجدے کا گھٹا۔ محنتی تھا اور مولانا کا معتقد ہو گیا تھا۔

ایک دن مولانا ہی کے اشارے سے میں نے پوچھا، میاں صاحب آپ جیل کیونکر پہنچے؟ اب اس کی عبرت انگیز کہانی سنئے۔ آہ بھر کر کہنے لگا:

چار لڑکیوں کا باپ ہوں۔ عمر بھر غریب رہا۔ لڑکیاں جوان ہوتی چلی گئیں۔ بڑی فکر تھی انہیں اٹھا دینے کی۔ کوئی راہ نہ نکلی تو سوچا افیم کلکتہ لے جاؤں اور روپیہ کماؤں۔ پہلی کھیپ کامیاب رہی۔ کسی نے ٹوکا تک نہیں اور بڑی لڑکی کی شادی، دھوم سے ہوگئی۔ میں بھی خوب جانتا تھا کہ یہ دھندا، گناہ کا ہے۔ مگر دل نے کہا خدا غفور ورحیم ہے۔ توبہ کرلوں گا اور وہ کریم بخش دے گا۔ آبرو کا معاملہ تھا لڑکیوں کو بیاہنا تھا۔ خدا کی ستاری پر بھروسہ کر کے مجبوراً میں نے یہ کاروبار شروع کر دیا۔

طریقہ یہ تھا کہ میں افیم کو کمر میں باندھ لیتا۔ ریل میں بڑے سائز کا قرآن مجید اپنی گود میں رکھ لیتا اور زور زور سے ہل ہل کر پڑھتا رہتا۔ آبکاری والے آتے۔ سب کی تلاشی لیتے، مگر مجھے تلاوت میں غرق دیکھ کر میرے پاس بھی نہ آتے۔ اس طرح میں ہر چھٹے مہینے کلکتے کا پھیرا کرتا رہا اور خدا کی مہربانی سے تین لڑکیاں اُٹھ گئیں۔ اب چوتھی اور آخری کا معاملہ تھا۔ دل نے کہا بچہ سنتے ہو۔ ابھی تک تو اللہ نے عزت بچائی ہے۔ شکر ادا کرو، مگر دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ اب کی پکڑے جاؤ، بہتر یہ ہے کہ توبہ کرلو۔ خدا پر توکل کرو۔ وہ مسبب الاسباب ہے لیکن شیطان نے اطمینان دلایا کہ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اس لڑکی کو بھی نپٹا دو۔ پھر توبہ کر لینا اور باقی عمر اللہ اللہ کرنے میں گزار دینا!

شیطان کا داؤں چل گیا اور میں افیم لے کر کلکتہ روانہ ہوا۔ بردوان آیا اور آبکاری کے کارندے ڈبے میں داخل ہوئے۔ میرا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اپنی ساری

قوت و ہمت جمع کی اور زیادہ سے زیادہ طاقت سے ہلنا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر تلاوت شروع کر دی۔ آبکاری والوں نے مسافروں کی تلاشی لی، میں کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ان کی نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ میں نے دیکھا کہ انہی کا ایک آدمی میری طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہہ رہا ہے کہ بیچارہ درویش ہے۔ قرآن پڑھ رہا ہے، اسے نہ چھیڑو۔ مگر ایک مسٹنڈے نے لپک کر قرآن میری گود سے چھین لیا۔ تلاشی ہوئی اور افیم پکڑی گئی...... اب میں ہوں اور یہ جیل ہے خدا جانے میری وہ لڑکی کس حال میں ہے!

مولانا کی رہائی

اب مولانا کی مدت قید ختم ہو رہی تھی۔ سال ہی بھر کی تو تھی لیکن مجھے ابھی جیل میں رہنا تھا۔ دو برس کی سزا ہوئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ شریف حسین کے ذریعہ حجاز اور حرمین شریفین پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شریف کی بغاوت کا شباب تھا کہ میں مصر سے حج کرنے گیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انگریز فوجی افسر اپنی وردیوں پر عربی جبے پہنے مکہ میں بلکہ خود حرم میں آزادی سے پھر رہے ہیں، ترکوں کی مکمل شکست کے بعد حجاز انگریزوں کا ہو چکا تھا۔ اگرچہ دکھانے کو بادشاہ شریف حسین بن علی تھا۔

جیل میں مولانا اس صورت حال سے بہت پریشان تھے اور حجاز کی آزادی کے لیے بے قرار۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہ اسکیم طے پائی کہ ہندوستان سے ایک عربی رسالہ نکالا جائے، وہ اسلامی دنیا کو حقیقت حال سے آگاہ کرے اور تدارک کی راہ دکھائے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلم ممالک از حد مرعوب تھے۔ نفسا نفسی کا عالم تھا، ہر ملک کو صرف اپنی پڑی تھی اور دوسرے ملکوں سے حتیٰ کہ مرکز اسلام حجاز سے بھی اسلامی دنیا بے پروا ہو چکی تھی۔ عرب ممالک یا تو برطانیہ اور فرانس کے قبضے میں آ چکے تھے یا ان کے اثر میں تھے لیکن عام رائے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ضرورت تھی کہ اسلامی ممالک میں عام رائے پر اثر ڈالا جائے۔ انگریزوں اور شریف حسین کے خلاف اسے اُبھارا جائے۔ یقین تھا کہ عام رائے ہموار ہو گئی، تو انگریزوں کے چنگل سے حجاز کو نجات مل جائے گی۔

عرب میں صرف ایک ہی طاقت ایسی تھی، جو شریف مکہ سے ٹکر لے سکتی تھی۔ یہ طاقت نجد کے سلطان ابن سعود کی تھی۔ ابن سعود بھی انگریزوں کے اثر میں تھا اور بظاہر شریف حسین کے پاسنگ

برابر بھی نہ تھا، مگر میں عرب ملکوں کے حالات سے اور ابن سعود کی سیاست وقوت سے بخوبی واقف تھا ،اس لیے مجھے پوری امید تھی کہ عرب ممالک کی عام رائے جب شریف کے خلاف نکھر جائے گی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے نام سے مناسب موقعہ پر ابن سعود کو اُبھارا جائے گا، تو وہ شریف کا خاتمہ کر ڈالے گا اور شریف کے خاتمے کے ساتھ حجاز بھی انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے گا۔

الجامعہ

چنانچہ طے پایا کہ ''الجامعہ'' کے نام سے عربی رسالہ کلکتے سے جاری کیا جائے۔ میں اسے ایڈٹ کروں اور خلافت کمیٹی اس کا خرچ برداشت کرے۔ میرے رہا ہوتے ہی پرچہ جاری ہو گیا۔ مگر عجیب اتفاق کہ پہلے نمبر کی ترتیب واشاعت کے وقت مولانا دورے پر تھے اور میں ڈر رہا تھا کہ مولانا کو پرچہ کہیں ناپسند نہ ہو لیکن پرچہ پسند آیا۔ ملتان سے اپنے خط میں لکھتے ہیں:

أخ العزیز السلام علیکم

لکھنؤ میں دستی خط ملا تھا۔ وہاں سے آگرہ آ گیا۔ آگرہ کا قصد تھا نہ ضرورت لیکن ایسی صورت پیش آ گئی کہ گئے بغیر چارہ نہ تھا۔ وہاں سے لاہور آیا اور لاہور میں ''الجامعہ'' دیکھا۔ مجھے رسالے کی ترتیب اور مجموعی ہیئت کی طرف سے تشویش تھی لیکن بحمد اللہ کہ وہ بلا وجہ ثابت ہوئی۔ نہایت خوش اسلوبی سے آپ نے یہ کام انجام دے دیا، البتہ طباعت کی غلطیاں اور حروف کا التباس جا بجا ہے۔ خصوصاً ''ذ'' اور ''د'' کا التباس اور مرکب الفاظ کے حروف کی تقدیم و تاخیر۔ آئندہ زیادہ غور کے ساتھ پروف دیکھئے گا، تو غلطیاں کم رہیں گی۔

اب بڑی دقت دوسرے نمبر کی ہے۔ یہ میرا سفر گو آخری ہے لیکن قصد اور توقع سے زیادہ طویل ہو گیا۔ خیال تھا کہ نو دس تک واپس پہنچ جاؤں گا لیکن اب بمشکل ۱۵، ۱۶ تک واپس ہو سکتا ہوں۔

''نہیں معلوم ملتان سے کب رہائی ہو اور اس کے بعد لاہور میں پنجاب کا جھگڑا کب چکے؟ بڑی دقت یہ پیش آ گئی ہے کہ مجھ سے پہلے پنڈت نہرو اور مسٹر داس پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک ترتیب عمل شروع کر چکے ہیں۔ میں اس ترتیب کو اب بدل نہیں سکتا اور وہ نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ فیصلے سے بہت دور کر دینے والی ہے۔ بہر حال ارادے سے زیادہ قیام کرنا پڑے گا''۔

لکھنؤ، آگرہ اور لاہور میں بے انتہا کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح لکھنے کا موقع ملے لیکن بالکل نہیں ملا، حتیٰ کہ آگرہ کے متعلق ایک مختصر بیان پریس میں دینے کی بھی مہلت نہ نکل سکی۔ لوگ کسی ترتیب و

تنظیم کے عادی نہیں ہیں۔ رات کو ایک بجے دو بجے سونے کی مہلت ملتی ہے اور پھر صبح سے جلسے اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ نیند کے اوقات کے مختل ہو جانے کی وجہ سے دماغ کام نہیں دیتا۔

بہرحال کوشش کر رہا ہوں کہ چند ضروری چیزیں لکھ کر بھیج دوں۔ آپ بددل اور پریشان نہ ہوں۔ اگر مضمون نہ بھیج سکا، تو مجبوراً دوسرے نمبر کی تاخیر گوارا کر لیجیے گا۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر آئندہ نمبر پہلی مئی کو ڈبل نکلے۔ اس کے بعد پھر ایسی صورت پیش نہ آئے گی۔ جوں ہی یہ سفر ختم ہوا، میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہوں گا۔

مولانا کے اس خط سے مجھے واقعی خوشی ہوئی تھی۔ مولانا کا ذوق ایسا تھا کہ کسی چیز کو ان کا اچھا کہہ دینا۔ اس کے اچھے ہونے کا ثبوت تھا۔ اخبار نویسی کے تو وہ امام ہی تھے۔ کمپوز اور طباعت کی خامیوں کا انہوں نے جو تذکرہ کیا ہے بجا ہے لیکن اردو طباعت میں یہ خامیاں موروثی اور فطری بن چکی ہیں۔ اِن سے بچاؤ تقریباً محال ہے۔

الجامعہ انقلابی پرچہ تھا۔ اس کے مضامین میں آگ بھری ہوتی تھی۔ چند ہی نمبر نکلے تھے کہ اسلامی دنیا میں آگ بھڑک اُٹھی اور ہر طرف سے شریف حسین کی طرف لپکی۔ یہ دیکھ کر شریف بوکھلا گیا۔ بڑا مغرور اور مغلوب الغضب آدمی تھا۔ اپنی پوزیشن بھی بھول گیا اور اپنے سرکاری اخبار القبلہ میں الجامعہ کو بازاری گالیاں دینے لگا۔ القبلہ معمولی اخبار تھا۔ مگر اسے لکھنے والے بہرحال پڑھے لکھے لوگ تھے لیکن الجامعہ کے خلاف اس میں جو کچھ چھپتا نہایت رکیک عربی میں ہوتا تھا۔ میں شریف کی دو تین تقریریں مکہ میں سُن چکا تھا، اِس لیے مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ تحریریں خود شریف اپنے قلم سے لکھتا ہے، یا بول کر لکھا دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ شریف حسین مولانا ابوالکلام کو "ابوالکلاب" لکھا کرتا تھا!

مولانا کا عتاب

الجامعہ کا دوسرا نمبر بھی مولانا کی غیر حاضری میں مرتب ہوا۔ اِس نمبر کے لیے میری درخواست پر میرے استاد، علامہ سیّد رشید رضا مرحوم نے مصر سے مضمون بھیجا تھا۔ موصوف، عرب تحریک کے ایک بڑے لیڈر تھے اور ترکی غلامی کے مخالف۔ میں نے ان کا مضمون شائع کر دیا لیکن مولانا کو علامہ کے مضمون اور میرے تعارفی نوٹ پر سخت اعتراض ہوا۔ لاہور سے ۹ را پریل کے خط میں لکھتے ہیں:

اَخِ العزیز السلام علیکم

اِسی وقت آپ کا خط ملا اور اِسی وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ نے دوسرا نمبر نکالنے کے لیے جو اہتمام کیا، اس نے آپ کی مستعدی کا نقش میرے دل پر ثبت کر دیا لیکن ساتھ ہی اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ سید رشید رضا کا مضمون آپ رسالے میں شائع کر رہے ہیں اور بالکل محسوس نہیں کرتے کہ اِس کے نتائج کیا ہوں گے؟

لکھنؤ میں جب آپ کا خط آیا اور آپ نے سید کے مضمون کا حال لکھا، تو میں سمجھا تھا کہ انہوں نے اتحادیوں[19] کے خلاف شکایتیں کی ہوں گی اور نوٹ میں ان کا جواب دے دینا کافی ہوگا اِسی لیے لکھا تھا کہ کمپوز کرا لیجئے۔ کلکتہ آ کر دیکھوں گا اور نوٹ کے ساتھ شائع ہو جائے گا لیکن اب اصل مضمون دیکھتا ہوں تو دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے۔ نہ صرف متفرنجین ترک بلکہ اثنائے جنگ کی عثمانی گورنمنٹ پر سخت الزامات لگائے ہیں، الحاد اور تشریع ترکی کا ملزم ٹھہرایا ہے۔ حاکمیۃ ملیۃ کو (جو اس وقت بھی انگورا کی طاقتور پارٹی ہے) ہادم خلافت بیان کیا ہے۔ جمال پاشا کے فرضی مظالم کا اعادہ ہے۔ تورہ حجاز کے بے طبیعی ہونے کا ادعا ہے اور بہ حیثیت مجموعی اُتنی ناتمام حق گوئی بھی نہیں ہے، جتنی "حقائق جلیہ" وغیرہ مقالات المنار میں تھی۔ تعجب ہے کہ الجامعہ کے دوسرے نمبر میں آپ یہ مضمون شائع کر رہے ہیں اور اس نوٹ کو کافی سمجھتے ہیں جو ابتدا میں درج کیا گیا ہے۔ نوٹ میں آپ ان واقعات اور ان کے طریق استدلال کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ ترک اور عرب، دونوں نے ایسا کیا ہے اور ان کا مقصود، تمام ترکوں کا عام الحاد نہیں ہے بلکہ بعض کا۔ ہر شخص اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ الجامعہ ان کے تمام افکار سے متفق اور تمام بیان کردہ واقعات کا مصدّق ہے صرف عام و بعض کی توجیہ ضروری سمجھتا ہے۔ نیز تُرکوں کی طرح عرب بھی اس کے نزدیک جنسیت کے ملزم ہیں۔

علاوہ بریں آپ نے لکھا ہے کہ...... (کرم خوردہ، غالباً تُرکوں میں) جدید مدنیہ ملعونہ سے جنسیت پیدا ہوئی۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

"غور کیجئے اگر اِس مضمون کا ترجمہ ہندوستان میں اخبارات شائع کر دیں، تو مسئلہ خلافت کی تحریک پر کیا اثر پڑے گا؟ جدید انقلابِ خلافت کے بعد سے تمام یورپین اخبارات تو یہی کہہ رہے ہیں کہ ینگ ترک ملحد ہیں۔ اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اِسی کی ایک شہادت آپ نے بھی دے دی، ایسی شہادت جس میں یہاں تک لکھا ہے کہ اباحوالھتک وکذا فجور النساء المسلمات

عام مسلمانوں پر اِس کا کیا اثر پڑے گا؟ ہندوستان کے علماء تو پہلے سے نوجوان ترکوں کے خلاف مستعد ہو رہے ہیں''۔

''خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجئے اور یہ مضمون شائع نہ کیجئے۔ دوسرا نمبر شائع نہ ہو۔ مضائقہ نہیں لیکن ایک نیا فتنہ نہیں پیدا کرنا چاہیے اور نہ اباطیل واکاذیب کی اشاعت میں حصہ لینا چاہیے۔ یہ فرض نہیں ہے کہ ان کا بھی مضمون ضرور شائع ہو۔ اگر وہ پسند کریں گے، کوئی اور تحریر بھیج دیں گے۔ نہیں بھیجیں گے، تو ان کی مرضی۔

بہر حال اب اِس کے سوا چارہ نہیں کہ ابتدا کا ایک فارم بدل دیا جائے اور اس میں کوئی مضمون دے دیا جائے۔ اگر اور کوئی مضمون نہ ہو تو پھر ایک نمبر ''حکم حمل سلاحِ علی المسلم '' کا دے دیجئے۔ اِس مرتبہ میں کلکتہ پہنچ جاؤں اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہوں، پھر ان مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

گاندھی جی کی تصویر پر جو الفاظ مدح و توصیف کے لکھے ہیں، مثلاً: القدرة فی حیاته ، طاهر الذیل . نقی القلب یہ بھی سخت اعتراضات کا موجب ہوں گے۔ خدارا اِن چیزوں میں احتیاط و حزم سے کام لیجئے صرف ''قائد حرکہ ہندیہ سلمیہ'' اور نام کافی ہے۔ امید ہے کہ نئے فارم میں اِس کا لحاظ رہے گا۔

میں جانتا ہوں کہ یہ تاخیر آپ پر بہت شاق گزرے گی لیکن کیا کروں، اس معاملے میں مجبور ہوں۔ سید رشید رضا کا مضمون کسی حال میں بھی قابل اشاعت نہیں ہے۔ یا تو لَوح پر سے میرا نام الگ کر دیجئے یا یہ مضمون شائع کیجئے۔

اگر فارم بدل کر رسالہ شائع نہ کر سکیں، تو میرا انتظار کریں۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ ڈبل نمبر نکالا جائے۔

فارسی مضمون کے لیے پریشان نہ ہوں اور نہ ''اسرار بے خودی''[20] وغیرہ چھاپ کر رسالے کو مضحکہ انگیز بنائیں۔ سب باتیں اپنے وقت پر ہو جائیں گی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ رسالے کی ضخامت دو جُز رکھی جائے۔ کم کر دی جا سکتی ہے۔

میں اِس سفر میں بے طرح پھنسا۔ بے کار وقت گیا۔ امید ہے کہ پرسوں یعنی سنیچر کو روانہ ہو سکوں گا۔

قتل کی دھمکی

الجامعہ نکل رہا تھا کہ بمبئی سے کچھ حجازیوں نے گم نام خط لکھے کہ ہمارے بادشاہ کو گالیاں دیتے رہتے ہو۔ کلکتہ آ کر ہم تمہیں مار ڈالیں گے! میں نے یہ خط مولانا کو دکھائے، تو انہوں نے چہرہ ایسا بنا لیا، جیسے نہایت خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ چہرہ بدل لینے میں مولانا کو کمال حاصل تھا۔ پھر دہشت زدہ لہجے میں کہنے لگے "مولوی صاحب، یہ تو بہت بری بات ہوئی۔ حجازی بڑے نڈر اور اُجڈ ہوتے ہیں۔ کیوں نہ اعتدال سے لکھیے!" مولانا کے دل کی حالت میں خوب جانتا تھا۔ سمجھ گیا کہ مجھے ٹٹول رہے ہیں۔ نہ سمجھتا تو بھی وہی کہتا، جو ایسے موقع پر کہنا چاہیے تھا۔ عرض کیا، اِس قسم کی دھمکیاں مجھ پر ذرا اثر نہیں کرتیں! یہ سنتے ہی مولانا کا چہرہ اصلی حالت پر آ گیا۔ فرمانے لگے "آپ کو آزما رہا تھا!"

مولانا کو اس وقت کیا معلوم تھا کہ بعد میں اِسی اخبار نویسی کی لمبی زندگی میں قتل کی کتنی دھمکیاں سہیں اور کئی دفعہ قاتلانہ حملوں کا بھی نشانہ بننا پڑا، مگر بحمد اللہ اصول پر استقامت میں فرق نہ آیا۔

تحریک صحیح تھی اور بروقت۔ جلد ہی کامیاب ہوگئی۔ خلیج فارس سے مراکش تک پوری اسلامی دنیا میں شریف مکہ کے خلاف ہلچل مچ گئی، مگر ابن سعود انگریزوں کے خوف سے پس و پیش کر رہا تھا۔ الجامعہ نے مسلمانانِ ہند کے نام سے اسے ابھارا اور اس وقت کی بین الاقوامی سیاست واضح کر کے بتایا کہ انگریز، شریف حسین کی مدد نہیں کر سکتے۔ آخر ابن سعود نے حرکت کی اور حجاز سے شریف حسین اور اس کے خاندان کو مار بھگایا۔ حرمین کی آزادی کے بعد الجامعہ کی ضرورت باقی نہ رہی اور اسے بند کر دیا گیا۔

ایک ناگوار واقعہ

اِسی زمانے کا ذکر ہے کہ مولانا نے رپن اسٹریٹ کا مکان چھوڑ دیا، جس کا کرایہ غالباً ڈیڑھ سو تھا اور نمبر ۱۱۔ بالی گنج سرکلر روڈ میں اُٹھ آئے، جس کا کرایہ پانچ سو تھا، کیوں چھپاؤں؟ دل میں چبھن پیدا ہوئی کہ میرے لیے تو روپیہ نہیں ہے، مگر بے ضرورت اتنا بڑا گھر لے لیا ہے!

پھر مولانا کی زبان سے ایک بات سن کر ماتھا ٹھنکا۔ پھاٹک سے ملی ہوئی مالی کی کوٹھڑی تھی۔ یہ جگہ دکھا کر فرمایا، پریس کی مشینوں کے لیے شیڈ ڈال دیں گے۔ کوٹھڑی سے متصل کمرے بنا دیئے جائیں گے اور وہ اخبار کے کاتبوں اور عملے کے کام آئیں گے۔ اندیشہ ہوا کہ مجھے تو کہیں اس

آخور جگہ پھینکنا نہیں چاہتے، مگر معاد دل نے ملامت کی محض وسوسہ ہے۔ چھوٹے گھروں میں الگ رہنے نہیں دیا، تو اتنے بڑے گھر میں ایسا کیوں کرنے لگے لیکن جب کمرے بن گئے تو مولانا کے سالے، بدرالدین مرحوم نے پیغام پہنچایا کہ نئی جگہ اُٹھ جاؤ!

اِس بارے میں میرا رقعہ اور اس کی پشت پر مولانا کا جواب پُرانے کاغذوں میں مل گیا ہے۔ میں نے لکھا تھا:

''بدرالدین صاحب سے معلوم ہوا کہ جناب نے فرمایا ہے نیا کمرہ تیار ہو گیا ہے اور میں وہاں چلا جاؤں لیکن مالی والی کوٹھری نہ اب تک خالی ہوئی ہے نہ اس کی کھڑکی درست ہوئی ہے۔ اول تو اس کمرے کو بذاتہ میں پسند نہیں کرتا لیکن وہاں رہنے پر تیار ہو گیا ہوں، مگر مالی کے پڑوس میں رہنا میرا دل کسی طرح گوارا نہیں کرتا۔ اگر اِس گھر والے کمرے کا فوراً خالی کر دینا ضروری ہے اور سر دست مالی اپنی کوٹھری سے ہٹ نہیں سکتا، تو عارضی طور پر میں کہیں اور منتقل ہو سکتا ہوں۔ امید ہے میرے احساسات کا، اگرچہ کتنے ہی غلط ہوں، کچھ نہ کچھ ضرور خیال کیا جائے گا۔ میں اپنے گھر میں یا جہاں کہیں خود اپنے قیام کا انتظام کروں، اچھی بُری ہر قسم کی جگہ مجبوراً رہ سکتا ہوں، مگر یہاں آپ کے یہاں، ایسا نہیں کر سکتا۔ مدت سے برتاؤ کی تبدیلی محسوس ہو رہی ہے، مگر میں جہاں تک قدرت رکھتا ہوں، برداشت کرتا رہوں گا۔''

مولانا کا جواب ملاحظہ ہو:

''استغفر اللہ، یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک نیا قضیہ پیدا ہو جائے۔ خدا کی قسم میرے وہم و گمان میں بھی آج تک یہ مسئلہ نہیں آیا کہ آپ وہاں چلے جائیں۔ خود بدرالدین نے آ کر کہا کہ وہ کہتے ہیں، وہ کمرہ تیار کر دیا جائے، تو میں جاؤں گا۔ نیز دروازے پر چک کے لیے بھی کہتے ہیں''۔ میں نے کہا کہ ہاں مکان تو کب کا تیار ہو چکا ہے۔ چک منگوا دو، بہر حال میرا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ آپ ''ناگواری'' (انورٹڈ کامے مولانا کے ہیں) کے ساتھ وہاں قیام نہ کریں۔ مالی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ جگہ دروازے کے پاس ہی رہے گی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ کوئی بات بھی میری خاطر ناگواری سے کریں۔ اِسی بدرالدین نے جھوٹ سچ آ کر مجھ سے کہا کہ نہیں آپ وہاں قیام کریں گے، حالانکہ میں نے مکان کی جستجو کے ــــ لیے کہہ دیا تھا، جو خود آپ ہی کی تجویز تھی۔ جب تک مکان کا انتظام نہ ہو، یہ تمام کمرے حاضر ہیں، آپ یہاں قیام کیجئے۔ ہرگز ہرگز یہاں سے تبدیلی مطلوب نہیں ہے۔''

ننگے سر

مولانا کا جواب، ظاہر ہے، تلخ تھا۔ میں نے غصے میں طے کرلیا کہ اچھی بات ہے۔ مالی کے پڑوس ہی میں رہوں گا۔ مولانا میری دلجوئی کے لیے اکثر آجاتے تھے۔ دستور تھا کہ میں مولانا سے ملنے ان کے کمرے میں جاتا، تو ٹوپی پہن کر، ورنہ ننگے سر رہتا۔ ایک دن مولانا میرے "کمرے" میں آئے۔ میں بدستور ننگے سر تھا اور ان کی زبان سے یہ سُن کر حیرت میں پڑ گیا کہ مشرقی تہذیب میں ننگے سر رہنا درست نہیں حالانکہ خود مولانا بھی اکثر ننگے سر ہی رہتے تھے اور اِس وقت بھی تھے۔

اِس "کمرے" میں مجھے بہت دن رہنا نہیں پڑا، کیونکہ بدرالدین کی بیماری بہت بڑھ گئی تھی، مرحوم مکان کی نچلی منزل میں رہتے تھے اور ان کی تیمارداری مشکل تھی۔ مولانا، بیماریوں کے باب میں بہت محتاط تھے۔ بیمار کے پاس نہیں جاتے تھے۔ یہ بُری بات بھی نہ تھی۔ خود میں بھی بیماریوں سے ڈرتا ہوں اور مجبوراً ہی تیمارداری کرتا ہوں۔ بدرالدین کے والد، بوڑھے تھے اور سروے آفس میں ملازم۔ دن بھر غائب رہتے۔ پھر سودا سلف لانا بھی انہی کے ذمے تھا اور وہ بھی بیمار کے پاس کم ہی آتے تھے۔

آخر جب بدرالدین کی حالت بگڑ گئی، تو مجھ سے کہا گیا کہ بیمار کے کمرے میں اُٹھ آؤ۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا، مگر ابھی تک دل میں پھانس موجود تھی۔ میں نے کہا، جب تک خود مولانا مجھ سے خواہش نہیں کریں گے، اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گا۔ آخر مولانا کو کہنا پڑا اور میں بدرالدین کے کمرے میں آکر ان کی خدمت میں مشغول ہوگیا۔

پیام

انہی دنوں روزانہ اخبار نکالنے کی کھچڑی پکی اور "پیام" نام تجویز ہوا لیکن مشکل یہ سامنے آئی کہ اخبار کا ایڈیٹر مجھی کو ہونا تھا اور میں ابھی تک انگریزی پر قابو نہیں پا سکا تھا، اِس لیے ایک اچھے انگریزی داں کی ضرورت تھی، جو خبروں کا ترجمہ بھی کرے اور انگریزی اخباروں کے ایڈیٹوریل وغیرہ کا خلاصہ مجھے بروقت سنا دیا کرے۔

ابھی تک اردو اخبار رائٹر وغیرہ خبر رساں ایجنسیوں کی خبریں نہیں لیتے تھے اور انگریزی اخباروں سے خبریں ترجمہ کرلیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں "نئی روشنی" (الہ آباد) کے ایڈیٹر،

مرحوم واحد یار خاں صاحب کلکتہ میں مصیبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ''نئی روشنی'' روزنامہ تھا اور اس دور میں بہت اچھا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ خود مولانا بھی اس کے مداح تھے۔ واحد یار خاں صاحب، اصل میں انجینئر تھے اور ان کا بیان تھا کہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کی عمارت انہی کے ہاتھوں تیار ہوئی تھی۔ لکھ پتی تھے، مگر قومی خدمت اور اخبار نویسی کے ''جنون'' میں مبتلا ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام دولت کھو بیٹھے اور اب کلکتہ میں فاقوں پر گزر بسر تھی۔ (یہ بات بہت بعد میں معلوم ہوئی۔ نہایت اعلیٰ انسان تھے اور اپنی مصیبت ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے)۔

میں نے مولانا سے مرحوم کا تذکرہ کیا، تو خلاف عادت، مولانا خوشی سے اُچھل پڑے اور فرمایا، ان سے بہتر آدمی ملنا ممکن نہیں! فوراً معاملہ طے کر لو۔

واحد یار خاں سے تذکرہ ہوا، تو اِس شریف آدمی نے معاوضہ قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور کہا، آنریری کام کریں گے۔ میں نے اسی وقت مولانا کو خبر کی۔ کاتب تو پہلے سے رکھے جا چکے تھے۔ طے ہو گیا کل سے اخبار نکلے گا۔

واحد یار خان یہ سن کر چلے گئے۔ اب رات آئی۔ بدرالدین مرحوم بیماری کی شدت سے رات بھر سوتے نہیں تھے اور میں خدمت میں مصروف رہتا تھا۔ کوئی چار بجے کا پھیرا ہو گا کہ ہم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ مکان کا فرش پتھر کا تھا۔ دفعتاً ایک قیامت سی برپا ہو گئی اور ہم دونوں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پورا ایک فوجی دستہ گھر میں گھسا چلا آتا ہے۔ یقین ہو گیا، پولیس ہے اور مولانا کو، یا مجھے، یا دونوں کو گرفتار کرنے کے لیے آدھمکی ہے۔ چٹ پٹ میں چارپائی سے کودا اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلا، اور بجلی کا بٹن دبایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ واحد یار خاں چلے آ رہے ہیں اور ان کے پیچھے دو تین مزدور سروں پر جھوے اُٹھائے ہیں!

میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی ''ارے آپ!'' بات یہ تھی کہ خاں صاحب کے جوتے کے تلوں میں فوجی بوٹوں کی طرح کیلیں جڑی ہوئی تھیں اور خاں صاحب اپنی پوری قوت اور مکمل بے پروائی سے سنگی فرش پر رواں دواں تھے!

میری چیخ کے جواب میں بڑی معصومیت سے فرمانے لگے ''آدمی جب کام کا ذمہ لے لے، تو پوری ذمہ داری اور پوری توجہ سے اس پر ٹوٹ بھی پڑے!'' عرض کیا، یہ مزدوروں پر کیا لدا ہوا ہے؟ فرمانے لگے، انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا اور تمام مستند ڈکشنریاں! مولانا تو تین چار بجے رات سے بیدار ہو جانے کے عادی تھے۔ یہ ہنگامہ سن کر چپکے سے گھر کی عقبی سیڑھی سے اپنے نچلی منزل کے

کمرے میں آ گئے اور گھنٹی بجائی۔ میں پہنچ گیا۔ نمایاں پریشانی سے پوچھا، یہ نیچے کیا قیامت برپا تھی؟ عرض کیا، واحد یار خاں کے جوتوں کی کرامت تھی! خوش ہوئے۔ کہنے لگے، بڑا مستعد آدمی ہے۔ اب اخبار کی کامیابی یقینی ہے!

صبح چھ بجے سے پہلے ہی انگریزی اخبار آ گئے اور یہ حضرت اپنے کام آلات حرب یعنی انسائیکلو پیڈیا اور ڈکشنریوں سے مسلح ہو کر ایڈیٹر کے کمرے میں متمکن ہو گئے۔ اب مولانا بھی مطمئن تھے اور میں بھی مطمئن، غیر مطمئن ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ایک بڑے روزانہ اخبار کا قابل ایڈیٹر، خبروں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ خیال کیا معنے، حق الیقین تھا کہ دس بجے دن سے پہلے ہی پورے اخبار کی خبریں تیار ہو جائیں گی۔ مولانا، ایڈیٹوریل لکھ رہے تھے اور میں نوٹ تیار کر رہا تھا۔

نو بجے ہیڈ کاتب نے آ کر خبریں طلب کیں۔ میں نے کہا، واحد یار خاں سے تم نے کیوں نہ لیں؟ کہنے لگا، نہ جانے کتنی دفعہ جا چکا ہوں، مگر یہی کہے جاتے ہیں، ذرا ٹھہرو! میں نے کہا، بھائی تم جاؤ۔ سب خبریں تیار ہوں گی۔ لے لو۔ کاتب ذرا دیر بعد پھر لوٹ آیا اور کہنے لگا، وہ تو فرماتے ہیں، ابھی تک ایک خبر بھی نہیں ہوئی! اب تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ مولانا کو اطلاع دی تو فرمایا، کاتب جھوٹا ہے۔ آپ خود جا کر دیکھیے۔

میں پہنچا، تو دیکھا، واحد یار ننگے سر انتہائی پریشانی و حیرانی کے عالم میں ڈکشنریوں وغیرہ پر ٹوٹے پڑے ہیں۔ عرض کیا خاں صاحب کیا بات ہے؟ فرمایا "صاحب عجیب و غریب مشکل سے دوچار ہوں۔ یہ دیکھیے، چین کی خبر ہے نا؟ اس میں دو لفظ ایسے آ گئے ہیں، جو صبح سے اب تک کسی طرح سمجھ میں نہ آ سکے۔ عرض کیا، کون سے لفظ ہیں؟ فرمایا "ضرور اخباروں میں چھاپے کی غلطی ہو گئی ہے۔ یا رپورٹر سے سہو ہو گیا ہے۔ خبر میں ایک لفظ یا جملہ تو یہ ہے "سن یٹ سن" اور دوسرا لفظ یا جملہ ہے "انڈر گراؤنڈ مومنٹ" آپ خود ہی بتائیے یہ سن یٹ سن کیا بلا ہے اور "انڈر گراؤنڈ مومنٹ" یعنی "زمین دوز حرکت" کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ انسائیکلو پیڈیا چھان ماری، تمام ڈکشنریاں کھنگال ڈالیں مگر دونوں معمے ہنوز لاینحل ہیں!"

یہ سن کر مجھ پر ایسی حیرت چھائی کہ نہ پہلے کبھی ہوئی تھی نہ بعد میں کبھی ہوئی۔ اس ناامیدی کا اندازہ کرنا بھی لوگوں کے لیے مشکل ہے، جس سے اس وقت دوچار ہونا پڑا۔ سنبھل کر عرض کیا، خاں صاحب، آپ بہت تھک گئے ہیں۔ آرام کیجیے۔ چائے بھیجتا ہوں۔ مولانا کو یہ عجیب ماجرا سنایا، تو ایک لحہ کے لیے تعجب میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا "معلوم ہو گیا، ایڈیٹر ہونا الگ بات ہے اور مترجم ہونا الگ بات۔

پھر کہنے لگے، اخباروں میں اعلان ہو چکا ہے کہ "پیام" آج نکلے گا مگر اب کیونکر نکل سکتا ہے؟ بڑی رسوائی ہوگی! عرض کیا، ابھی وقت ہے۔ میں خود انگریزی نہ جاننے پر خبروں کا ترجمہ کیے دیتا ہوں اور ہوا بھی یہی۔ پانچ بجے شام سے پہلے اخبار، بازار میں پہنچ گیا اور بہت مقبول ہوا لیکن بعض اسباب سے اخبار چل نہ سکا اور تھوڑے ہی دنوں بعد بند ہو گیا۔

ڈاکٹر اقبال، ملک الشعراء

لیکن اِس زمانے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ مصری شاعر احمد شوقی پاشا کو عرب ملکوں نے "امیر الشعراء" کا خطاب دیا تھا۔ اِس پر مولانا کو خیال ہوا کہ ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ملک الشعراء بنا دیا جائے۔ ایک دن صبح مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے مخالفت کی۔ متعجب ہو کر فرمایا، کیا ڈاکٹر اقبال اِس خطاب کے اہل نہیں ہیں؟ عرض کیا، ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ کمالات کے مبصر آپ ہیں۔ مجھے شاعری سے ذوق نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب، محض شاعر ہی نہیں ہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں اور ہم ان کی سیاسیات کے مخالف ہیں۔ ملک الشعراء بن کر وہ سیاسی فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں"

مولانا، سوچ میں پڑ گئے اور میں کہتا رہا "اخبار کے مالک آپ ہیں اور جو تجویز چاہیں پیش کر سکتے ہیں لیکن جب تک ایڈیٹر میں ہوں، اپنے ضمیر کے خلاف کسی تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میرا نام ایڈیٹری سے الگ کر دیا جائے۔ اِس کے بعد بھی اخبار کی خدمت جاری رکھوں گا"

یہ سن کر مولانا نے ہاتھ کے کاغذ پھاڑ ڈالے اور فرمایا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں یہ تجویز پیش نہیں کرنا چاہیے"۔

مولانا، بااصول اخبار نویس تھے اور اپنے اخبار کے ایڈیٹر کی رائے کا احترام کرتے تھے۔

میری مصیبت

الجامعہ اور "پیام" کے بند ہو جانے کے بعد یہی نہیں ہوا کہ مولانا کے ہاں میرا کوئی کام نہیں رہا، بلکہ جو حقیر رقم مجھے ہر مہینے ملا کرتی تھی، وہ بھی بند ہو گئی اور تقریباً تین برس بند رہی۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ باہر کام کی کمی نہ تھی، مگر ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مولانا سے کہوں، مجھے جانے دیجیے۔ معلوم تھا کہ خود مولانا، مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اور کچھ نہیں دے سکتے۔ ایسی صورت میں

علیحدگی کا مطلب یہ ہوتا کہ تنگ دستی میں ساتھ نہ دوں لیکن ساتھ دینے میں مصیبت یہ تھی اپنے گھر روپیہ کہاں سے بھیجوں۔

وضع کیسے نبھی؟ میں نے لاہور کی ایک بک ایجنسی کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابوں کے ترجمے شروع کر دئے۔ اس کام سے اتنی آمدنی ہوتی رہی کہ ایک قلیل رقم ماہ بماہ گھر بھیج سکا۔

پرانے کاغذوں میں مولانا کا ایک خط ملا ہے۔ خط پر ۳۰ جولائی ۱۹۲۵ء کی تاریخ درج ہے۔ مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے اپنی بے کاری اور بے روزگاری کی شکایت کی ہوگی۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

عزیزی! کئی باتیں بالکل صاف ہیں:

۱۔ کام شروع ہونے میں اس قدر دیر نہیں، جتنی آپ سمجھتے ہیں۔

۲۔ میرا خیال یہی ہے کہ آپ ایک عزیز کی طرح میرے ساتھ ہیں اور یہ بالکل ٹھیک ہے کہ کام نہ ہونے کی صورت میں بھی مجھے آپ کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔ میری جانب سے اِس لیے اِس میں سستی ہوئی کہ میں نے دیکھا آپ نے تھوڑا بہت باہر کا کام جاری رکھا ہے۔

۳۔ میں ۳۰ روپیہ آپ کو کل بھیج دوں گا۔ اگست کے خاتمے میں بھی آپ ۳۰ اپنی لازمی ضروریات کے لیے لے لیں اور اگر ستمبر میں کام نہ شروع ہو تو اس میں بھی۔ یہ ضروری ہے کہ اکتوبر سے زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔ یہ بھی اِس صورت میں کہ میں باہر جاؤں، ورنہ ستمبر سے اجراء لازمی ہے۔

۴۔ کام شروع ہونے پر آپ کے لیے اس سے زیادہ رقم قطعاً ہونی چاہیے، جو پچھلے دنوں آپ لیتے رہے لیکن کیا آپ اِس کے یقین کے لیے وقت اور مجھ اعتماد کریں گے؟"

مشغولیت نہ ہونے کی وجہ سے میری پریشانی قدرتی تھی۔ غالباً اِسی زمانے میں میرے کسی رقعے کے جواب میں ذیل کی سطریں لکھ بھیجیں:

اخ العزیز! کل آپ سے باتیں ناتمام رہ گئیں۔ دن کو دو بار دریافت کیا لیکن معلوم ہوا کہ آپ باہر ہیں۔ دوپہر کو آپ آئے لیکن شوکت صاحب کا جھگڑا چل رہا تھا۔ باتیں نہ ہو سکیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے خیالات لکھ کر مجھے دے دیں اور میں ان کا جواب لکھ کر آپ کو دے دوں۔ آپ نے کل دریافت کیا تھا کہ میرے کاموں کی صورت کیا ہوگی؟ غالباً آپ کا مقصد یہ

ہے کہ صاف صاف معلوم اور طے ہو جائے کہ اب آپ کے تعلق اور مشغولیت کی نوعیت کیا ہے؟ اگر یہی ہے، تو جو کچھ آپ کے پیش نظر ہو، آپ خواہ زبانی خواہ بذریعہ تحریر بتلا دیں تا کہ حالت منتظرہ باقی نہ رہے۔

چندر نگر کی سیر

ایک دن بیٹھے بیٹھے مولانا نے ٹیکسی طلب کی اور مجھ سے اور فضل الدین مرحوم سے فرمایا کہ چلو، ذرا باہر چلیں۔ فضل الدین نے سوال کیا، کہاں؟ جواب میں قرآن کی یہ آیت پڑھ دی:

لاتسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسوکم .

ایسی باتیں نہ پوچھو کہ ظاہر کر دی جائیں تو تمہارے لیے کوفت کا سبب بن جائیں۔

ہم ٹیکسی میں سوار ہو گئے اور مولانا نے سکھ ڈرائیور سے کہا، ہوڑہ پھر لطائف وظرائف کا دفتر کھل گیا۔ سردار جی بار بار مڑ مڑ کے مولانا کو دیکھتے اور نہ جانے کیا سوچ کے چپ رہ جاتے۔ آخر ضبط نہ ہوا اور کہنے لگے ''یہ عربی فارسی بولی ہے؟'' اس پر خوب ہنسی ہوئی۔

ہوڑہ آیا، تو مولانا نے کہا، ہگلی پھر چندر نگر۔ یہ مقام اس زمانے میں فرانس کا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے ایک بڑا ہوٹل تھا۔ ٹیکسی روکی گئی اور ہم سب ہوٹل میں جا بیٹھے۔ سامنے قریب کی میز پر دو انگریز موجود تھے۔ کچھ پی رہے تھے۔ فوجی افسر معلوم ہو رہے تھے!

ہمیں دیکھ کر ایک انگریز نے ناک بھوں چڑھائی اور اونچی آواز سے ہندوستانیوں کو برا کہنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے مولانا نے محسوس کیا کہ بدتمیزی کر رہا ہے اور فضل الدین سے کہا کہ ترکی بہ ترکی جواب دو۔ ہم نے سنا کہ انگریز ہندوستانیوں کو ''ڈرٹی سوئین'' (غلیظ سور) کہہ رہا ہے فضل الدین نے چلا کر جواب دیا ''انگریز، بدتہذیب وحشی ہوتے ہیں۔ کتوں کی اولاد ہوتے ہیں!'' اس پر وہ انگریز لپک کر آیا اور فضل الدین کے منہ پر گھونسہ مارا۔ دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ مولانا اطمینان سے بیٹھے رہے۔ میں چپکے سے اٹھا اور انگریز کے دونوں پاؤں پکڑ کے اپنی طرف کھینچ لیے۔ دھڑام سے چت گرا اور ہم نے اچھی طرح مرمت کی۔ ہوٹل والے بیچ بچاؤ کرنے دوڑے، مگر مولانا کی ڈانٹ نے انہیں آگے بڑھنے نہ دیا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ دوسرا انگریز، میز پر چپ چاپ بیٹھا ٹکر ٹکر دیکھتا رہا اور ذرا مداخلت نہ کی۔ پھر ہم باہر ...

کپڑے درست کیے۔منہ پونچھا۔پھر مسکرا کر ہماری طرف بڑھا،معذرت کی اور ہاتھ ملا کر اپنے ساتھی کے پاس لوٹ گیا۔

واپسی میں مولانا نے فضل الدین کی پیٹھ ٹھونکی اور مجھے بناتے رہے ''مولوی صاحب اس وقت میں دیکھ رہا تھا کہ آپ کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور چہرہ دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح سفید! کس منہ سے خود کو پٹھان کہتے ہیں''

سردار جی ہماری باتیں سن رہے تھے۔مڑ کر مولانا سے کہنے لگے ہم سے تم نے نہ کہا کہ...... کا بھیجا نکال دیتے!

مدراسی بابا

غالباً ۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ نیو مارکیٹ (کلکتہ) کے ایک پھاٹک پر بیٹھے بیٹھے ایک دیوانے کا انتقال ہوگیا۔اس آدمی کو لوگ ''مدراسی بابا'' کہتے تھے۔کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ اس کی ذات یا مذہب کیا ہے؟ لیکن ہنگامہ پسند جاہل مسلمانوں کی بن آئی اور انہوں نے شور مچا دیا کہ مرنے والا، مسلمان تھا، مجذوب تھا، ولی اللہ تھا اور اسی جگہ دفن کیا جائے گا، جہاں واصل بحق ہوا ہے، حالانکہ اس جگہ زمین کے اندر گندگی کا پائپ موجود تھا، مگر شور مچانے والوں کو اِس کی پروانہ ہوئی۔سستی شہرت کے بھوکے انسان عمائدِ، عوام کے لیڈر بن گئے اور کارپوریشن کے مقابلے میں ''مجاہد'' مسلمانوں کی صفیں کھڑی ہوگئیں۔

دیش بندھو سی،آر،داس،کلکتہ کے میئر تھے۔شہید صاحب سہروردی لیڈری کے میدان میں نئے نئے آئے تھے اور ڈپٹی میئر تھے۔عجیب مشکل معاملہ تھا۔مارکیٹ کے پھاٹک میں قبر بنانا، خلاف قانون تھا لیکن مسلمان سر پر کفن باندھے جہاد فی سبیل اللہ کے نعرے لگا رہے تھے۔آخر مسلمان جیتے اور دیوانے کی قبر نے پھاٹک پر قبضہ کرلیا۔

مسٹر سی،آر،داس اِس واقعہ سے بہت پریشان تھے اور بار بار مولانا کے پاس آتے تھے۔قبر بن جانے کے بعد ایک صحبت میں مولانا نے مجھے بھی شریک کیا۔اور میں نے عرض کیا، معاملہ آسان ہے۔قبر ہٹائی جاسکتی ہے اور مسلمانوں کے ہنگامے سے بھی محفوظ رہا جاسکتا ہے پھر اس کی صورت یہ بتائی کہ میں ملیح آباد سے کچھ آدمی بلالوں گا۔وہ رات کے سناٹے میں چپ چپاتے لاش نکال کر کسی قبرستان میں دفن کردیں گے اور کسی فرضی نام سے اشتہار نکال دے جائیں گے

کہ "مدراسی بابا" نے روحانی طور پر خبر دی ہے کہ مسلمانوں نے ہماری بے حرمتی کی تھی اور ہمیں پیشاب کے نالے پر دفن کر دیا تھا لیکن خدا کی مدد سے ہم اس ناپاک جگہ سے اُٹھ گئے ہیں اور اب فلاں جگہ اپنی قبر میں آرام کر رہے ہیں!

مولانا یہ تجویز سن کر پہلے تو ہنسے پھر فرمایا، جہلا پر یہ داؤ چل تو سکتا ہے۔ سی، آر، داس بھی متفق ہو گئے، مگر مولانا دوراندیش تھے۔ کہنے لگے "لیکن شہید سہروردی بھی بیچ میں ہے۔ خطرناک آدمی ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا" اور تجویز مسترد ہو گئی۔

مولانا کے گھر میں کتا پالا گیا!

ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ مجھے کتے پالنے کا شوق ہے دنیا میں دو قومیں ایسی ہیں، جن کا تقریباً ہر فرد اپنے پاس کتا ضرور رکھتا ہے: انگریز اور افغان۔ افغانی نسل ہونے کی وجہ سے میں بھی اِس "گناہ" میں مبتلا رہا ہوں اور مبتلا ہوں، جس پر مجھے کوئی ندامت نہیں لیکن مولانا کے گھر میں بھلا کتے کی یہاں رسائی؟ مگر شوق سے مجبور ہو کر عرض کیا کرتا تھا، ایک کتا کیوں نہ رکھ لیا جائے اور مولانا جواب دیا کرتے "مولوی صاحب، آپ مجھے کیوں کیچڑ میں گھسیٹنا چاہتے ہیں! ہندوستان بھر کا مولوی بلبلانا شروع کر دے گا کہ دیکھو، آزاد بھی کتے پالنے لگے!"

مگر قدرت میرے ساتھ تھی۔ ایک رات مولانا کی کوٹھی میں چور آیا۔ نہ جانے کیا کیا لے گیا، مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ خود مولانا کی خواب گاہ میں بھی گھسا۔ مولانا بے خبر سو رہے تھے۔ چور نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ کچھ اور تو ملا نہیں، سگریٹ کیس اُڑا لے گیا۔

میں کوٹھی کی نچلی منزل میں رہتا تھا۔ چور کے آنے جانے کی خبر تک نہ ہوئی، صبح واقعہ معلوم ہوا۔ گھر بھر بہت ڈرا سہا ہوا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ چور آیا تھا اور اب روز آ سکتا تھا۔ مولانا بھی کچھ گھبرائے ہوئے ضرور تھے۔ صبح کی چائے پر میں نے جان بوجھ کے چوروں کی خونخواری کے مَن گھڑت قصے سنائے۔ مولانا نے فرمایا، تو کسی چوکیدار کو رکھ لیا جائے۔ گورکھا کیسا رہے گا؟ میرا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ عرض کیا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ خود چوکیدار ہی چوری کرتے ہیں، یا چوروں سے مل کر چوری کرا دیتے ہیں۔ گورکھے تو خاص طور پر بدنام ہیں! اور فرض کیجئے، ایماندار چوکیدار مل جائے، تو آدمی ہے۔ سو جا سکتا ہے!

یہ سن کر مولانا کی آنکھیں پریشانی سے کچھ پھٹ سی گئیں، فرمانے لگے۔"تو مولوی صاحب، پھر کیا کیا جائے؟" عرض کیا، معاملہ نہایت پیچیدہ ہے۔ چور گھر کو دیکھ چکا ہے۔ کسی نے اسے چیلنج نہیں کیا۔ جب چاہے گا گھسا چلا آئے گا!

اب تو مولانا کی بے بسی قابل دید تھی۔ سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے"تو مولوی صاحب، اب کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے بھی اپنا پارٹ خوب ادا کیا۔ دیر تک سر جھکائے رہا۔ گویا بڑے سوچ میں پڑا ہوں، مولانا سے صبر نہ ہو سکا۔ بول اٹھے"مولوی صاحب آخر کچھ تو کہیے!" اب میں نے عرض کیا، مولانا میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔ ہاں بس ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے، مگر وہ صورت آپ کو منظور نہیں۔ مولانا بے تابی سے تقریباً چیخ اٹھے"آخر وہ صورت کیا ہے، جو مجھے منظور نہیں؟" میں نے دبی زبان سے کہا "کتا!"

بے اختیار ہنس پڑے اور فرمایا"اب یقین ہو گیا کہ آپ بڑے کائیاں بھی ہیں اور بڑے ضدی بھی! لیکن واقعی اب کتے کے سوا چارہ بھی نہیں۔ آپ بندوبست کریں مگر یہ بات طے ہے کہ کتا، احاطے میں رہے گا۔ مکان کے اندر دھما چوکڑی نہیں مچائے گا!"

مجھے اپنی"فتح مندی" پر خوشی ہوئی۔ آخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ ایک مہتر کو ہدایت کر دی اور وہ ایک دوغلی بل ٹیریر پلیا لے آیا۔ پانچ روپے میں سودا ہو گیا۔ اور میں نے کمال شفقت و مستعدی سے پرورش کی۔ شاندار کتی نکلی۔ کوٹھی کی بالائی منزل میں مولانا رہتے تھے اور نیچے کی منزل میں کتی کلیلیں کرتی پھرتی تھی۔ لکھنے پڑھنے اور بیٹھک کے کمرے نیچے تھے۔ کتی تمام کمرے سونگھتی پھرتی تھی۔ پہلے تو مولانا جز بز ہوئے اور حکم دیا، نکال دو۔ میں نے عرض کیا، یہی کتے کی اصلی خوبی ہے۔ ہر جگہ سونگھ کر اطمینان کر لیتا ہے کہ کوئی شرارت تو نہیں ہے۔ چور نے گھر میں پاؤں رکھا نہیں کہ کتے کو انجانی بو مل گئی اور وہ چور کی گردن پر!

اور میرا یہ کہنا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ واقعی بل ٹیریر کتا، جست لگا کر آدمی کی گردن ہی تو پکڑ لیتا ہے اور ایک ہی جھنجوڑی میں کام تمام کر ڈالتا ہے۔ مولانا مجبور تھے۔ اس بارے میں مجھے"استاذ" مان چکے تھے۔ پھر جلد ہی کتی سے مانوس ہو گئے۔ چمکارنے اور نظریں بچا کے کبھی کبھی اس سے کھیلنے بھی لگے!

اِس سلسلے میں ایک اور لطیفہ پیش آیا۔ کتی کا نام"کوشا" رکھا گیا تھا۔ کوشا جوان ہوئی اور اس کے"بیاہ" کی فکر ستانے لگی۔ پڑوس میں ایک بڑا انگریز افسر رہتا تھا۔ اس کا کتا، اسکاچ تھا اور

نہایت حسین۔ میں نے درخواست کی کہ اپنا کتا، ہماری کوشا کے لیے ایک دفعہ دے دے وہ فرعون بے سامان، بگڑ گیا۔ میں نے کہا، ہم تمہارے مہتر کو دو روپے دیں گے اور وہ کتا لے آئے گا، فرعون نے جواب دیا، ہم مہتر کو گولی مار دے گا۔

مگر ہوا کیا؟ مہتر سے کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ کتا خود ہی گھر میں آ گیا۔ میں نے کتی کی ہر ممکن حفاظت کی مگر جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ کوئی پہرا بھی کام نہیں دیتا لیکن پہلا بچہ ٹھیک اپنے باپ جیسا نکلا اور میں نے اسے اپنا لیا۔ اِس پر مولانا نے خوب خوب بناتے رہے۔

میری بیماری

اب مجھ پر ایک بڑی آفت آتی ہے۔ جیب بالکل خالی تھی اور بدر الدین کے لیے دوا کا بندوبست کرنا تھا۔ دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں میلوں پیدل چلنا پڑا۔ رات کو بخار آ گیا اور بخار نے ٹائیفائڈ کی صورت اختیار کر لی۔ مولانا کی مہربانی سے ڈاکٹر بی سی رائے (موجودہ وزیراعظم بنگال) معالج مقرر ہوئے اور تیمارداری، مولانا کے والد کے ایک نہایت نیک مرید کے سپرد ہوئی۔ عبدالغنی ان کا نام تھا۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ دو بڑی حسین یورپین نرسیں میرے پلنگ کے پاس کھڑی ہیں۔ میں نے اونچی آواز سے عبدالغنی میاں کو پکارا۔ دوڑے آئے تو ان سے کہا، اِن نرسوں کے لیے کرسیاں بچھا دیجیے۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا، مگر جاگا نہیں تھا۔ سو ہی رہا تھا۔ عبدالغنی میاں جلدی سے کرسیاں لے آئے اور ہر طرف نرسوں کو ڈھونڈنے لگے۔ کہیں نظر نہ آئیں تو میری مچھر دانی میں منہ ڈالا۔ میری آنکھ کھل گئی اور میں ہنسنے لگا۔

مولانا کو واقعہ معلوم ہو گیا، تو بیماری کے بعد بھی مدتوں بناتے رہے، بلکہ کبھی کبھی آخری دنوں میں بھی مسکرا کر فرماتے ''کہیے مولوی صاحب آپ کی نرسوں کا اب کیا حال ہے؟''

تقریباً دو مہینے صاحب فراش رہا۔ بیماری کے زمانے میں مولانا کا برتاؤ بہترین رہا۔ بیماریوں سے خوف کے باوجود بار بار تشریف لاتے تھے۔ جب میں سفر کے قابل ہوا تو وطن جانے کی اجازت چاہی، مگر ہاتھ خالی تھا۔ مولانا بھی بیس پچیس روپیہ سے زیادہ نہ دے سکے۔ کسی نہ کسی طرح وطن پہنچا لیکن پھر بخار آنے لگا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کالا آزار ہے۔

کالا آزار کی بیماری گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ اِس قدر گھٹ گئی کہ میں سمجھا اچھا ہو گیا ہوں۔ مولانا کو خط لکھا کہ کلکتہ واپسی کا ارادہ نہیں ہے۔ الگ کام کرنا چاہتا ہوں، مگر مدت تک

ساتھ رہا ہے۔ لوگ مجھے آپ کا آدمی سمجھنے لگے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آئندہ لوگوں کو میری وجہ سے آپ پر اعتراض کرنے کا موقع ملے۔ لہٰذا اجازت دیجئے کہ اعلان کر دوں، آپ میرے خیالات اور کاموں کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

میرے خط کا مولانا نے طویل جواب دیا۔ یہاں نقل کرتا ہوں۔ افسوس مولانا نے بھی اپنے خط پر تاریخ نہیں دی:

عزیزی، السلام علیکم

''سفر سے واپس آیا، تو ڈاک میں آپ کا کارڈ اور خط ملا۔ افسوس میں کس خیال میں تھا اور آپ کس طرف جا رہے ہیں۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آپ کا یہ ارادہ ہے۔ اگر ہوتی تو میں یہیں آپ سے گفتگو کرتا اور آپ کا اضطراب دور ہو جاتا۔ آپ نے اِس تمام عرصے میں اچھی طرح اِس بات کا اندازہ کر لیا ہے کہ میں نے کبھی اپنے کسی ذاتی انتفاع کے خیال سے نہ تو آپ کو باصرار روکنا چاہا نہ کسی دوسری مشغولیت کے اختیار کرنے میں حارج ہوا۔ البتہ ہمیشہ اپنے دل کی محبت اور چاہت کی وجہ سے اِس کا خواہش مند ضرور رہا کہ حتیٰ الامکان آپ جدا نہ ہوں۔ آپ نے بھی ہمیشہ ایسے ہی جذبات ظاہر کیے اور اِسی کا نتیجہ ہے کہ کئی سال کا زمانہ یکجائی میں گزر گیا۔ اب بھی میرے دل کا وہی حال ہے، وہی خواہش ہے اور وہی جذبہ اور میں نہیں جانتا کہ اس گفتگو کے بعد جو آخری مرتبہ آپ کی آئندہ زندگی اور کاموں کے متعلق ہوئی، نئی بات کون سی پیدا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے آپ علیحدگی کا قصد کر رہے ہیں؟ تاہم اگر آپ نے ارادہ مصمم کر ہی لیا ہے، تو میرے لیے بجز اس کے کیا رہ جاتا ہے کہ ہر حال میں آپ کی بہتری اور فلاح کا خواہشمند رہوں۔ اور دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کے لیے بہتر مشغولیت کا سامان کر دے۔

باقی رہی یہ بات کہ اِس کی نسبت کوئی ایسا اعلان ہو جائے کہ آئندہ آپ کے کام میری طرف منسوب نہ کیے جائیں، تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خواہ کسی پیرائے میں یہ بات لکھی جائے، بے اعتمادی کے اثر سے خالی نہ ہوگی اور جب فی الحقیقت کوئی ایسی صورت حال درپیش نہیں تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ کوئی اعلان کیا جائے؟

البتہ میں اپنے دل کی محبت سے مجبور ہو کر اتنا ضرور لکھوں گا کہ آپ اگر علیحدہ نہ ہوں، تو یہ بہتر ہے۔ میں نے پچھلی گفتگو کے دوران میں تمام امور واضح کر دئے تھے۔ پس اگر اپنی آئندہ مالی ضروریات کا خیال ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس گفتگو کے بعد آپ کو کیوں پریشانی ہوئی؟ اس گفتگو کا

خلاصہ یہ تھا کہ دو تین ماہ کے اندر کام شروع نہ ہوا، تو یہ ضروری ہوگا کہ آپ کو ایک مقررہ رقم وصول کرنے کا حق ہو۔ افسوس ہے کہ آپ بیمار ہو گئے۔ حجاز جانے کا موقع بھی باقی نہ رہا[1]۔ اب آپ کو دیکھنا تھا کہ کوئی انتظام ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ ہوتا تو آپ یہی کر لیتے، جو اِس وقت کرنا چاہتے ہیں۔

آپ جس وقت جا رہے تھے، میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ آپ ایک ماہ وطن میں رہیں گے، اس لیے ضروری ہے کہ پہلی جولائی سے آپ کی نئی مشغولیت شروع ہو جائے۔ میں نے قطعی ارادہ کر لیا تھا کہ خواہ پریس جاری ہو یا نہ ہو، اخبار وغیرہ نکل سکے یا نہیں، پہلی جولائی سے کم از کم پچھتر روپیہ کا آپ کے لیے ضرور انتظام ہو جائے پھر اِس سفر میں بعض اشخاص نے ایک خاص اسلوب کے اخبار کے فوری اجرا پر زور دیا، تو میں نے یہ رائے قائم کی کہ اسے آپ کی ایڈیٹری میں دے دوں اور اپنی صرف نگرانی رکھوں۔ نیز کوئی ایسی صورت تجویز کر لی جائے کہ اخبار کی وجہ سے آپ کو مالی ترقی کا کافی موقع مل جائے چنانچہ کلکتہ آ کر ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں کہ آپ کے خط نے دوسری صورت پیدا کر دی"۔

"عزیزم، بلاشبہ کاموں کے تعطل سے جو نتائج پیدا ہوئے، انکی آپ کو شکایت ہے اور یقیناً وہ شکایت حق بجانب ہے لیکن اگر یہ تعطل آپ کے لیے نقصان دہ ہوا، تو یقیناً میرے لیے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوا۔ آپ ایک لمحے کے لیے بھی ان نقصانات کا اندازہ نہیں کر سکتے جو مجھے برداشت کرنا پڑے (کرنا پڑا، لکھا ہے) اور کر رہا ہوں۔ بلاشہ مجھے حق نہیں کہ اپنے نقصانات کے لیے، جو میری ہی غلطی کا نتیجہ ہیں، آپ کو اظہارِ ہمدردی پر مجبور کروں لیکن کیا آپ کے لیے موزوں ہے کہ آپ صرف اپنے ہی کو دیکھیں اور میرے لیے آپ کے اندر کوئی جذبہ نہ ہو؟ آپ کو تو یقیناً ایسا نہ ہونا چاہیے، جس کی محبت و اخلاص پر مجھے اب تک اعتماد رہا ہے اور علم اللہ جسے اپنا ایک عزیز و حبیب یقین کرتا ہوں۔ مان لیجیے کسی وجہ سے آپ علیحدہ بھی ہونا چاہتے تھے، تو کم از کم اِس موقعہ پر تو آپ ایسا نہ کرتے، جب ضرورت تھی کہ آپ ایسا عزیز و مخلص میرا ہاتھ بٹائے"۔

"یقین کیجیے، مجھ پر آپ کی اِس وقت علیحدگی اِس لیے زیادہ شاق گزر رہی ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ بے کاری سے بے دل ہو کر جا رہے ہیں اور مجھے آپ کے لیے ان باتوں کے انجام دینے کا موقعہ نہیں ملا ہے، جو انجام دینا چاہتا تھا۔ میں آپ کو اپنے ایک عزیز کی طرح مخاطب کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر علیحدہ ہی ہونا چاہتے ہو، تو کم از کم اس وقت علیحدہ نہ ہو۔ جہاں اتنا وقت نکل گیا، وہاں چند مہینوں کا بسر کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ میں کم از کم اِس طرح کام میں آپ کو لگا

دیکھوں جس طرح چاہتا ہوں کہ آپ کام کریں اور آپ کی استعداد صحیح طور پر ملک وقوم کی خدمت کے لیے کام آئے۔ اگر کسی وجہ سے آئندہ آپ کو یہی منظور ہوا، تو آپ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ زیادہ نہیں تو اِس سال کے آخر تک یہ ارادہ موقوف رکھو۔

''مجھے امید ہے کہ اِتنے عرصے تک محبت واعتماد نے آپ کو مجھ سے قریب رکھا۔ آپ میرے اِس حق سے انکار نہیں کریں گے کہ میں آپ سے بزور کہوں کہ علیحدہ نہ ہوں اور اِس ارادے سے باز آ جائیں۔ جتنے دن طبیعت چاہے وطن میں رہو۔ پہلی جولائی تک میرے پاس چلے آؤ۔ پریس شروع ہو یا نہ ہو، پچھتر روپیہ جولائی سے آپ کے مصارف کے لیے مہیا ہوتے رہیں گے۔ کام کی مقدار یا وقت وغیرہ کا آپ نے ایک بار ذکر کیا تھا۔ اس بارے میں کوئی مطالبہ نہیں۔ جس طرح جی میں آئے کرو۔ سردست لکھنے پڑھنے کے متعدد کام موجود ہیں۔

''لیکن اگر وہ اخبار نکل گیا، جس کا اب قطعی ارادہ ہے اور مجبوراً اس کی ذمہ داری مجھے قبول کر لینی پڑی ہے، تو پھر ان شاءاللہ دوسری ہی صورت پیش آ جائے گی اور پچھتر کی جگہ زیادہ سے زیادہ جو رقم ہو سکے گی، آپ کے لیے ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ جوں ہی طبیعت چست وچاق ہو جائے، آپ آ جائیں۔ اِس اثنا میں جتنی رقم مطلوب ہو، لکھ دیجیے، میں اس کا فوراً انتظام کر دوں گا''۔

''افسوس ہے بدرالدین کی طبیعت درست نہیں ہوتی۔ بخار روزانہ آتا ہے اور خنازیر کا مادہ موجود ہے۔ بعض لوگوں سے اِدھر مشورہ کیا، تو معلوم ہوا لکھنؤ میڈیکل کالج ہاسپٹل میں اِس مرض کا کوئی ایکسپرٹ موجود ہے، یا خصوصیت کے ساتھ علاج کا انتظام ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو مناسب ہے کہ لکھنؤ بھیج دیا جائے۔ میں نے تحقیق کے لیے خط لکھوایا ہے۔ جواب کا انتظار ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حکیم اجمل خان صاحب کا یونانی علاج کرایا جائے۔ وہ دہرہ دون جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے، وہاں بھجوا دو۔ اگر لکھنؤ کی بات پکی نہ نکلی، تو اِس کے سوا چارہ نہیں دہرہ دون چلا جائے۔ دونوں صورتوں میں ضرورت ہوگی کہ کوئی شخص ساتھ ہو۔ کیا آپ کی صحت ایسی ہے کہ آپ اس میں مدد دے سکیں؟''

''اپنے والد صاحب اور بھائیوں کو دعائے خیر پہنچا دیں۔ ہاں آپ نے شرف الدین کی بھیجی ہوئی کتابوں کی نسبت لکھا ہے، میں جب آپ کی موجودگی میں دہلی سے آیا، تو میں نے دو کتابیں اوپر میز پر شرف الدین کی بھیجی ہوئی پائی تھیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا کہ یہ آپ کی منگوائی ہوئی ہیں یا کس طرح آئی ہیں۔ شرف الدین کتابیں بھیجتے رہتے ہیں۔ میں نے خیال کیا،

انہوں نے بھیج دیا ہوگا۔ اب آپ کے کارڈ سے معلوم ہوا کہ آپ نے منگوائی تھیں۔ بہر حال آپ کو اندیشہ کیوں ہے؟ دونوں کتابیں رجسٹرڈ بھیج رہا ہوں۔ وصول کر لیجئے۔"

ایک اور خط

اِس خط کے بعد مولانا کا ایک اور خط آیا، جس پر ۳۰ مئی ۱۹۲۶ء کی تاریخ پڑی ہے۔ لکھتے ہیں:

عزیزی، السلام علیکم! عرصہ ہوا ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ اب تک جواب کا انتظار ہے۔ خدا کرے مانع بخیر ہو۔ اب اِس کے سوا چارہ نہ تھا کہ بذاتِ خود پریس کی تکمیل و اجراء میں سعی کروں چنانچہ اب خدا خدا کر کے کام شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ ایک ہفتے کے اندر مشین روم اور مشینیں مکمل ہو جائیں۔ ایک ہفتہ اور موٹر وغیرہ میں لگ جائے گا۔ اِس کے بعد پریس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ پہلی جولائی سے اخبارات نکل جا سکتے ہیں۔

"کاتبوں وغیرہ کے بارے میں آپ سے مشورہ کرنا تھا، جہاں تک جلد ممکن ہو پچھلے خط کا جواب دیں اور بتلائیں کب تک وہاں قیام کا قصد ہے؟"

افسوس ہے غریب بدرالدین کی صحت کا اب تک وہی حال ہے۔ لکھنؤ سے اب تک جواب نہیں آیا۔ کل پھر بعض احباب کو خط لکھا ہے۔ اگر معلوم ہوا کہ کنگ جارج ہاسپٹل میں خنازیر کے لیے ایکسپرٹ ڈاکٹر ہے، تو ارادہ ہے لکھنؤ بھیج دوں۔

اپنے والد اور بھائیوں کو سلام اور دعائے خیر پہنچا دیں۔

دہرہ دون میں

مولانا کے خط کے مطابق، بدرالدین مرحوم، ملیح آباد پہنچ گئے۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ ہم دونوں دہرہ دون اور وہاں سے راج پور گئے، جہاں حکیم محمد اجمل خاں صاحب مقیم تھے۔

حکیم صاحب مرحوم کو میں پسند نہیں کرتا تھا، دو دفعہ سرسری ملاقات ہوئی تھی اور وہ بڑی خشکی سے پیش آئے تھے لیکن یہاں راج پور میں نہایت زندہ دل، پُر مذاق، دلچسپ ثابت ہوئے۔ انہی دنوں مولانا بھی آ گئے اور ناقابلِ بیان چہل پہل ہو گئی۔

ایک دن حکیم صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا "یہ تو آپ کے ساتھ مدت سے ہیں، بتایئے بھولے ہیں یا سیانے؟" مولانا نے مسکرا کر جواب دیا "اپنے آپ کو ظاہر تو کرتے

ہیں بھولا، حقیقت خدا جانے!'' کچھ توقف کے بعد پھر فرمایا ''حکیم صاحب، یہ حضرت بڑی معصوم صورت سے مجھے بنایا کرتے تھے۔ مجھے وہم بھی نہ ہو سکا۔ دفعتاً جیل میں راز کھلا، ورنہ عمر بھر بنتا رہتا اور سمجھتا یہی رہتا کہ میں انہی ں بنا رہا ہوں!'' اِس پر خوب قہقہے پڑے۔

مولانا کھانے کے ساتھ سرکے، اچار کے شوقین تھے۔ دسترخوان بچھتے ہی کہنے لگے ''مولوی صاحب، کچھ سرکے، اچار کا بھی بندوبست ہے''؟ میں نے اقرار کیا، تو حکیم صاحب مرحوم نے منہ بنا کر فرمایا ''نہایت مضر چیز ہے۔ اٹھائیس برس سے میں نے تو اِس کی صورت بھی نہیں دیکھی'' مولانا نے فوراً جواب دیا ''حکیم صاحب، دسترخوان پر ہمیں طب منظور نہیں!''

سرکے کی بوتل آ گئی، پیاز، ادرک، لہسن، مرچیں، ہر چیز خوب اُٹھی تھی۔ طشتری سے خوشبو پھیلی تو میں نے دیکھا کہ حکم صاحب کے منہ میں رال آ گئی ہے اور کن انکھیوں سے سرکے کی طرف دیکھے جاتے ہیں۔ عرض کیا ''گستاخی معاف، سرکہ کھانا مضر ہے نا؟'' حکیم صاحب نے فرمایا ''ہاں'' عرض کیا اور چکھنا؟ حکیم صاحب ہنس پڑے، اور کہنے لگے ''چکھنے میں مضائقہ نہیں۔ بڑھایئے طشتری میری طرف!'' اِس کے بعد تو حکیم صاحب، سرکے کے ایسے دلدادہ ہوئے کہ حیرت ہوتی تھی۔

مولانا کی واپسی کے بعد ایک دن حکیم صاحب مرحوم نے بڑے پُراسرار طریقے سے سوال کیا ''مولانا کا ذریعہ معاش کیا ہے؟'' یہ سوال میں اور لوگوں سے بھی سن چکا تھا۔ حکیم صاحب کی زبان سے سننے کا ہرگز متوقع نہ تھا۔ اِس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن بعض ثقہ اصحاب اس وہم میں مبتلا ہیں کہ مولانا کو حکیم صاحب مرحوم سے مالی مدد ملا کرتی تھی۔

حکیم صاحب مرحوم بہت قدرداں ہو گئے تھے۔ بہت بہت زور ڈالا کہ دہلی چلوں۔ روپیہ کا بندوبست ہو جائے گا۔ اور میں اپنا ذاتی کام شروع کروں، مگر ابھی تک مولانا سے علیحدگی کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اور فیصلے سے پہلے اس طرح کا منصوبہ باندھنا، وفاداری کے خلاف تھا حالانکہ جانتا تھا، حکیم صاحب بڑے دل والے آدمی ہیں اور جس نے ان سے رشتہ جوڑا، پچھتایا نہیں۔

الہلال کا اجرا

حکیم صاحب مرحوم کے پاس رہنے سے بیماری دور نہیں ہوئی پھر میں کلکتہ پہنچا کہ ڈاکٹر برہما چاریا سے مشورہ کروں، جو کالا آزار کے انجیکشن کا موجد تھا۔ قیام، مولانا کی کوٹھی پر ہوا اور مولانا نے یہ کہہ کر جانے نہ دیا کہ الہلال کو پھر سے زندہ کرنا ہے۔

الہلال جاری ہوگیا مگر آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ اتنے بڑے اخبار کا اسٹاف، اکیلا ملیح آبادی تھا۔ اس دوسرے دور میں مولانا نے الہلال میں ایک ہی اچھا مضمون لکھا۔ یہ مضمون، وکٹر ہیوگو کے ناول ''لامیزرابیل'' کے ہیرو، جان ولجان کے پادری کو حضرت جنید بغدادی کی صورت میں پیش کرنے والا تھا۔ ضرور وکٹر ہیوگو حضرت جنید اور بغدادی، ڈاکو ابن ساباط کے واقعہ سے واقف تھا۔ اسی واقعہ کو اس نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے، مگر مولانا کا مضمون اس ناول سے کم درجے کا شاہ کار نہیں ہے۔

اس کے علاوہ مولانا نے نیشنلزم پر دو تین مضمون لکھے۔ الہلال میں میرا نام نہیں چھپتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''عالم انسانیت موت کے دروازے پر'' کے عنوان سے جتنے مضمون، نکلے، انھیں لوگوں نے مولانا کی تصنیف قرار دے کر کتابی صورت میں شائع کر دیا۔

''الہلال'' کے سلسلے میں مولانا کی بعض تحریریں میرے پاس محفوظ رہ گئی ہیں۔ ''یادداشت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

۱۔ ''علم الاجتماع'' کا جس قدر ترجمہ ہو جائے، کمپوزیٹروں کو دے دیا جائے اور صفحات بنا دیے جائیں۔

۲۔ منشی علی عباس سے کہا جائے کہ اس پرچے کے اختتام کے بعد (جو کل پرسوں نکل رہا ہے) پہلے ''جامع الشواہد'' کی بقیہ کاپیاں ازسرِ نو لکھیں اور تصحیح کے بعد چھپوالی جائیں۔

۳۔ اِس کے بعد الہلال کے صفحات اشتہارات دو دو تین تین مرتبہ کے لیے لکھ لیں۔

۴۔ پھر الہلال کے لیے ''سیر فی الارض'' تقاریر زاغلول (بہ عنوان ادبیات) اور عہد عباسیہ لکھیں۔

۵۔ مشین ٹائپ پر دو تین ہفتے کے لیے ٹائٹل پیج کے دونوں رُخ بہ تبدیل نمبر چھپوالیں۔

۶۔ آپ (مولوی عبدالرزاق صاحب) دو نمبروں کے لیے مواد تیار (مولانا نے طیار لکھا ہے) کریں: مذاکرۂ علمیہ، مکمل ترجمہ علم الاجتماع، ترجمہ تقریر مصطفیٰ فاضل، مصر، ترکی وغیرہ کی چٹھیاں، ادبیات میں افسانہ یا کوئی اور چیز۔ احادیث کا ایک مختصر مجموعہ جس میں صرف اخلاق، حکمت و موعظت کی احادیث ہوں، مثلاً اتفاقِ اجتماعی، اطاعت امیر، مکارم اخلاق، عفو و درگذر، تسامح، تحمل مصائب، مصابرہ، عزم، ثبات ایمان و عقائد، امر بالمعروف وغیرہ۔ یہ اس طرح لکھی جائیں کہ پہلے اصلی حدیث مع تخریج، پھر ترجمہ، پھر پانچ پانچ سطروں کی جگہ سادی''

اِس سلسلے میں مولانا کی ایک اور تحریر زیادہ مفید ہے:

''عزیزی، ترجمہ و کتابت میں چند امور کا لحاظ رکھنا چاہیے:

۱۔ بلاضرورت، انگریزی اسماء و مصطلحات استعمال نہ کیجیے، مثلاً رپورٹ، کانفرنس، پارلیمنٹ، ایڈیٹر وغیرہ۔ ان کے لیے روداد، بیان، موتمر، مجلس، یا مجلس حکومت وغیرہ الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔[۲۲]

۲۔ مسودہ لکھتے وقت رسم الخط کا خیال رکھیے تاکہ کاتب اور کمپوزیٹروں پر بھی زور چل سکے۔ پہلے الہلال کا رسم الخط مقرر تھا۔ اب نہیں ہے۔ لوگ شکایت کرتے ہیں۔ مثلاً حتی الامکان ہر مرکب لفظ مستقلاً لکھنا چاہیے یعنی ''سمجھکر'' کی جگہ ''سمجھ کر'' ''پہنچکر'' کی جگہ ''پہنچ کر'' وغیرہ ذلک۔

ہائے مخلوط و غیر مخلوط میں فرق کیجیے ''کھانا'' ''انھیں'' وغیرہ کو دوچشمی سے مگر ''نہیں'' ''کہیں'' کو دوچشمی سے نہ لکھا جائے۔ علاماتِ قرات کا بھی نظر ثانی میں خیال رکھیے۔ اب فل اسٹاپ کی جگہ ''---'' کی علامت اختیار کرلی گئی ہے۔ پس وقفہ کامل کی جگہ نقطہ نہیں ہونا چاہیے۔ ڈیش (چھوٹا) دینا چاہیے۔

اگر تین الفاظ مسلسل آجائیں اور دو میں کاما اور تیسرے میں عطف ہو، جیسے ہندوستان، مصر اور سوڈان۔ تو اس صورت میں آخری عطف کے ساتھ بھی کاما ہونا چاہیے۔[۲۳]

''اس کے علاوہ اسلوب تحریر و انسجام الفاظ کا معاملہ ہے، جس کے لیے آپ کی تحریر میں کوئی ایک سطح قائم نہیں ہوئی ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں گے تو یہ بات دور ہوجائے گی مثلاً ''ہوا'' اور ''ہوگیا''، ''کہا'' اور ''کہہ دیا'' کا فرق تو واضح ہے لیکن بول چال اور کتابت میں کس جگہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ ذوق پر موقوف ہے اور تھوڑی سی توجہ سے ایک قاعدے کی طرح قلم پر طاری ہوجاسکتا ہے:

''ہاں، مصری یورپین الفاظ کی تعریب کرتے ہوئے عموماً واؤ کی آواز ف سے نکالتے ہیں، مثلاً ہارورڈ کی جگہ ہارفرڈ، پنسلونیا کی جگہ بنسلفانیا، اس لیے نقل اسماء میں احتیاط کے ساتھ اصلیت معلوم کرنی چاہیے۔

آئندہ نمبر کی ترتیب حسب ذیل ہوگی:

۱۔ دوسرے صفحے سے مقالات شروع ہوں گے۔ لیلیٰ مجنوں کا بقیہ حصہ نمبر۲ کے عنوان سے درج ہوگا۔ یہ غالباً پانچ کالم سے زیادہ نہ ہو۔ ممکن ہے اس پر پہلا فارم ختم ہوجائے۔

۲۔ آثار عتیقہ میں منارہ اسکندریہ کمپوز شدہ ہے۔اس میں صرف عرب مورخین کی تصریحات بڑھانی ہیں لیکن اگر اس کے دونوں فوٹو بن کر آ گئے، تو پھر اس نمبر میں اتنا ہی دے دینا کافی ہوگا۔

۳۔ اس کے بعد ایک نئی سرخی"مشرق کی تاریخ جدید کی تاریخی شخصیتیں" شروع کی جائے۔اس میں جمال الدین کا تذکرہ ہوگا لیکن اس مرتبہ بہت ہی مختصر تبصرہ کرنا ہے کیونکہ سات آٹھ مختلف قسم کےِ فوٹو تیار ہیں۔اس کے دو مصور صفحے مرتب ہوں گے۔مضمون میں لکھ دوں گا۔

۴۔ اس کے بعد بابُ التفسیر ہوگا۔

۵۔ اس کے بعد برید فرنگ، جس کے مضامین کچھ دے دئے ہیں۔کچھ بھیجتا ہوں۔

۶۔ اس کے بعد بصائر وحکم، برید مشرق ضروری ہیں اور ان کے علاوہ تاریخی و ادبی مضامین درج کیے جاسکتے ہیں، جو زبانی دریافت کر لیجئے گا۔

"میں چاہتا ہوں۔اب بتدریج آپ پرچہ خود مرتب کرنے لگیں۔یعنی میرا تعلق آپ سے ہو، آپ کا پرچے سے۔ترتیب، تصحیح، تصاویر کا انتخاب، ان کی نشست وغیرہ میں ٹھیک کر کے آپ کو بتلاتا رہوں......"

بے لطفی

الہلال دوبارہ نکلا، تو میں لمبی بیماری سے اٹھا تھا۔انتہائی مالی تکلیفوں میں گرفتار تھا۔آٹھ مہینے کالا آزار میں مبتلا رہا تھا۔مولانا اس پوری مدت میں مدد نہیں کر سکے تھے، اِس کا مجھے بہت رنج تھا۔خدا غریق رحمت کرے میرے مصر کے استاد، علامہ سید رشید رضا کو، انہوں نے اس بدحالی میں تین سو روپے بھیج دئے اور لکھا، تم میرے روحانی فرزند ہو، روپیہ واپس کیا، تو اپنی فرزندی سے خارج کردوں گا! ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں بہت چڑچڑا ہو گیا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ذہن کو تہ و بالا کر ڈالا۔اور میں غم وغصہ سے لبریز ہوگیا۔مولانا کے ایک رشتہ دار نے نہ جانے مذاق میں یا سنجیدگی سے ایسی بات کہہ دی جس سے میری شرافت مجروح ہوتی تھی۔اسی وقت انتہائی غیظ کی حالت میں مولانا کے پاس جا پہنچا اور پوری صفائی سے واقعہ بیان کر کے یہ بھی کہہ دیا کہ اب اس گھر میں ٹھہرنا ممکن نہیں، مولانا نے ٹھنڈے دل سے سب کچھ سنا اور بڑی متانت اور اخلاص سے فرمایا" آپ کا سلوک ہر شبہے سے بالا ہے۔ہمارا گھر بھر آپ کا معترف ہے۔آج تک کسی کو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔"

لیکن اِس واقعہ نے مجھے بری طرح ہلا ڈالا تھا میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ اب میری بے وقوفیوں کا ایک سلسلہ بندھ گیا اور بے وقوفیوں نے بے لطفیوں کا دروازہ کھول دیا۔ سنیئے میری بے وقوفیوں کی داستان: مولانا نے پہلی دفعہ تنخواہوں کا اور گھر کے خرچ کا رجسٹر بنوایا ''تنخواہ'' کے ساتھ رجسٹر بھی دستخط کے لیے آیا۔ سخت کوفت ہوئی۔ دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور مولانا کو لکھا کہ میں تو اِس وہم میں مبتلا تھا کہ آپ کے ساتھ عزیزوں کی طرح رہتا ہوں، اسی لیے مالی معاملات کی کبھی پروانہ ہوئی لیکن آج رجسٹر نے بتایا کہ میں بھی ایک ''نوکر'' ہوں! اب مجھے طے کرنا ہے کہ نوکری کروں یا نہ کروں؟ اور کروں تو کتنی تنخواہ طلب کروں؟ ساتھ ہی لکھ دیا کہ یہاں میری گذر نہیں ہوسکتی۔

اس تلخ تحریر کا تلخ جواب مولانا نے دیا، نقل کرتا ہوں:

عزیزی، اگر آپ کا مقصود یہ ہے کہ آپ رہنا نہیں چاہتے، تو آپ کو کہی کرنا چاہیے، جس پر آپ کی طبیعت مطمئن ہو اور میں پسند نہیں کروں گا کہ آپ ایک دن ناگواری خاطر کے ساتھ رہیں لیکن یہ طریقہ تو کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے کہ ایک غلط اور بے اصل وجہ پیدا کی جائے۔ آپ کی یہ رائے کس درجہ تمسخر انگیز ہے جبکہ:

۱۔ کسی حسابی فرد میں کسی معین دن ضروری رقوم کے اندراج کو ذلت وعزت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر کسی جگہ ایک بھنگی دس روپیہ لیتا ہو اور میں ایک ہزار اپنی ضروریات کے لیے لیتا ہوں تو یقیناً ایک کاغذ پر دونوں کا اندراج ہوسکتا ہے اور آپ کی عقل کے سوا دنیا کی کوئی عقل اسے ''کمپوزیٹروں کی صف'' سے تعبیر نہیں کرے گی۔ گزشتہ ماہ سے منشی ابن الحسن وہ دونوں رقمیں اسی میں درج کر کے بھجواتے ہیں، جو میں اپنی بہنوں کو بھیجتا ہوں۔ کیا اس سے وہ کمپوزیٹروں کی صف میں آ گئیں؟ مکان کے کرایہ کی رقم کا اس میں اندراج ہوتا ہے۔ کیا اس سے مکان والا ''کمپوزیٹروں کی صف'' میں آ گیا''؟

۲۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے جوش جستجوئے جیل میں میری پوری بات بھی نہیں سنی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے وقت پر یہ معاملات یاد نہیں رہتے۔ پچھلی مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ کو روپیہ ایک دو دن کی تاخیر سے ملا اور آپ نے کہا کہ اس کی وجہ سے آپ کو دقت پیش آئی۔ اس مرتبہ بھی دیکھیئے۔ آج ۱۲ ہے اور اگر آپ آج مجھے نہ کہتے تو مجھے بالکل خیال نہ تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے سنیچر کے دن منشی ابن الحسن صاحب سے (جبکہ وہ پیشگی رقوم محرم کے خیال سے

لوگوں کو دلا رہے تھے) احتیاطاً یہ کہا کر پرسوں جب تنخواہوں کا شیٹ آپ بنائیں، تو اس میں ایک خانہ میرے گھر کے مصارف کا بھی رکھ دیں اور اس میں ڈھائی سو روپیہ درج کر دیں۔ میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو رجسٹر مصارف میں خود بخود پورے مصارف کا اندراج ہو جائے گا۔ دوسرے اسی وقت یہ رقوم دے دی جائیں گی۔ اِن میں سو روپیہ آپ کو دینا تھا۔ ڈیڑھ سو باہر بھیجنے تھے۔ میں نے یہ کارروائی اس خیال سے کی تھی کہ بہتر ہوگی اور جو تاخیر میرے سہو سے ہو جایا کرتی ہے، باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ یہی بات آپ سے کہی جب آپ نے روپیہ کا ذکر کیا لیکن آپ نے اس کا یہ مطلب قرار دیا۔ یہ آپ کی طبیعت اور دل کی خوبی ہے اور میری بدقسمتی۔

بہرحال اب آپ اتنی تکلیف اور کیجئے کہ اِس کے ساتھ جو کاغذ بھیجتا ہوں، وہ منشی ابن الحسن صاحب کو بھیج کر ان سے کاغذ منگوا لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ اِس ''صف'' میں آپ کا نام ہے یا نہیں؟

آپ نے میرے دلی جذبات کے ساتھ جو آپ کے لیے رکھتا ہوں، بہت ہی سخت ناانصافی کی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ آپ کے لیے وہی کرے، جس میں آپ کی بہتری ہو۔

میرا آپ کا تعلق کاروباری نہ تھا، جس کے لیے پندرہ دن یا ایک ماہ کے نوٹس کا سوال ہو۔ دل کی محبت کا تھا۔ اس کی تبدیلی کی صورت میں اپنے اوپر جبر کر کے کام کرنا کسی طرح بھی بہتر نہ ہوگا۔

میں آپ کے دل کی یہ حالت (جس کا اِس وقت اچانک انکشاف ہوا) پوری طرح محسوس نہیں کر سکا تھا لیکن یہ محسوس کر چکا تھا کہ آپ جم کر کسی ایک شغل میں نہیں رہ سکیں گے اور کام کے متعلق جو ارادے ظاہر کیے جا رہے ہیں، وہ سب چند دنوں کے اشتغال کے بعد رہ جائیں گے۔ بایں ہمہ آپ کی اس گفتگو سے جو آپ نے دسمبر میں کی تھی، میں نے اثر قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ اِس میں پیغام کا حصہ ہو چکا، الہلال کا باقی تھا۔ اب وہ بھی ہو چکا۔

خیر ان باتوں کا تذکرہ بے سود ہے۔ میں ہر حال میں آپ کی بہتری چاہوں گا اور جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔''

اِس خط کے بعد سہ پہر کو میں چائے پینے نہیں گیا۔ خود بلایا اور اِدھر اُدھر کے دلچسپ تذکرے چھیڑ دیے، مگر مجھ سے رہا نہ گیا اور عرض کیا، مولانا آپ کے خط نے مجھے مزید تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔ بھلا پیغام کے بند ہونے میں میرا کیا قصور تھا؟ ہم سب جیل بھیج دیے گئے۔ پرچہ بند

ہو گیا، چھوٹے، تو آپ نے میرے تقاضوں پر بھی پیغام کو زندہ نہ کیا۔ ہنسے اور فرمایا "یہ تو سچ ہے، مگر کیا الزام لگانے کا بھی حق آپ مجھے نہیں دے سکتے!"

پھر ناگواری

لیکن جلد ہی پھر ناگواری پیدا ہو گئی۔ بیمار بدرالدین، تبدیل آب و ہوا کے لیے رانچی گئے تھے۔ مرحوم سے دلی تعلق تھا اور ان کی عیادت کے لیے بار بار جانے کو ضروری سمجھتا تھا، مگر مولانا اخبار کے کام کا حوالہ دے کر روک لیا کرتے تھے، حالانکہ میری غیر حاضری اخبار کے لیے مضر نہ تھی۔ خود مولانا ہی کی وجہ سے دیر ہو جایا کرتی تھی۔ پرزہ چلا آ رہا ہے، ایک مضمون دینا ہے۔ چار صفحے خالی رکھیے، مگر ہزاروں تقاضوں پر بھی مضمون نہیں آتا اور پھر آخر میں پرزہ پہنچتا ہے سخت پیچش ہے۔ مضمون نہ ہو سکا۔ نادم ہوں!

ایک دفعہ میں نے رانچی جانے پر زیادہ اصرار کیا، تو مولانا نے یہ سطریں لکھ بھیجیں۔ لفظ لفظ سے تلخی ٹپک رہی ہے۔ میری تنک مزاجیوں سے وہ بھی جھنجلائے ہوئے تھے:۔

"چونکہ آپ کی طبیعت جانے پر مائل ہے، اس لیے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ طبیعت پر جبر کر کے رُکیں۔ بہتر ہے آپ آج رات چلے جائیں اور رانچی ہو آئیں۔ کوئی بات میرے کہنے سے بجبر نہ کیجیے"۔

مولانا کسی اخبار کو وقت پر نکال نہ سکے۔ دوسرے دور میں الہلال کی بھی یہی مصیبت تھی کہ وقت پر نہیں نکلتا تھا، مگر تاخیر کا سبب مجھے قرار دیتے تھے۔ پرانے کاغذوں میں اپنا ایک خط مل گیا ہے، جو اس بارے میں مولانا کو لکھا تھا۔ اسی کی پشت پر مولانا کا جواب موجود ہے۔ یہاں نقل کرتا ہوں۔

میں نے لکھا تھا:

"بلاشبہ اخبار وقت پر نہیں نکل رہا ہے، مگر میرے خیال میں تاخیر، میری کسی کوتاہی کا نتیجہ نہیں ہے۔ میں ایک لمحہ بھی جان بوجھ کر ضائع نہیں کرتا نہ کبھی کام سے جی چراتا ہوں۔ مجھے نہایت صدمہ ہے کہ جناب کا خیال میرے متعلق یہ نہیں ہے۔ یہ بات مجھے دوسرے قرینوں سے محسوس ہوتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ روز بروز ہمت پست ہوتی جاتی ہے اور شوق کم ہوتا جاتا ہے۔

نفس معاملے کے متعلق عرض ہے کہ رانچی کا سفر اس وقت ملتوی کیے دیتا ہوں لیکن موجودہ صورت میں مجھے کبھی موقع نہیں مل سکتا کہ رانچی جاؤں یا مکان جاؤں۔ مکان جانا اِس لیے ضروری

ہے کہ بال بچے وہیں پڑے ہیں۔ یہاں انہیں لاکر رکھنے کا انتظام نہیں، اس وجہ سے مجھے بڑی تکلیف ہے اور بار بار عرض کرتے رہ جاتا ہوں کہ یہاں مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ میری عادت شکایتیں کرنے کی نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ معمولی معمولی باتوں میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔

اسی طرح بدرالدین کی عیادت بھی میرے ذمے فرض ہے۔ میں انہیں اپنے عزیزوں سے بھی بڑھ کر عزیز سمجھتا ہوں اور حد سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ وہاں اکیلے پڑے گھل رہے ہیں۔ اگر اخبار نہ نکل گیا ہوتا، یا مجھے بالکل فرصت مل گئی ہوتی، تو بیماری بھر انہی کی خدمت کرتا رہتا۔ شب وروز ان کی وجہ سے متفکر اور افسردہ رہتا ہوں۔

یہ سب اِس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اگر اِس ہفتے نہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ آئندہ ہفتے کے لیے تمام مضامین تیار کر کے دو دن کے لیے انہیں دیکھنے کا موقع مل سکے گا؟ مکان جانا ایک مہینے کے لیے بھی ملتوی کر سکتا ہوں مگر بہر حال جانا ہی پڑے گا لیکن جانے کی کیا صورت ہوگی؟ کام کی جو شکل اِس وقت ہے، اس میں تو مہلت کبھی مل ہی نہیں سکتی'' مولانا کا جواب ملاحظہ ہو:

میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ تاخیر کے بے شمار اسباب جمع ہو گئے تھے لیکن اب انہیں دور کرنا چاہیے یا قائم رکھنا چاہیے؟ اگر دور کرنا چاہیے، تو یقیناً ضروری ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ وقت پر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ نظم قائم ہو جائے۔

پھر کیا کوشش عمل میں آسکتی ہے؟ اگر عین اس زمانے میں جبکہ اخبار کا دوسرا تیسرا نمبر نکل رہا ہو اور کوشش کی جارہی ہو کہ راہ پر آئے، کام کرنے والے سفر کی حالت میں ہوں؟

باقی رہا آپ کا مکان جانا یا رانچی جانا، تو اس میں دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں:

ا۔ کام کی ابتدا، سعی و محنت چاہتی ہے۔ جب کام راہ پر آجاتا ہے، تو پھر اس کی حالت بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ میں نے جو لکھا تھا، وہ اس تعجب کا نتیجہ تھا کہ ابھی تیسرا نمبر بھی نہیں نکلا ہے اور ایک نمبر کو بھی وقت پر نکالنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے اور آپ کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کام کے انضباط کے بعد نقل و حرکت، تو نہ اس میں کام مانع ہوگا اور نہ میں کسی حال میں مانع ہو سکتا ہوں۔ آپ ابھی چند دن ہوئے رانچی تشریف لے گئے۔ میں نے ایک لفظ بھی اعتراض کا کہا؟ چونکہ اخبار نکلا نہیں تھا، اس لیے خیال کیا کہ آپ کے جانے میں کیا حرج ہے؟ آخر وہاں جا بھی رہے ہیں تو بدرالدین کے خیال سے۔

۲۔ البتہ جب بھی ایک شخص کسی دوسری جگہ رہ کر مشغولیت اختیار کرے گا، تو لازمی طور پر مکان سے دوری ہوگی اور تھوڑے عرصے کے اندر ایاب و ذہاب نہ کر سکے گا۔ لوگوں نے اس بارے میں کوئی نہ کوئی طریق عمل اختیار کر لیا ہے اور وہ ناگزیر ہے۔"

ایک اور پرزے کے جواب میں مولانا نے لکھا:

"میں نے کل آپ کے خط کی پشت پر لکھ دیا تھا۔ غالباً یہیں رہ گیا پھر لکھتا ہوں۔

"اس معاملے میں میرے لیے مشکل ہے کہ میں کچھ کہہ سکوں۔ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی کے مسلسل نقصانات کے بعد اب کہیں پرچہ نکل سکا ہے۔ اس کا یہ تیسرا نمبر ہے، جو نکلے گا۔ کام کی ترتیب کا یہ حال ہے کہ اب تک ایک نمبر بھی وقت پر نہیں نکل سکا۔ جو نمبر اس وقت زیرِ ترتیب ہے، اسے جمعہ کے دن نکلنا تھا۔ اب وہ دوسرے جمعہ تک بمشکل نکل سکے گا۔ صرف یہ صورت اب سمجھ میں آئی تھی کہ اِسے ڈبل کرنے کی ذلت گوارا کر لی جائے اور کوشش کی جائے کہ آئندہ نمبر وقت پر نکلے۔ اس صورت کی تعمیل صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جوں ہی کاتب خالی ہو، اسے فوراً آئندہ پرچے کے مضامین مل جائیں۔ ایک مرتبہ اگر کسی نہ کسی طرح سات دن کے اندر معاملہ آ جائے، تو پھر آئندہ چکر قائم ہو جائے گا۔ آج اتوار ہے اور ڈاک آئے گی، اس سے مضامین اخذ کر کے فوراً تیار کر لیے جاتے۔ نیز اور جو چیزیں آئندہ نمبر کے لیے سوچی تھیں، تیار ہو جاتیں، تو ممکن تھا کہ آئندہ نمبر سے وقت کی ترتیب قائم ہو جاتی۔

اس کے علاوہ یہ پرچہ بھی ابھی ختم نہیں ہوا۔ کم سے کم دو فارموں کی کاپیاں اور پروف باقی ہیں۔ کاتب کا ہاتھ اگر کل شام کو خالی ہو جائے، تو پرسوں سے اس کو مضامین دینے چاہئیں۔

پس ذمہ دار کام کے آپ ہیں۔ کم از کم میں اب تک ایسا ہی خیال کرتا رہا ہوں۔ اگر آپ صورتِ حال پر مطمئن ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس حالت میں آپ کو لکھنؤ یا ملیح آباد، یا رانچی، یا کہیں بھی ایک دن کے لیے یا دو کے لیے یا پانچ کے لیے چلے جانا چاہیے اور آپ اس نقل و حرکت کے ساتھ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے، تو مجھے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ شوق سے جا سکتے ہیں۔ میری طرف سے کوئی روک نہیں۔

اور یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ "یہاں مجھے تکلیف ہے۔ معمولی معمولی باتوں کی تکلیف ہے۔ بار بار کہتے کہتے رہ جاتا ہوں" تو یہ میرے لیے نہایت ہی عجیب بات ہے۔ اس وقت میرے علم

میں نہیں آئی۔ میرے علم میں آپ کی جو تکلیفیں آئیں، میں انھیں دور کرنا اپنا فرض سمجھوں گا، بشرطیکہ میرے علم میں آئیں لیکن اگر آپ مجھے نہ کہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں؟

باقی رہی یہ بات کہ آپ کو آرام کس حالت میں ہے؟ تو جس حالت میں ہو، اس کے سروسامان کا انتظام کیجئے۔ جنوری میں آپ نے کہا تھا کہ آپ یہاں نہیں رہیں گے پھر جب میں نے کہا اچھا اس کا انتظام کیا جائے، تو خود آپ نے کہا کہ ضرورت نہیں۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں، تو اِسی کا انتظام کیا جائے۔ یقیناً زندگی کے لیے پہلی چیز، قیام کا قابل اطمینان انتظام ہے۔ آپ کسی وقت بہ تفصیل مجھ سے گفتگو کرلیں، تاکہ جو صورت پسندیدہ ہو، اختیار کی جائے۔

مولانا لکھ تو دیتے تھے کہ قیام کا دوسری جگہ بندوبست ہوجائے مگر چائے پر ایسی باتیں کرتے تھے کہ میں پھر رُک جاتا تھا۔ کبھی کہتے، علیحدہ انتظام کی صورت میں زیادہ مصارف ہوں گے اور بجٹ میں ابھی گنجائش نہیں۔ کبھی فرماتے، علیحدگی کا تصور بھی بے وفائی ہے اور آپ کو بے وفا نہیں ہونا چاہیے۔ خود میرے دل کی بھی یہی حالت تھی کہ ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا ۔

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم ان سے ولے
مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے!

گستاخی

رانچی کا سفر ٹلتا رہا۔ آخر میں نے طے کرلیا کہ بغیر اجازت ہی چل دوں۔ پورا اخبار تیار کر چکا تھا اور بعد کے نمبر کے لیے بھی کئی مضمون لکھ ڈالے تھے۔ رانچی رات کو ریل جاتی تھی۔ چلنے سے پہلے مولانا کے لیے رقعہ لکھ دیا کہ وطن سے تار آیا ہے اور میں جا رہا ہوں!

یقیناً یہ میری بڑی اخلاقی کمزوری تھی کہ غلط بیانی سے کام لیا۔ مجھے صاف لکھ دینا تھا کہ رانچی جا رہا ہوں۔ آج تک اپنی اس اخلاقی گراوٹ پر سخت نادم ہوں۔

چوبیس گھنٹے ٹھہر کر رانچی سے لوٹ آیا اور آتے ہی معلوم ہوگیا کہ مولانا میرا پرزہ پا کر فوراً نیچے اتر آئے تھے۔ بہت برہم تھے۔ اخباروں میں ٹائم ٹیبل دیکھا۔ انکوائری آفس سے فون پر ریل کے اوقات معلوم کیے۔ سمجھ گئے کہ رانچی گیا ہوں۔

صبح کو مولانا اپنے کمرے میں آکر بیٹھے اور میں مضامین لے کر پہنچا، تو چہرے سے خفگی ظاہر تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگے:

مولانا: گھر پر خیریت تو ہے؟

میں: (سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے) جی!

مولانا۔ مولوی صاحب، آپ دفعتاً چلے گئے۔ رات ہی کو تار آیا تھا؟

میں: کچھ ایسی ہی بات تھی!

مولانا: آپ میں اخلاقی کمزوری ہے۔ آپ کو شرمندہ ہونا چاہیے!

میں: یہ نہ فرمائیے۔

یہ کہتے ہوئے مجھ پر غصے کا سخت دورہ پڑا۔ ہاتھ کے مضمون مولانا کے منہ پر کھینچ پھینکے اور یہ کہتا ہوا کمرے سے نکلنے لگا ''میں آپ کے ساتھ کام نہیں کروں گا؟'' مگر مولانا نے لپک کر پکڑ لیا اور عجیب لہجے میں فرمانے لگے۔ ''میں نے تو کوئی گستاخی نہیں کی۔ مجھے معاف کر دیجئے''!

لیکن میں غصے سے بے خود ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں چلا آیا اور اسباب باندھنے لگا۔ معاً مولانا کے آخری لفظ یاد آ گئے۔ اپنی بھیانک حرکت بھی یاد آ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ شرم وندامت سے زمین میں گڑھا جا رہا ہوں۔ انتہائی کوفت کے عالم میں سَر پکڑ کے بیٹھ گیا اور اسی وقت چونکا، جب تیسرے پہر کو ملازم نے آ کر کہا ''مولانا، چائے کے لیے بلا رہے ہیں۔

اب میرے لیے اور بھی مصیبت تھی۔ نہ شرم سے جا سکتا تھا، نہ جانے سے انکار کر سکتا تھا۔ جانا ہی پڑا مگر پاؤں اٹھتے نہ تھے، جیسے من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ بڑی مشکل سے پہنچا مگر نگاہیں زمین پر گاڑے۔ بالکل سنگین مجرم کی طرح، مگر مولانا نے دیکھتے ہی ایسی بشاشت سے گفتگو شروع کر دی اور دنیا جہان کے ایسے ایسے لطیفے چھیڑ دیے کہ میں اپنا قصور ہی بھول گیا اور بے اختیار کھلکھلانے لگا۔ بعد میں کبھی مولانا نے نہ میری اِس شرمناک حرکت کی طرف اشارہ کیا نہ مجھے معذرت ہی کرنے کا موقعہ دیا!

میری علیحدگی

دوسرے دور میں الہلال چھ مہینے زندہ رہا۔ اشاعت، چار ہزار سے اوپر ہو چکی تھی مگر مولانا کو عربی رسالے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی اور ٹائپ کے لیے مصر آرڈر بھیج دیا گیا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ عربی رسالہ بھی مجھی کو ایڈٹ کرنا تھا، اسی لیے میں نے صاف لفظوں میں عرض کر دیا تھا کہ عربی رسالے کی ذمہ داری اس وقت تک سنبھال نہیں سکتا، جب تک الہلال کے اسٹاف میں اور لکھنے والے نہ آ جائیں

اور مجھے اِس کے بوجھ سے کچھ ہلکا نہ کر دیا جائے۔ مولانا کو بھی تسلیم تھا کہ کام بہت ہے لیکن ٹائپ آ جانے کے بعد ان کا خیال بدل گیا اور مصر ہوئے کہ الہلال کے ساتھ عربی بھی لکھوں۔ یہ بات میرے امکان سے باہر تھی۔ فرمایا، تو پھر الہلال بھی بند کر دینا پڑے گا اور ہوا بھی یہی۔

الہلال کے بعد میرا ساتھ رہنا بے معنی تھا۔ میں نے علیحدگی کی اجازت چاہی۔ تو اب بھی الگ کرنا نہیں چاہتے تھے، مگر حالات ایسے ہو چکے تھے کہ صاف لفظوں میں روکنے سے بھی شرماتے تھے چنانچہ گفتگو اِس ڈھب سے کی کہ علیحدہ ہونے کا خیال چھوڑ دوں۔ گفتگو درج ذیل ہے:

مولانا: مگر مولوی صاحب، آپ جائیں گے کہاں؟ کسی اردو اخبار میں جگہ نہیں۔

میں: تو آپ سمجھ رہے ہیں کہ جا کر کسی اخبار میں نوکری کروں گا؟ کیا میں آپ کے اخباروں میں نوکر تھا؟

مولانا: مولوی صاحب، آپ پھر گرم ہو گئے۔ میرے ساتھ تو آپ ایک عزیز کی طرح تھے۔ مگر جاننا چاہتا ہوں کہ الگ ہو کر آپ زندگی کیسے بسر کریں گے؟

میں: مولانا اتنی مدت آپ کے ساتھ رہا، مگر آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں زندگی بسر کرنے کے طریقے جانتا ہوں۔

مولانا: میری صلاحیتوں کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے لیکن مجھے آپ کے مستقبل کی فکر ہے۔

میں: آپ میرے مستقبل کے لیے فکرمند نہ ہوں۔

مولانا: اس طویل رفاقت کے بعد قدرتی طور پر یہ جاننے کی خواہش ہے کہ آئندہ آپ کی مشغولیت کیا ہوگی؟

میں: فرض کر لیجئے، ملیح آباد میں کھیتی کروں گا!

مولانا: (ہنس کر) یہ تو کہنے کی بات ہے۔ سنجیدگی سے گفتگو کیجئے۔

میں: اس بارے میں گفتگو لاحاصل ہے۔ جو کچھ کرنا ہے، کروں گا، البتہ یقین دلاتا ہوں کہ جناب کو کبھی زحمت نہیں دوں گا۔

بہر حال مولانا نے اجازت دے دی اور میں دَم دَم کنٹونمنٹ میں اپنے عرب دوست سید محمد عمری مرحوم کی کوٹھی میں اُٹھ آیا۔ ایک پیسے کی آمدنی نہ تھی۔ مصر کے سب سے بڑے تین اخباروں: المقطم، الاہرام، البلاغ نے میرے لکھتے ہی نامہ نگار بنا لیا اور اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔

مولانا لگاتار چھ مہینے چپ رہے۔ نازوں کے پلے تھے۔ پیرزادے تھے۔ دولت کی بہتات رہی تھی۔ ایک دنیا رجھی ہوئی تھی۔ پھر حسین تھے۔ خود بھی اپنے حسن کا احساس رکھتے تھے، اسی لیے ''معشوقانہ ادائیں'' اور ضدیں عمر بھر باقی رہیں لیکن میں بھی آخر'' کچھ'' تھا۔ بے بلائے نہ جانے پر اڑا رہا۔

یہ مانا حسن کی فطرت بہت نازک ہے اے واثق
مزاج عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی ہے

مولانا کو خط لکھ کر مجھے بلانا ہی پڑا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے'' مولوی صاحب، آپ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ بڑے وہ ہیں آپ بھی!''

پورے چھ مہینے کی جدائی کے بعد...... چھ صدیوں کی جدائی کے بعد...... خط آتا ہے، مجھ سے مل جاؤ!

نہرو رپورٹ

یہ وقت وہ تھا، جب نہرو رپورٹ نکل چکی تھی اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی طرف سے اس کی شدومد سے مخالفت ہو رہی تھی۔ مخالفت، عقل و منطق سے خالی تھی اور لوگ جذبات کے دھارے میں بہہ رہے تھے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی، مخالفت کے سرغنہ تھے، اس لیے نہیں کہ رپورٹ مسلمانوں کے حق میں مضر تھی، بلکہ اس لیے کہ مولانا محمد علی کو پنڈت موتی لال نہرو سے ذاتی طور پر رنج ہو گیا تھا۔

میں اس وقت بھی رپورٹ کو مسلمانوں کے لیے اچھا سمجھتا تھا۔ آج بھی اچھا سمجھتا ہوں۔ مولانا کا بھی یہی خیال تھا اور یہ عجیب واقعہ ہے کہ کمیونزم کے معاملے کو چھوڑ کر تمام سیاسی اور دینی مسائل میں مولانا کی اور میرے رائے ہمیشہ ایک ہی رہی۔

بہر حال مولانا نے طلب کیا، قدرتی طور پر انہیں سب سے پہلے یہی پوچھنا تھا کہ کس حال میں ہو؟ میں نے اپنی نامہ نگاری کا حال بیان کیا۔ خوش ہوئے۔ پھر دفعتاً سوال کر بیٹھے'' اور نہرو رپورٹ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے اپنا خیال ظاہر کر دیا تو فرمایا'' کیا یہ مناسب نہیں کہ آپ رپورٹ کی تائید میں اخباری مہم شروع کر دیں! اس کام میں آپ کا وقت صرف ہوگا اور کانگریس آپ کو اس کا معاوضہ دے گی''

زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ اپنے کام کا معاوضہ کسی جماعت سے لینے کی تجویز سامنے آئی۔ بہت شرمندہ ہوا اور معاوضہ قبول کرنے سے انکار کیا، مگر مولانا قائل کر کے رہے اور میں نے اخباری مہم شروع کر دی۔ اس سلسلے میں مولانا کا ایک خط، لائق مطالعہ ہے۔ خط پر ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء کی تاریخ درج ہے:

''عزیزی، ایک مضمون اس غرض سے بھیج چکا ہوں کہ آپ اپنے دستخط سے اخبارات میں بھیج دیں۔ امید ہے آپ بھیج چکے ہوں گے۔ آج میں نے آپ کا مضمون زمیندار میں دیکھا، مضمون بہت اچھا ہے اور ان مسائل پر بحث کرنے کا یہ عنوان و اسلوب بالکل صحیح اور مؤثر ہے۔ اِسی عنوان و اسلوب سے جاری رکھئے۔

البتہ ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ نہرو رپورٹ کی حمایت کرتے ہوئے کوئی بات ایسی نہیں لکھنی چاہیے کہ لوگوں کو مبالغے کا گمان ہو۔ رپورٹ اور کانفرنس نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے جو اصول و مبادیات قرار دیئے ہیں، صحیح ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کی آزادانہ جدوجہد اور سیاسی و اجتماعی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ بلاشبہ اکثریت چاہے تو اس سے بھی زیادہ امتیازات دے سکتی ہے لیکن معلوم ہے کہ کوئی جماعت امتیازات بخشنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتی اور ہندوستان جیسے ملک میں معیار یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک جماعت نے دوسری جماعت کو کوئی خاص امتیاز دیا یا نہیں، بلکہ یہی ہوسکتا ہے کہ کسی جماعت کی آزادانہ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں رکھی گئی ہیں یا نہیں؟

پس یہ جو آپ نے ایک دو جگہ لکھا ہے کہ ''نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کو جس قدر دیا گیا ہے، اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے'' یا ''کیا مخالفانہ شور و شغب اس لیے ہے کہ ہندوؤں کو دبا کر کچھ اور لے لیا جائے'' اس میں نہرو رپورٹ کے اس پہلو کا جس درجہ اعتراف پایا جاتا ہے، اسے کسی قدر معتدل کر دینا چاہیے اور ہمیشہ یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ کافی اور تشفی بخش ہے، نہ یہ کہ بہت زیادہ ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بھی واضح کر دیجئے کہ نہرو رپورٹ میں ابھی جزئی ترمیم و تغیر کی پوری گنجائش باقی ہے اور مسائل پر مزید غور و فکر کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے چنانچہ خود ابوالکلام نے اپنے مضامین میں متعدد امور سے اختلاف کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ کمیٹی کو مزید غور و فکر سے انکار نہیں۔ نیز بنگال پراونشل مسلم لیگ نے بھی اپنی تجویز میں چار باتوں کو مزید غور و فکر کا محتاج ظاہر کیا ہے۔ پس اگر کسی شخص یا جماعت کو اختلاف ہے، تو یہ اختلاف کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں لیکن یہ نہیں کرنا

چاہیے کہ جزئی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے قتلِ عام کا شور مچا دیا جائے۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام مسلمان، مسائل کی نسبت صحیح رائے قائم نہیں کرسکیں گے اور غلطیوں کا شکار ہوجائیں گے۔

آپ نے اس دن ایک باورچی کا ذکر کیا تھا کہ وہ آپ کے یہاں آیا ہے، مگر آپ چاہتے ہیں کہیں رکھوا دیں۔ اگر وہ چپاتی اور معمولی سالن اچھا پکا لیتا ہو، تو کیوں نہ اسے یہاں بھیج دیجئے۔ جو تنخواہ اس سے طے کرلیجئے گا، وہ دے دی جائے گی۔

ایک اور خط

نہرور پورٹ ہی کے سلسلے میں مولانا کا ایک اور خط ملا ہے۔ دہلی سے لکھا گیا ہے اور ۴ نومبر ۲۸ء کی تاریخ درج ہے لکھتے ہیں:

"عزیزی! اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مطلوبہ رقم آپ کو نہیں بھیجی گئی ہے۔ جن لوگوں کو بھیجنا تھا، وہ سفر میں ہیں اور یہاں سے واپس جا کر بھیجیں گے۔ چونکہ آپ نے کہا تھا کہ ۱۰ نومبر کو لکھنؤ جانے کا قصد ہے، اس لیے میں نے خیال کیا آپ کو روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ میں آپ کو ۷۵ روپے کا ایک چیک اپنے پاس سے بھیج دیتا ہوں۔ وہاں کی رقم خود وصول کرلوں گا۔ یہ چیک امپیریل بینک کے نام ہے۔ آپ کسی ضرورت سے کلکتہ جائیں تو اِسے بھنوالیں، یا معین[۲۴] کو دے دیں۔ وہ روپیہ لا دے گا۔

یہاں بعض اشخاص نے مجھ سے کہا ہے کہ اپنے کسی مضمون میں شوکت علی صاحب کو بہت بُرا بھلا لکھا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی کوئی تحریر اس قسم کی نہ نکلی ہوگی۔ بہر حال اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ شخصاً کسی شخص کی برائی نہ کی جائے اور جو کچھ لکھا جائے، اعتدال سے باہر نہ ہو۔

سلسلہ بلا انقطاع جاری رکھئے۔

میں نے آپ کے آئندہ کاموں کی نسبت ایک تجویز سوچی ہے۔ غالباً نومبر کے آخر تک آپ لکھنؤ سے واپس آجائیں گے۔ اس وقت زبانی کہوں گا۔ اگر آپ ۱۱ نومبر تک لکھنؤ پہنچ جائیں تو ۱۲ کو لکھنؤ میں بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔ کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے کی وجہ سے وہاں جانا پڑے گا۔ غالباً میں ۱۲ کو پہنچوں اور ۱۳ تک ٹھہروں۔ اگر آپ ایک دن کے لیے ملیح آباد سے لکھنؤ آجائیں تو بہت بہتر ہو۔

مولانا سے انتقام

مولانا سے الگ ہو جانے کے بعد میں ایک مدت پارک سرکس میں بھی مقیم رہا۔ مولانا کا مکان قریب تھا اور مولانا نے دستور بنالیا تھا کہ جو لوگ جلسوں میں شرکت کی دعوت دینے جاتے ،انھیں میرے پاس بھیج دیتے کہ اسے لے جاؤ۔ کبھی کبھی انہیں میرے نام رقعہ بھی دے دیتے۔ اس قسم کے جلسوں سے میرا ناک میں دم آ گیا تھا اور میں بچاؤ کی فکر میں سرگرداں رہتا تھا۔ آخر ایک ترکیب سوجھی۔

مولانا کے بہنوئی، واجد خاں صاحب مرحوم، بھوپال میں مالیات کے سکریٹری تھے اور اب ریٹائر ہو چکے تھے، مگر نئی ملازمت کے خواہشمند تھے۔ میں نے خاں صاحب کو سنانے کے لیے مولانا کے ایک سسرالی رشتہ دار سے کہا تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس وقت کارپوریشن میں بڑی اچھی جگہ موجود ہے۔ بارہ سو روپیہ تنخواہ ہے۔ چیف ایگزیکٹو آفیسر کی جگہ۔ کارپوریشن پر کانگریس کا قبضہ ہے۔ مولانا دو سطریں سفارش میں لکھ دیں گے، تو فوراً تقرری ہو جائے گی لیکن مولانا اپنوں کی سفارش نہیں کرتے اور کریں بھی کیوں، جبکہ انھیں کوئی مجبوری نہیں کرتا۔ صبح چار بجے اُٹھتے ہیں۔ چائے بنا کر پیتے ہیں اور تصنیف و تالیف میں لگ جاتے ہیں۔ اِس وقت اگر کوئی شخص اڑ کر بیٹھ جائے کہ ہم سفارش لکھائے بغیر ٹلیں گے نہیں، تو مولانا اپنی جان چھڑانے کے لیے ضرور لکھ دیں گے!

خاں صاحب نے یہ تقریر بڑی توجہ وانہماک سے سنی اور کہنے لگے، مگر اس ملازمت میں عمر کی قید بھی ضرور ہوگی؟ میں نے کہا پکی عمر والے کو ترجیح دی جاتی ہے، کیونکہ عہدہ انتظامی ہے اور تجربہ کار آدمی اُسے خوب نباہ سکتا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ خاں صاحب نے رات ہی کو غسل کیا۔ اچھے کپڑے پہنے اور اپنی بیگم صاحب، یعنی مولانا کی بہن کو ساتھ لے کر صبح چار بجے مولانا کے گھر پہنچ گئے۔ بے وقت آمد پر مولانا کو سخت تعجب ہوا اور جب ملازمت کے لیے سفارش پر اصرار شروع ہوا تو نہایت مکدر اور برہم ہوئے۔ بڑی دیر تک حجت و تکرار رہی۔ بہن کی ضد تھی کہ دو لفظ لکھ دو اور مولانا خفگی سے چلاتے تھے، یہ کیا لغویت ہے! آخر دریافت کیا کہ یہ مشورہ کس نے دیا ہے۔ اور جب میرا سنا، تو ہنسنے لگے اور فرمایا "محض مذاق ہے! تمھیں بے وقوف بنایا ہے!

دس بجے میری طلبی ہوئی اور فرمایا "مولوی صاحب، یہ کیا حرکت تھی؟ آپ نے میرا پورا دن ہی برباد کر ڈالا" عرض کیا "مولانا، معاف فرمائیے، میں بھی جلسوں سے بہت تنگ آ چکا ہوں!" مسکرائے اور فرمایا "تو آپ نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ مطمئن رہیے۔ پھر کسی جلسے والے کو آپ کے پاس نہیں بھیجوں گا!"

مولانا پر تنقید

مولانا سے علیحدگی کے بُعد میں خالی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ایک مدت تک پشاوریوں کے اخبار "پیام" کو آنریری طور پر ایڈیٹ کرتا رہا۔ پھر عجیب و غریب حالات میں روزانہ "ہند" جاری کیا۔

"ہند" کی اشاعت پر مولانا بہت خوش ہوئے مگر اخبار نویسی میں ذاتی تعلقات کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ مجھے مجبوراً خود مولانا کے خلاف بھی تین مضمون لکھنا پڑے تھے، حالانکہ فنِ اخبار نویسی میں میں نے مولانا سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

واقعہ یہ ہوا کہ "پیام" نکل رہا تھا۔ مولانا کے قدیم دوست، شفاء الملک حکیم سید محمد صادق صاحب مرحوم و مغفور نے ایک انگریزی رسالہ مجھے دکھایا۔ رسالے میں ایک جرمن ڈاکٹر کا مضمون تھا، جس نے دعویٰ کیا تھا کہ آدمی اگر اپنی بیوی کا دودھ پیا کرے اور بیوی اپنے شوہر کا، تو بیوی کو اولاد نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ جوان رہے گی۔ شوہر کی چھاتیوں میں بھی دودھ اُتر آئے گا اور اس طرح برابر دودھ پیتے رہنے سے دونوں کی محبت اٹل ہو جائے گی۔ شکلیں بھی ایک ہو جائیں گی، اور وہ دو ہوتے ہوئے بھی سچ مچ ایک وجود بن جائیں گے!

رسالے میں یہ بھی لکھا تھا کہ جرمن ڈاکٹر پر بداخلاقی کی تبلیغ کے الزام پر برلن میں مقدمہ چلا، ڈاکٹر نے اپنے نظریئے کی تائید میں یورپ اور امریکا کے بڑے بڑے محققوں کو طلب کیا۔ انہوں نے ڈاکٹر کی تصدیق کی اور عدالت نے اسے بری کر دیا۔

شفاء الملک مرحوم نے فرمایا، عجیب و غریب مضمون ہے۔ ہندوستان میں بھی اشاعت ہونا چاہیے، مگر کسی اخبار یا رسالے میں شائع کرنے کی ہمت نہیں اس پر میں نے مضمون کا ترجمہ "پیام" میں شائع کر دیا۔

اس وقت تو کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن جب "ہند" نکلا اور اس نے فرقہ پرستی، انگریز پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی اور جمود و تقلید کے قلعوں پر یلغار شروع کی تو مفسدوں نے اسی مضمون کو لے کر فتنہ برپا کر دیا۔

ایک استفتا مرتب کیا گیا کہ اگر کوئی شخص، بیوی کا دودھ پی لے، تو شرعاً رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔ اس پر علماء سے رجوع کیا گیا، ان کے فتوے، جو میرے خلاف تھے، رسالے کی صورت میں ''اظہار الحق'' کے نام سے شائع کر دئے گئے۔

فتنے کے دوران میں مولانا سے ملاقات ہوئی تو نصیحت کی کہ فتنہ انگیز بحثوں سے بچنا چاہیے مگر یہ بھی فرمایا کہ شرعی مسئلہ تو وہی ہے، جو تم نے لکھا ہے۔ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے اختلاف کیا ہے لیکن جب رسالہ ''اظہار الحق'' میں نے دیکھا، تو اس میں مولانا کا فتویٰ بھی موجود تھا۔ لکھا تھا اگر اتفاقیہ دودھ منہ میں چلا جائے، تو رضاعت ثابت نہ ہوگی، ورنہ بالقصد دودھ پینا شرعاً جائز نہیں!

مجھے سخت غصہ آیا اور ایک بہت ہی تیز و تند مضمون مولانا کے فتویٰ کے خلاف لکھ ڈالا!

باقی دو مضمون، کمیونزم کے سلسلے میں تھے۔ مولانا نے خطبہ عید میں کمیونزم کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر میری جیب میں سو روپے اور تمہاری جیبیں خالی ہیں، تو کمیونزم کہتا ہے کہ تم زبردستی میری جیب خالی کر لو! کیا یہ عدل و انصاف ہے؟ کیا یہ تعلیم فطرت کے مطابق ہے؟

اس پر میں نے بڑی سختی سے تنقید کی تھی۔ ''ہند'' مولانا کی خدمت میں برابر حاضر ہوتا تھا اور مولانا کا دستور تھا کہ جو چیز بھی سامنے آ جاتی، پڑھتے ضرور تھے۔ دواؤں کے اشتہار بھی نہیں چھوڑتے تھے اور اپنے اس مطالعے کے نفسیاتی نتیجے بیان کیا کرتے تھے، ''ہند'' میں اپنے خلاف میرے مضامین بھی پڑھے ہوں گے لیکن خفگی یا شکایت کیا معنیٰ، کبھی تذکرہ تک نہیں کیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں! عجیب ظرف تھا!

مولانا کے مخالف

آدمی کو عظمت ملتی ہے، تو حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور سراسر بے قصور ہونے پر بھی اسے حاسدوں کی دشمنی کا نشانہ بن جانا پڑتا ہے۔ مولانا، ہندوستان کے آسمان پر چمکے، تو حسد کی آگ بھی بھڑک اٹھی ہے۔ بے شمار حامیوں اور مداحوں کے پہلو بہ پہلو مخالفوں اور بدخواہوں کی صفیں بھی کھڑی ہو گئیں، مولانا نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، مگر ان کا یہ ''قصور'' کیا کم تھا کہ وہ عظمت اور بڑائی لے کر پیدا ہوئے تھے!

مخالفوں میں دو قسم کے لوگ تھے: مولوی اور سیاسی لیڈر۔ حاسد مولویوں نے مانا ہی نہیں کہ مولانا بھی علوم دین کے عالم ہیں۔ یہ بزرگ یہی کہتے اور لوگوں کو باور کراتے رہے کہ ابوالکلام، محض ایک لسان، چرب زبان آدمی ہیں۔ شد بد عربی جانتے ہیں اور لفظوں کا طلسم باندھ کر ''مولانا'' بن بیٹھے ہیں۔ بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والوں کے خیال میں یہ بات کیونکر آ سکتی تھی کہ جس شخص نے درس نظامی پڑھانے والے کسی مدرسے کی دستار فضیلت سے اپنے سر کو بوجھل اور چہرے کو بدنما نہیں بنایا، وہ عالم بھی ہو سکتا ہے! ملا جامی اور قطبی جیسی کتابیں ہی اِن ''علمائے دین'' کے نزدیک علم و حکمت کے سرچشمے تھیں اور ان کا ایمان تھا کہ جس کسی نے سبقاً سبقاً رٹی نہیں اور ''اساتذۂ کرام'' کی تقریریں یاد نہیں رکھیں، وہ مولوی بھی نہیں ہو سکتا، محض جاہل ہے! بلکہ یہ حضرات تو دارالعلوم ندوہ کے فاضلوں کو بھی جہلا ہی میں شمار کرتے رہے کیونکہ ندوہ نے درس نظامی سے کچھ انحراف کیا ہے!

بے شک مولانا نے دیو بند، فرنگی محل، ندوہ وغیرہ میں کبھی ایک سبق بھی نہیں پڑھا لیکن بانجھ درس نظامی کی تکمیل بھی انہوں نے اپنے گھر پر کر لی تھی،[۲۵] مگر علمائے کرام آخر علمائے کرام ٹھہرے۔ مولانا نے علمی ٹکسالوں سے تو ''دستار فضیلت'' حاصل نہیں کی تھی، اس لیے علم و فضل کے ٹھیکے داروں کے نزدیک مولانا محض ایک آفاقی آدمی ہی رہے!

اور جب مولانا نے علم و معرفت کے دریا بہانا شروع کیے تو اِن ''دانش مندوں'' نے شور مچا دیا کہ اپنے والد کی تحریریں چھاپ رہے ہیں! لیکن مسئلہ خلافت، ترک موالات، مساجد میں غیر مسلم کے کے داخلے کی وقتی بحثیں نکلیں، تو یہ کٹ حجت اب بھی کہنے سے باز نہیں رہے کہ یہ مباحث بھی مولانا کے والد کے منبع علم سے پھوٹے ہیں!

لکھتے ہوئے دل خون ہوتا ہے کہ ایک نہایت متین عالم دین نے بھی جنھیں مولانا بہت نواز چکے تھے، اپنا شیوہ بنا رکھا تھا کہ بازاروں تک میں چلتے پھرتے مولانا کی برائیاں کریں اور پکڑ پکڑ کر لوگوں سے کہیں کہ آزاد جاہل شخص ہے اور الہلال صرف میرے قلم کا نتیجہ ہے!

خدا اِن صاحب کی مغفرت کرے۔ دور اول کے الہلال میں ملازم تھے پھر اتفاقات زمانہ اور اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت بڑا نام پیدا کیا۔ نام وری نے مولانا آزاد سے حسد کی آگ دل میں سلگا دی اور حسد نے بڑھتے بڑھتے جنون کی شکل اختیار کر لی۔ اب مرحوم ہر کس و ناکس سے حتیٰ کہ اَن پڑھوں سے بھی مولانا کی بدگوئی کرنے لگے۔

ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جب میں الہلال میں کام کرتا تھا، تو ایک دن مغرب کے وقت مولانا آزاد نے کہا، ذرا نماز پڑھ آؤں اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئے۔ میں نے دروازے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا، تو مولانا بڑے مزے سے صوفے پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور اللہ اکبر کی صدائیں اِس طرح بلند کر رہے تھے، جیسے نماز پڑھ رہے ہوں!

یہ گفتگو سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا اور میں نے راویوں سے کہا، حاسد مولانا تو عالم دین ہیں۔ ان سے پوچھو کہ شریعت نے کیا تجسس کی اجازت دی ہے؟ کسی کے گھر میں جھانکنا بہت بڑا اخلاقی و شرعی گناہ ہے۔ اس گناہ کا مرتکب اول درجے کا فاسق ہے اور فاسق کی شہادت نا قابل قبول ہے۔ یقیناً ان حضرت نے بہتان باندھا ہے اور اگر مولانا آزاد، جو ان کے بقول واقعی نماز نہیں پڑھ رہے تھے، بلکہ صوفے پر بیٹھے تھے، اُٹھ کر جھانکنے والے کی آنکھیں کسی اوزار سے پھوڑ دیتے، تو ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق برسرِ حق ہوتے یا قابل مواخذہ؟

بعد میں خود مولانا سے میں نے اِس نسبت کا تذکرہ کیا، تو دل کھول کے ہنسے اور صرف یہ فرمایا:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو!

لیکن انہی بہتان طراز مولانا نے، جو خیر سے صوفی بھی بن گئے تھے، کئی حجوں کا ثواب بھی بٹور چکے تھے، طہر و تقویٰ و تقدس میں کسی کو اپنا مثیل نہیں سمجھتے تھے، ہاں انہی حضرت مولانا نے زندگی کے ٹمٹماتے چراغ کی مدھم روشنی میں کیا گل کھلایا؟...... خفیہ طور پر ہندوستان سے اپنا سرمایہ، پاکستان روانہ کر دیا مگر کسٹم والوں نے دھر لیا اور حضرت مولانا وبالفضل اولانا، قانون کے چنگل میں پھنس گئے! اب نہ تصوف رہا، نہ طہر و تقویٰ کے دعوے رہے، نہ ابوالکلام پر صلواتوں کی بوچھاڑ رہی، انتہائی عجز و مسکنت کے ساتھ اِسی ابوالکلام کے دامن میں پناہ لینا پڑی لیکن قانون کی گرفت سے نکلتے ہی پھر حسد کی چُھریاں سنبھال لیں اور محسن کے گلے پر چلانا شروع کر دیں...... شرافت و نجابت، دین داری و پرہیز گاری کا کیسا عجیب مظاہرہ ہے!

اور اس کے بعد کیا ہوا؟ حضرت مولانا وبالفضل اولانا بالکل کھلا دھوکا دے کر پاکستان چل دیے۔ وہاں بڑے بڑے سبز باغ دکھائے گئے تھے مگر جلد ہی حضرت نے اپنے ہاتھوں میں ڈھاک کے تین پات کے سوا کچھ نہ پایا۔ اب تو ہوش اڑ گئے۔ پاس کی پونجی کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پاکستان میں خود پونجی پگھلنے لگی تو بلبلا اٹھے۔ اب پھر اسی ابوالکلام کے نام عاجزانہ خط آنے

لگے کہ ہندوستان لوٹ آنے کی اجازت مل جائے۔ مولانا کا مصمم ارادہ تھا کہ حضرت کو عزت کے ساتھ واپسی کی اجازت دے دی جائے مگر اس سے پہلے ہی وہ مرحوم ہو گئے!

مولانا سے بغض للہی رکھنے والوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ایک ذات شریف نے جو عالم دین ہونے کے مدّعی تھے۔ خود مجھ سے سوال کیا، مولانا کچھ پیتے بھی ہیں؟ عرض کیا۔ جی ہاں پانی اور چائے تو ضرور پیتے ہیں۔ فرمایا، بندہ مشروبات محرمہ شرعیہ کی نسبت دریافت کر رہا ہے! عرض کیا ،آپ نے ان چیزوں سے انھیں آلودہ دیکھا ہے؟ فرمایا نہیں۔ عرض کیا، پھر کس شیطان نے وسوسہ قلب اطہر میں ڈالا ہے؟ فرمایا "لوگوں کی زبانی سنا ہے۔" عرض کیا افسوس مولانا ہو کر آپ دین سے کھیلتے ہیں۔ قرآن مجید میں آپ نے پڑھا نہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا
قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ! (۶:۴۹)

حضرت اپنا سا منہ لے کر رہ گئے!

کس کس کا رونا رویا جائے۔ ایک صاحب خود معترف ہیں کہ پہلے پکے ملحد تھے۔ پھر خیالات بدلے اور بفضل الٰہی نعمت اسلام و "ایمان" سے مالا مال ہو گئے۔ کچھ مدت "وہابیت" کا غلبہ رہا۔ پھر صوفی باصفا بن کر حال و قال، میں ڈوب گئے۔ سب تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں لیکن ایک تبدیلی نہ ہونا تھی نہ ہوئی...... مولانا آزاد سے بغض للہی کا تنور سینے میں جلتا ہی رہا!

کھل کر تو پبلک میں آنے کی ہمت کبھی ہوئی نہیں، بس بچھو کی طرح ڈنک مارتے رہے۔ آخر اسلام میں منافقوں کی جگہ کیوں خالی رہے؟

نج کی صحبتوں میں مولانا کی تضحیک و ہجو، سب سے بڑی عبادت رہی مولانا کی غیبت کو غیبت مانا ہی نہیں، کیونکہ اب اپنے آپ کو عالم الغیب والشہادہ بھی سمجھنے لگے تھے لیکن حضرت کو ایک ریاست سے وظیفہ ملتا تھا۔ سیاسی تبدیلیوں کی لپیٹ میں پڑ کر بند ہو گیا، تو اب کہاں کا تصوف کہاں کا تقویٰ و توکل۔ الا اللہ کی ضربیں بھول گئے اور اسی ابوالکلام کی چوکھٹ پر آ پڑے، جس کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہے تھے! ابوالکلام نے تیوری پر بل ڈالے بغیر معاف کر دیا اور وظیفہ بھی جاری ہو گیا!

دین کے دیوانے تھے۔ عشق الٰہی کے متوالے تھے، مگر اتنا ہوش باقی تھا کہ اب ابوالکلام منسٹر ہے اور حکومت ہند کا کرتا دھرتا۔ اسی "ہوش" کا نتیجہ تھا کہ اپنے محبوب لیڈر کی سوانح شائع کی۔ تو

بالکل گنجی، لنڈوری، بے ربط، بے جوڑ۔ وجہ یہ ہوئی کہ اِس لیڈر کی سوانح چٹ پٹی بن ہی نہیں سکتی تھی، جب تک ابوالکلام پر چوٹیں نہ کی جائیں، مگر وزیر ابوالکلام کے منہ آنا اب ''ہوش مندی'' کے خلاف تھا، لہٰذا بے چارے محبوب لیڈر کی سوانح پھُسی پھُسی ہو کر رہ گئی!

لیکن آزاد کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس مومن کامل اور صوفی باصفا کی کینہ پروری انگڑائی لے کر پھر جاگ اٹھی۔ زہر میں بجھا ہوا قلم دوڑ پڑا اور نیش زنی شروع ہوگئی۔ عبداللہ بن اُبی وغیرہ کی روحیں خوش ہوگئیں، شرافت، للّٰہیت، انسانیت، جواں مردی کو سر پیٹنے دو!

اس قسم کے معاملات برابر پیش آتے رہتے تھے اور مولانا کی عظمت دل پر چھاتی چلی جاتی تھی۔ اُدھر سے زیادتیاں، اِدھر سے صبر و تحمل لیکن کبھی کبھی رگوں میں خون کھولنے لگتا اور خباثتوں کے مقابلے میں مولانا کا عفو و کرم میرے لیے سخت غیظ و غضب کا سبب بن جاتا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ مولانا سب کچھ سمجھتے ہیں، حدودِ ادب سے تجاوز کر کے عرض کرتا، مولانا! یہ کیا ہے کہ آپ اپنے دشمنوں کو بھی نہیں پہچانتے؟ سنتے اور مسکرا دیتے۔ آخر ایک دن غصہ سے بے خود ہو کر عرض کیا ''مولانا انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ آپ کے دل میں اپنے چاہنے والوں کی تو قدر نہیں لیکن دشمنوں کو نوازنے پر مستعد رہتے ہیں۔ اس روش کا مطلب تو یہ ہوا کہ دوست بھی دُشمن بن جائیں اور آپ کی نوازشوں سے دامن بھر لیں۔''

''ہنسے۔ بہت ہنسے۔ آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ اُٹھ بیٹھے اور بڑی سنجیدگی سے فرمایا ''مولوی صاحب، ہمیں لوگوں کی نادانیاں معاف کرنا چاہیے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ یہی ہے!''

اب میں کیا کہتا۔ ندامت سے سر جھک گیا اور دل نے کہا، بے شک یہ شخص بڑا آدمی بن کر پیدا ہوا ہے!

تحمل و بردباری، عفو و درگزر، مولانا کے بہت نمایاں وصف تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی پر خفا ہو رہے ہوں۔ کسی کو ڈانٹ رہے ہوں۔ کوئی بدکلمہ کسی کے حق میں کہہ رہے ہوں۔ نوکروں پر بھی بگڑتے نہیں تھے۔ ایک نوکر، خط کھول کر پڑھ لیتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن ایسا ہوا کہ مولانا نے لفافے، ڈاک میں ڈالنے کو دیے۔ نوکر لے کر چلا گیا۔ کچھ فاصلے پر میدان تھا۔ وہاں نوکر نے اطمینان سے بیٹھ کر لفافے کھولے اور خط پڑھنے میں معروف ہو گیا۔ مولانا ٹہلنے نہیں جاتے تھے۔ اس دن میدان کی طرف چل پڑے اور اپنی آنکھوں سے نوکر کی حرکت دیکھ لی۔ کس قدر اشتعال کا موقعہ تھا مگر کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ البتہ نوکر کو برخاست کر دیا۔

دسترخوان

مولانا اپنے معمولات میں وقت کے بڑے پابند تھے۔ خصوصاً کھانے اور سونے کے اوقات میں خلل پڑنا گوارا نہ تھا لیکن لکھنے کے معاملے میں وقت کی پابندی نہ تھی۔ اخبار نکل رہا ہے اور اخبار کو وقت ہی پر نکلنا چاہیے۔ اخبار کا ایڈیٹر خود اپنا مالک نہیں رہتا، اپنے اخبار کا غلام بن جاتا ہے۔ جی چاہے نہ چاہے، وقت ہی پر کام کرنا پڑتا ہے لیکن مولانا، اخبار کی غلامی سے بالکل آزاد رہے۔

میری رفاقت کے زمانے میں مولانا کی خوراک، جثے کے لحاظ سے کم نہیں، زیادہ کہی جا سکتی تھی لیکن زندگی کے آخری دور میں غذا بہت کم ہو گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا موقوف ہو گیا تھا۔ ڈھائی تین بجے چائے اور ہلکا سا ناشتہ رہ گیا تھا۔

صبح تین چار بجے ضرور جاگ جاتے تھے۔ اس وقت میرا ساتھ نہیں ہوتا تھا لیکن اچھا خاصہ ناشتہ کرتے تھے اور مرغ کی یخنی بھی پیتے تھے۔ سات بجے پھر چائے اور ناشتہ ہوتا تھا۔ اس موقع پر اکثر میری حاضری ضروری تھی۔ عام طور پر ٹوسٹ، مکھن اور سستے بسکٹ ہوتے تھے۔ یہ بسکٹ مولانا کی سسرال، کالن اسٹریٹ میں بنتے تھے۔ بہت خستہ اور لذیذ ہوتے تھے۔ چائے کبھی لپٹن کی کبھی بروک بونڈ کی ہوتی تھی۔ چائنا ٹی کا معاملہ بہت بعد میں شروع ہوا۔

چائے میں مولانا کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ نہایت لذیذ چائے بناتے تھے۔ مجھے تو کیتلی تک چھونے کی اجازت نہ تھی۔ فرمایا کرتے تھے، بھدے ہاتھ ہیں۔ چائے جیسی لطیف و نازک چیز کو گوارا نہیں ہو سکتے! پیالیاں تک دھونے کی ممانعت تھی۔ ہنستے اور کہتے ''مولوی صاحب، آپ کا ہاتھ پیالی کو لگا اور چائے دانی کے اندر کی چائے غارت ہو گئی!'' کبھی کبھی اس قسم کی ''توہینوں'' پر میرا منہ پھول جاتا تو دنیا جہان کے لطیفے شروع ہو جاتے اور میں ہنسنے لگتا۔ یہ جلیل القدر انسان کسی کو اُداس دیکھ نہیں سکتا تھا...... ہائے افسوس!

گیارہ بجے دوپہر کا کھانا کھا لیتے۔ دسترخوان پر چاول، سالن، بھاجی اور دال ہوتی۔ مٹھائی کبھی نہیں۔ کسی کھانے، کسی ناشتے پر نہیں، مٹھاس سے رغبت ہی نہ تھی لیکن سرکے، اچار کا شوق تھا۔ ہر کھانے پر سرکے میں گلی ہوئی پیاز، ادرک وغیرہ موجود ہوتی، یا پھر کڑوے تیل میں اٹھا ہوا آم، سیم یا اول کا اچار۔

کھانے کے بعد قیلولہ ضروری تھا۔ دو ڈھائی بجے اُٹھ جاتے اور چائے پیتے پھر سہ پہر کو چائے ہوتی اور ناشتہ بھی۔ اس موقع پر بسکٹوں کے علاوہ پھل، خصوصاً کیلے بھی ہوتے۔ رات کا کھانا بھی جلد کھا کر دس بجے سو جاتے۔ یہ کھانا بھی دن کے کھانے کی طرح ہوتا تھا، مگر چاول نہیں روٹی کھاتے تھے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ مولانا کو انواع واقسام کے کھانے کا شوق نہ تھا۔ چٹورپن سے نفرت تھی۔ عموماً سادہ کھانا کھاتے۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ دسترخوان پر کسی کھانے کی تعریف یا مذمت کی ہو۔ جو کچھ سامنے آجاتا، خوشی خوشی کھالیتے، مگر کھانے پر باتیں ضرور کرتے، عام طور پر تفریحی باتیں۔

مولانا کے باورچی

کھانے کا تذکرہ نکل آیا ہے، تو مولانا کے بعض باورچیوں کا بھی ذکر ہو جائے۔ ایک باورچی صاحب رکھے گئے، تو بڑے بُقراط نکلے۔ جو ترکاری ایک دن لے آتے، تو پھر روز وہی لاتے اور دونوں وقت پکاتے۔ مثلاً آلو لے آئے۔ اعتراض کیجئے، تو جواب میں لمبی تقریر کہ حضور، آلو معدے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ خون صاف کرتا ہے۔ اشتہا بڑھاتا ہے! اَروی پر اُتر آئے، تو اَروی کے فوائد سن لیجئے حضور، اَروی سب ترکاریوں کی ملکہ ہے۔ آدمی روز اَروی کھائے تو کبھی بوڑھا نہ ہو!''

ایک دفعہ کالے بینگن روز آنے لگے۔ میں نے ٹوکا تو بڑی سنجیدگی سے فرمانے لگے ''حضور، غور فرمائیں گے، تو بہت خوش ہوں گے کہ یہ غلام و بینگن کھلا رہا ہے۔ بینگن اعلیٰ درجے کا مصفی خون ہے۔ کچھ بادی تو ضرور ہے مگر یہ بادی پن ہی بینگن کا سب سے بڑا گن ہے۔ پیٹ میں ریاح پیدا کرتا رہتا ہے۔ آنتوں کے سدے ہوں تو بخارات سے گرم ہو کر نرم پڑ جاتے ہیں اور آسانی سے دفع ہو جاتے ہیں اور پھر حضور، بینگن کا رنگ تو دیکھئے۔ سبحان اللہ! ماشاء اللہ! آدمی عمر بھر بینگن کھائے تو اس کے رنگ میں بھی بینگن ہی جیسی چمک دمک پیدا ہو جائے۔''

ایک اور باورچی صاحب اپنی آپ ہی مثال تھے۔ ارسطو بھی ان سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ کھانے میں یا تو نمک ہی نمک ہوگا، یا بالکل ڈالیں گے نہیں۔ اِن کے ہاتھ کا پہلا پکوان سامنے آیا، تو نمک ندارد۔ کہا گیا، کھانے میں نمک نہیں ہے۔ فرمانے لگے ''جی یہی تو میں بھی کہتا ہوں!'' ارے

بھئی، نمک کا خیال رکھیے۔ پھیکا سیٹھا کھانا کس کام کا؟" "جی یہی تو میں بھی کہتا ہوں!" دوسرے وقت کھانے میں نمک ہی نمک، اور جواب وہی مرغے کی ایک ٹانگ "جی یہی تو میں بھی کہتا ہوں!"

ایک دفعہ مولانا کے ہاں کوئی باورچی نہ تھا۔ مجھ سے فرمایا تلاش کرو۔ میں نے مولانا عثمان مرحوم سے تذکرہ کیا، کہنے لگے میرے وطن مونگیر میں ایک بہترین باورچی موجود ہے، بوڑھا ہے۔ کم تنخواہ پر آ جائے گا۔ مولانا نے سنتے ہی تار پر روپیہ بھیج دیا اور باورچی صاحب تشریف لے آئے، مگر خود مولانا عثمان کے قد اور جثہ کے نکلے۔ ننھا سا ڈیل، چھوٹے چھوٹے، پتلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ مولانا دیکھ کر مسکرائے اور مولانا عثمان کے انتخاب کی داد دی!

یہ حضرت کھانا پکانا ہی نہیں جانتے تھے۔ برتن تک ٹھیک سے دھو نہ سکتے تھے۔ گم صُم، کسی خیال میں ڈوبے بیٹھے رہتے اور نگاہیں دیوار پر جمی رہتیں۔ ایک دن مولانا کی خدمت میں رقعہ بھیجنا تھا۔ میں نے پکارنا شروع کیا، کوئی ہے؟ جواب نہ ملا۔ اوپر کا کام کرنے والا لڑکا موجود نہیں تھا۔ میں دیر تک چیختا رہا۔ آخر اُٹھ کر باورچی خانے پہنچا، تو وہ حضرت چارپائی پر مصروف مراقبہ تھے، عرض کیا، اتنی دیر سے پکار رہا ہوں۔ آپ بولے بھی نہیں۔ فرمایا "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے، جو بولتا۔"

فقر و فاقہ

۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کی بات ہے کہ مولانا انتہائی مالی مصائب میں مبتلا تھے۔ میں تو گھر ہی کا آدمی تھا۔ ہر وقت کا ساتھ تھا اور مجھ سے گھر کی حالت چھپ نہیں سکتی تھی۔

دنیا جانتی ہے کہ مولانا از حد نفاست پسند، صاحب ذوق، نازک مزاج، شاہ خرچ آدمی تھے۔ جو کچھ ہو، بہتر سے بہتر ہو۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ سگریٹ کے عادی تھے اور قیمتی سے قیمتی سگریٹ پیا کرتے تھے لیکن اس زمانے میں سستے سے سستے، گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پر قانع تھے۔ یقیناً سخت اذیت میں مبتلا ہوں گے، آدمی کے لیے ہر مشکل آسان ہے، مگر ذہنی کوفت جھیلنا آسان نہیں۔ وہ بڑے انسان ہی ہیں، جو ذہنی اذیتوں اور دماغی کلفتوں میں بھی اعصاب پر قابو رکھتے اور اپنی اندرونی ویرانی ظاہر ہونے نہیں دیتے۔

مولانا نے آنکھ کھولی، تو سونے کا چمچا ہاتھ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نورِ نظر تھے۔ ہر طرف دولت ہی دولت بکھری ہوئی تھی۔ ایسے آدمی کے لیے تنگ دستی، دوسروں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتی ہے مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس زمانے

میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ ماتھے پر کبھی بل نہیں دیکھے۔ کبھی جھنجھلاتے نہیں، بلکہ کہہ سکتا ہوں ان ''خشک'' دنوں میں مولانا کی بشاشت وظرافت عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔

ارہر، مسور، مونگ کی ابالی دال اور بیچ نکلے ہوئے چاول، بارہا یہ ہمارا دوپہر کا کھانا ہوتا تھا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا کھانا ہوتا تھا! اور یہی وقت ہوتا تھا، جب مولانا کی بے پناہ خطابت و ذہانت ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑی ہو جاتی تھی اور مولانا کی زبان بے روک ٹوک چل نکلتی تھی۔ طوفانوں پر طوفان اٹھاتی تھی۔ سننے والا اکیلا میں، دم بخود بیٹھا رہتا۔ ٹکر ٹکر دیکھا کرتا۔ بھوک کا تقاضا سخت ہوتا۔ دستر خوان بچھا ہوتا مگر ابوالکلام کی زبان تھی! رُکتی کیسے؟ لیکن بے حد حساس بھی تھے: ''مولوی صاحب، آپ کچھ نڈھال سے دکھائی دیتے ہیں۔ مرض عشق میں تو مبتلا نہیں ہو گئے۔ یاد رکھیے:

کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا!

عرض کرتا، جناب مدت سے آنتیں قل ہواللہ پڑھ رہی ہیں۔ کھانا بھی پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ صاف کیوں نہ کر دیا جائے!

اس پر اور زیادہ جوش سے تقریر شروع ہو جاتی۔ بھوک سے میری بے تابیاں گویا قفل کا کام دیتی تھیں!

آخر کھانے کو نپٹانا ہی پڑتا تھا۔ اب مولانا کی فصاحت و بلاغت، اُبالی دال اور بھات کے فضائل ومناقب کے بیان پر ایسی رواں دواں ہوتی کہ آدمی محو حیرت ہو کر رہ جائے۔ یہ دال سب دالوں سے افضل کیوں ہے؟ بگھاری نہ جائے تو تندرستی ہی کے لیے نہیں، خود زندگی کے لیے بھی گارنٹی ہے۔ بگھار دینے سے دال کے خواص کس طرح بدل جاتے ہیں اور وہ کیوں تندرستی کے لیے خطرہ بن جاتی ہے؟

اس جلیل القدر انسان کی یہ تقریریں اس لیے ہوتی تھیں کہ اپنے رفیق طعام کو بہلائے رکھے اور احساس نہ ہونے دے کہ تنگ دستی کی مجبوریاں گھیرے ہوئے ہیں۔ میں تو سب کچھ جانتا بوجھتا تھا، مگر انجان بنا رہتا تھا کہ مولانا کی بشاشت میں فرق نہ آئے۔ خود بھی سمجھتے تھے کہ صورت حال سے باخبر ہوں مگر کچھ فرماتے نہیں تھے۔ میں مہمان تھا اور میرا میزبان، عسرت کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ عجب گومگو کا معاملہ تھا مگر میرے لیے لذیذ کھانے سے زیادہ مولانا کی تقریریں پسندیدہ تھیں۔ دعائیں کرتا کہ مصیبت کے یہ دن دراز ہوں اور میں مولانا کی زبان سے بکھرتے ہوئے پھول چنتا رہوں!

آفت کے انہی دنوں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھ مولانا آزاد سبحانی کلکتہ آئے اور مولانا کے مہمان بنے۔ سبحانی صاحب کو مولانا، پسند نہیں کرتے تھے۔ صرف مولانا ہی نہیں، دوسرے ثقہ لوگ بھی مرحوم سے دور ہی رہنا چاہتے تھے۔ آدمی لائق تھے۔ بہترین مقرر تھے مگر کوئی ایسی بات بھی تھی کہ تمام قابلیتوں کے باوجود مقبول نہ ہو سکے اور زندگی افسوس ناک طریقے پر بسر کی۔

اِن دنوں مولانا سبحانی گاندھی جی کے پکے چیلے بنے ہوئے تھے۔ سر ننگا پاؤں ننگے۔ لنگوٹی بندھی ہوئی۔ داڑھی اور سر کے بال کھچڑی۔ نہایت مُضحِک صورت تھی۔

مولانا آزاد کی نفاست پسند طبیعت، دیکھتے ہی بے زار ہو گئی۔ ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا۔ بار بار بے بسی سے میری طرف نگاہیں اُٹھاتے تھے، واقعی بے بس ہی تھے۔ مہمان کو کہتے تو کیا کہتے؟ لیکن میں خوب سمجھ رہا تھا اور بعد میں خود مولانا نے بھی ظاہر کر دیا کہ سبحانی صاحب کے نازل ہو جانے سے ان کے دل و دماغ کو وہ کوفت ہوئی کہ رانچی کی پوری نظر بندی میں اس کے عشرِ عشیر سے بھی سابقہ نہ پڑا تھا!

لیکن یہ شخص، کوہِ وقار و حلم تھا۔ سنبھل گیا اور بڑی خندہ پیشانی سے پہلے علی بھائیوں سے پوچھا، کیا کھاؤ گے؟ آپس میں سخت چشمک تھی۔ بڑی رقابت تھی۔ عداوت کہنا بھی شاید غلط نہ ہو لیکن مل جاتے تھے تو صحبتیں نہایت پرلطف ہوتیں۔ ایسی ایسی بے تکلفیاں برتی جاتیں کہ بیان میں نہیں آسکتیں۔ شوکت علی مرحوم و مغفور تو بس ''بڑے بھائی'' تھے اور کسی کھیت کی بھی مولی نہ سمجھے جاتے تھے۔ بے تکلف صحبتوں میں خود بھی کہہ دیا کرتے تھے ''سگ باش، برادر بزرگ مباش!'' لیکن محمد علی ،محمد علی تھے۔ ذہانت، فطانت، حاضر دماغی، حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر ہاں، ابوالکلام بھی ابوالکلام تھا اور محمد علی کی تند ظرافت پر ابوالکلام کی لطیف ظرافت بھاری ہو جاتی تھی۔

بہر حال مولانا نے۔ بے تکلفی سے، ایسی بے تکلفی سے جیسی ''لنگوٹیا یاروں'' میں ہوتی ہے، علی بھائیوں سے کہا ''کیا زہر مار کرو گے؟'' خوب خوب چوٹیں چلیں۔ آخر پلاؤ، زردہ، قورمہ اور نہ جانے کیا کیا طے پا گیا۔ دونوں بھائی لذیذ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔

پھر مولانا نے باولِ ناخواستہ آزاد سبحانی مرحوم کو مخاطب کیا ''مولانا آپ اپنی پسند بتایئے'' مرحوم نے کئی پہلو بدلے۔ چاروں طرف نگاہیں پھرائیں۔ پھر کھلے تصنع سے بولے ''مولانا، میں تو دنیا ہی کو چھوڑ چکا ہوں! اناج سے اور اناج کے ہر پکوان سے قطعی اجتناب ہے۔ مہاتما جی سے عہد ہو چکا ہے''!

میں نے دیکھا کہ مولانا کا چہرہ تمتما اٹھا ہے، مگر جھیل گئے اور ہنس کر فرمایا "لیکن میرے بھائی، آپ ہوا کھا کر تو زندہ نہیں رہتے!" اشارہ تھا کہ آپ اودسرسانڈے تو نہیں ہیں، جس کی نسبت مشہور ہے کہ ہوا کھا کر جیتا ہے۔ مولانا سبحانی بہت خفیف ہوئے مگر چوکنے والے نہ تھے۔ کہنے لگے "فقیر اگر ممکن ہوتا ہے، تو صرف دو ہی چیزوں پر قناعت کرلیا کرتا ہے:...... کباب اور رس گلے!"

اس پر علی بھائیوں کے قہقہے بلند ہو گئے، مگر مولانا سبحانی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کباب اور رس گلے ہی کھائے۔ بس ٹوٹ ہی تو پڑے۔ اتنے کھائے، اتنے کھائے کہ شاید سانس لینے کی بھی پیٹ میں گنجائش نہ رہی ہو۔ یاد پڑتا ہے، بڑی قاب شامی کباب سے لبالب بھری تھی۔ سب چٹ کر گئے اور رس گلے تو یاد ہی ہیں۔ خود میں نے منگائے تھے۔ پورے دو سیر تھے۔ مشہور بنگالی دکان، بھیم ناگ سے!

لیکن اس فقر و فاقے میں یہ آفت جھیلی کیسے گئی؟

روپیہ قرض منگایا گیا۔ ایک پشاوری تاجر سے میں ہی جا کر لایا تھا!

عسرت کے اس زمانے میں مولانا گھر سے کہیں باہر نہیں جاتے تھے اور جانے پر مجبور ہوتے، تو کلکتہ میں ٹیکسی پر جاتے اور کلکتہ سے باہر ریل کے فرسٹ یا سیکنڈ کلاس میں۔ یہ سب بھی قرض ہی سے ہوتا تھا۔

امرودوں کی ٹوکری!

اسی زمانے میں مولانا کو خیال ہوا کہ ڈائمنڈ ہاربر چلا جائے۔ سید محمد عمری، مولانا کے ایک عرب دوست تھے۔ ان کی موٹر، مولانا کی کوٹھی میں کھڑی رہتی تھی۔ موٹر میں پٹرول بھرا گیا اور مولانا کے ساتھ میں، قاضی نور الانام اور ڈپٹی نجم الدّین بیٹھ گئے۔ موٹر چل پڑی۔ ڈائمنڈ ہاربر، کلکتہ سے ۳۵۔۴۰ میل دور ہے۔ موٹر اڑی چلی جارہی تھی کہ دفعتاً رک گئی۔ ڈرائیور نے ہر چند کوشش کی مگر نہ چلنا تھی نہ چلی۔ ہم لوگ، کلکتے سے بہت دور ایک اُجاڑ جگہ میں تھے۔ پندرہ بیس منٹ چل کر ایک ریلوے اسٹیشن پہنچ سکتے تھے۔ جانا پڑا مگر یہ اسٹیشن چھوٹی لائن کا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی لیکن کرتے تو کیا کرتے۔ مجبور تھے۔ مجبوری کے ایسے موقعوں پر مولانا اپنے آپ کو سنبھال کر ایسے بن جاتے تھے، جیسے کوئی پریشانی نہیں اور لطافت و ظرافت کے خزانے کھل جاتے تھے۔

طے یہ پایا تھا کہ ڈائمنڈ ہاربر پر وہی کھائیں گے، جو وہاں ملے گا، مگر ہم اپنی منزل سے دور ایک کوردہ مقام پر تھے اور چھوٹی لائن کے ننھے سے اسٹیشن سے سابقہ تھا۔ یوں تو بھوک نہیں لگتی لیکن معلوم ہو جائے کہ کھانا نہیں مل سکتا تو بھوک ٹوٹ پڑتی ہے۔ ہم سب بھوکے تھے۔ ڈپٹی نجم الدین کی عمر اسی پچاسی سے کیا کم ہوگی۔ سب سے زیادہ بھوک کے شاکی یہی تھے۔ خود مولانا بھی بھوکے تھے، مگر ظاہر کیسے کرتے؟ اسٹیشن پر کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ دور نزدیک کہیں کچھ ملنے کی امید بھی نہ تھی۔ اب ہم کریں تو کیا کریں؟ سخت مایوسی سے دو چار تھے۔ اتنے میں ایک لڑکا نمودار ہوا۔ سر پر ٹوکری تھی۔ ہم سب لپکے۔ صرف مولانا اپنی جگہ کھڑے مسکراتے رہے۔ ٹوکری اُتروائی، تو منہ اور زیادہ لٹک گئے۔ ٹوکری میں کچے امرودوں کے سوا کچھ نہ تھا، مگر ڈپٹی صاحب خوشی سے چیخ اٹھے اور پوری ٹوکری خرید لی۔ عرض کیا گیا، یہ امرود آپ کے کس کام کے؟ دانت کہاں جو کھائیں گے؟ فرمایا ''چبائے بغیر ہی نگلتے چلے جائیں گے!'' مولانا اس نظارے سے لطف اٹھا رہے تھے، مگر بھوکے تو تھے ہی۔ آخر خود بھی امرودوں سے زور آزمائی کرنے لگے۔

بھوک میں امردوں نے کچھ سہارا دیا، مگر ریل آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہم لوگ بڑی کوفت میں تھے۔ گرمی سخت تھی اور سب پسینے سے شرابور۔ مولانا پر پریشانی کا کوئی اثر نہ تھا۔ چہلیں جاری تھیں۔ کبھی قاضی صاحب سے بیت بازی شروع ہو جاتی۔ کبھی کلام مجید کی کسی آیت کی تشریح کرنے لگتے۔

یہ واقعہ ہے کہ مصیبت کے اس دور میں مولانا کی زندہ دلی، ضبط نفس اور وقار دیکھ کر میں حیرت میں پڑ پڑ جاتا تھا۔ سوچتا تھا کہ اس شخص میں کیسی قوت برداشت ہے اور خدا پر کیسا مکمل بھروسہ۔ مصیبت ہی میں آدمی پہچانا جاتا ہے اور مولانا مصیبت میں، کیسی ہی بھیانک، ہمت شکن، ہو، جادۂ صبر و شکر پر استوار رہتے تھے۔

ٹریم گاڑی میں

ابھی اس داستان کا ایک مضحکہ خیز واقعہ باقی ہے۔ اُکتا ڈالنے والے کئی گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ریل آئی اور ہم اس پر سوار کیا، لد گئے۔ چیونٹی کی چال چل کر ریل نے ہمیں کلکتے کے مضافات، خضر پور میں اُتار دیا۔ تلاش پر بھی ٹیکسی نہ ملی۔ اب شام ہو رہی تھی۔ مجبوراً ٹریم گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ مولانا کبھی پہلے ٹریم میں نہیں بیٹھے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ جز بز ہو رہے ہیں۔ بینچ کے بالکل سرے پر اس طرح بیٹھے تھے، گویا جست لگانے کے لیے بالکل تیار

ہیں۔ بیٹھے نہیں، بس یوں سمجھئے کہ بینچ پر ٹکے ہوئے تھے اور گھبرا گھبرا کر ہر طرف دیکھ رہے تھے کہ کوئی دیکھتا تو نہیں، گم صم تھے۔ اتنے میں ایک اسٹینڈ آیا اور ٹریم ٹھہر گئی۔ ایک دو مسافر داخل ہوئے اور ٹریم کو ابھی حرکت نہیں ہوئی تھی کہ ایک نعرہ سنائی دیا ''السلام علیکم مولانا!'' ساتھ ہی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا۔ اب مولانا کی حالت ایسی ہوگئی، جیسے تپ دق کا بیمار آخری درجے میں ہو۔ چہرہ سفید، ہونٹ بھینچے ہوئے۔ آنکھیں نیچی۔ کس قدر تلخ لہجے میں آنے والے کو حکم دیا ''بیٹھ جاؤ میرے بھائی!'' پھر میری طرف خاص نظروں سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ فوراً زور سے گھنٹی بجا کر ٹریم رکوائی اور ہم سب اُتر پڑے۔ مولانا نے زمین پر کھڑے ہو کر اطمینان کی سانس لی اور فرمایا'' سخت کوفت اُٹھانا پڑی ہے۔ ہم ٹیکسی کا انتظار کریں گے!''

فقر سے بے خوفی

مولانا کے ہاتھ میں روپیہ ہوتا تو بے دریغ خرچ کرتے۔ روپیہ جمع کرنا اور پیسہ پیسہ جوڑنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ بخل کیا ہے؟ بُزدلی کا دوسرا نام۔ بہادر آدمی، بخیل نہیں ہوسکتا اور بخیل کا بہادر ہونا ممکن نہیں۔ بخیل پر فقر و فاقہ کا خوف ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔ کتنی ہی دولت سمیٹ لے، غربت کے دھڑکے سے لرزا کرتا ہے۔

مولانا کی پوری زندگی شہادت دے رہی ہے کہ شجاعت و بہادری کا نمونہ تھے، اسی لیے نہایت سیر چشم، فیاض اور فقر و فاقہ سے بالکل بے خوف تھے۔ کیوں نہیں؟ نام لیوا بھی کس کے تھے؟ سیرت طیبہ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر و تنگ دستی سے کبھی خوف نہیں ہو۔ خدا پر توکل ہو، تو خوف کیسا؟ مال و دولت میں سے جو چیز آجاتی، تقسیم کردی جاتی اور فاقہ زدہ عرب میں مشہور ہوگیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے انسان ہیں، جو غربت سے نہیں ڈرتے!

دولت ہو، تو فیاضی آسان ہے، حالانکہ دولت مندوں میں فیاضی کم دیکھی گئی ہے لیکن آدمی فاقوں پر ہو اور دوسروں کی خدمت کرے، تو بے شک یہ ہے حقیقی فیاضی۔

عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی سخاوت ضرب المثل تھی۔ ریگستان میں سفر کر رہے تھے کہ بارش آگئی۔ ایک بدو کے خیمے میں پناہ لی۔ خیمے کی حالت دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ بدو بہت غریب ہے، مگر بدو، بکری ذبح کر لایا اور اس کی بیوی نے بھون بھان کر پیش کردی۔ بارش تین دن رہی اور بدو نہ جانے کیونکر روز بکری لاتا رہا۔ آخر آسمان کھلا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ رخصت ہونے لگے۔

بدو اس وقت موجود نہ تھا۔ شاید چوتھی بکری کی فکر میں کہیں سرگرداں تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اشرفیوں کا ایک توڑا بدو کی بیوی کے ہاتھ میں تھما دیا اور شکریہ ادا کر کے چل پڑے۔ کچھ دیر بعد بدو آیا اور بیوی نے توڑا سامنے رکھ دیا۔ دیکھتے ہی غصے سے بے خود ہو گیا۔ فوراً کہیں سے گھوڑے کا بندوبست کیا اور سرپٹ دوڑا دیا۔ ایک ہاتھ میں نیزہ تھا اور دوسرے میں اشرفیوں کا توڑا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جلد ہی جا لیا اور نیزہ تان کر کہنے لگا اے شخص تو نے ہمیں کیا سمجھا ہے؟ ہم اپنی عزت نہیں بیچتے۔ اپنا توڑا واپس لے، ورنہ کام تمام کر ڈالوں گا!'' ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا'' بھائی، تو مجھے نہیں جانتا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچیرا بھائی۔ عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہوں''! بدو نے نیزہ نیچا کر لیا اور کہنے لگا'' جب آپ ایسے ہیں، تو میری بے عزتی کرنا آپ کے لیے اور بھی ناروا ہے!'' مجبوراً ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اپنا توڑا واپس لینا پڑا!

یہ واقعہ خود ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، جب ان سے پوچھا گیا کہ آ نے خود اپنے آپ سے بھی بڑا کوئی سخی دیکھا ہے؟

ہمارے مولانا کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کتنی عسرت ہو، مہمانوں کی مدارات میں فرق نہ آتا تھا۔ کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ قرض لیتے تھے۔ اپنی قیمتی چیزیں فروخت کر دیتے تھے۔ مگر سائل کو اس کی توقع سے زیادہ ہی دیتے تھے۔

فقر سے یہی بے خوفی اور مال و دولت سے یہی بے پروائی تھی کہ والد، بمبئی میں جو جائداد چھوڑ گئے تھے، مولانا نے اسے حاصل کرنے کی نہ کوشش کی اور نہ اس کے تلف ہو جانے پر کوئی افسوس ہی کیا۔

دورِ تعطل

تنگ دستی کا یہ دور ختم ہونے نہیں پایا تھا کہ ایک اور بھیانک دور شروع ہوا جسے دورِ تعطل کہہ سکتے ہیں۔ فقر و فاقے سے تو مولانا پریشان نہ تھے لیکن اس نئے دور نے بُری طرح متاثر کیا۔

فرقہ پرستی، قومی تحریک کا گلا گھونٹ چکی تھی اور مولانا نے فرض کر لیا تھا کہ اس وقت کوئی قومی تحریک چلائی نہیں جا سکتی۔ میں اس خیال کا مخالف تھا۔ روز بحث ہوتی اور میں کہتا، آپ اُٹھیں تو، میدان میں اُتریں تو فرقہ پرستی اور انگریز کی بازی گری آپ کی خطابت کے سامنے ٹھہر نہ سکے گی مگر مولانا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سید محمود صاحب کلکتہ تشریف لائے۔ میرے ہم خیال نکلے اور کئی روز مولانا سے تبادلہ خیال کرتے رہے لیکن مولانا کو جنبش نہ ہوئی۔

آج بھی میرا وہی خیال ہے۔ مولانا پبلک میں آ جاتے اور ملک کا دورہ کرتے، تو ان کی تقریریں ضرور فرقہ پرستی کا خاتمہ کر ڈالتیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ مولانا بے بس ہو رہے تھے ۔ پیسہ پاس نہ تھا۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا نہیں سکتے تھے۔ مجبوراً سینے پر پتھر رکھے بیٹھے تھے۔ شیر ببر کو بے رحم تقدیر نے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ شکار سامنے ہونے پر بھی بے چارہ آنکھیں بند رکھتا تھا!

اس زمانے میں گھر پر مولانا کی وضع بھی بدل گئی تھی۔ لنگی، کھدر کی قمیص اور پاؤں میں چپل، یہ لباس عریانی میرے علم میں مولانا نے نہ پہلے کبھی اختیار کیا تھا نہ بعد میں گوارا کیا لیکن اب یہی لباس دنیا کا بہترین لباس قرار پا گیا۔ ابوالکلام کی زبان کا جادو جو چاہتا تھا، وہی اچھا بن جاتا تھا:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ان دنوں مولانا ننگے سر رہتے تھے۔ میں بھی ننگے سر رہتا تھا لیکن ان کے پاس جاتا، تو ٹوپی پہن لیتا تھا۔ تعطل اور بیکاری کے دن تو تھے ہی مولانا تھکے ماندے اور کھوئے کھوئے دکھائی دیتے۔ دن میں کئی کئی دفعہ میرے کمرے میں چلے آتے، ایک دن میرے ننگے سر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ''مولوی صاحب، ہماری مشرقی تہذیب برہنہ سر کو پسند نہیں کرتی'' خود ننگے سر تھے۔ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا ''اسی لیے آپ ٹوپی پہنے ہیں!'' ہنس پڑے اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے ''مولوی صاحب، آدمی کو کبھی کبھی لاجواب بھی ہو جانا چاہیے'' عرض کیا ''بے شک مگر ابوالکلام کو نہیں!'' خوب ہنسے اور یہ کہہ کر دوسری گفتگو شروع کر دی ''مولوی صاحب، ابھی تک آپ میں لڑکپن کی شوخیاں مچل رہی ہیں!''

''زندہ در گور'' کا مطلب کون نہیں سمجھتا، مگر ایک عالم، ادیب، مفکر کے زندہ در گور ہو جانے کا مطلب، عام آدمی نہیں سمجھ سکتے۔ عالم، ادیب، مفکر، یہ وہ لوگ ہیں جو ''مان نہ مان میں تیرا مہمان'' زبردستی دنیا کے دماغ میں علم ٹھونسا کرتے ہیں۔ کسی نے نہیں کہا کہ بابا ہمیں علم دو، مگر یہ خدائی فوجدار اپنی بین بھینسوں کے سامنے بھی بجاتے رہتے ہیں۔ انھیں سمجھتا ہی کون ہے؟ مگر یہ ''پاگل'' اس خبط میں مگن رہتے ہیں کہ ہم خود تو اپنے آپ کو اور اپنے مشن کو سمجھتے ہیں اور دنیا کو سمجھا رہے ہیں!

لیکن ایک وقت آتا ہے کہ علم و حکمت کے یہ پیغام بر، زندہ در گور ہو جاتے ہیں اور بخدا ان کی زندگی، مردوں سے بدتر ہو جاتی ہے۔ آرزوئیں کرتے ہیں کہ مر جائیں، مگر موت بھی بھاگتی ہے:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے، پر نہیں آتی!

سارے عالم کا کوئی چوک ہو اور سارا عالم اِس چوک میں جمع ہو پھر پکارنے والا پکارے، کون ہے اس سورج کے نیچے سب سے بڑا بدنصیب؟ تو ہر عالم، ہر ادیب، ہر مفکر چلا اٹھے گا، میں ہوں سب سے بڑا بدنصیب!

یہ حالت اس وقت طاری ہوتی ہے جب عالم، ادیب، مفکر کا ذہن ماؤف، مفلوج، بانجھ ہو جاتا ہے۔ اس حالت کی ایک ہی وجہ نہیں ہوتی، ناکام شادی، ناکام محبت، ماحول کی ناسازگاری، بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ ایسی حالت میں بلاشک وشبہ اس گروہ پر زندہ رہتے ہوئے بھی موت سے بدتر کوئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور علم وفکر اور انسانیت کے یہ علم بردار، قابلِ رحم بن جاتے ہیں، مگر ان بدنصیبوں پر کوئی رحم نہیں کھاتا، کیونکہ ان کی ذہنی گھٹن کا کسی کو شعور نہیں ہو پاتا۔

اس قسم کی ناقابلِ بیان کیفیت شاید دنیا کے سبھی مفکروں کو بھگتنا پڑی ہے اور بھگتنا پڑتی ہے۔ سقراط اور افلاطون سے لے کر ہمارے زمانے تک کا کون فلسفی اس آفت سے بچا ہے؟ خود انبیاء علیہم السلام کی بپتا بھی یہی رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک کوئی پیغمبر اس جانکاہ مصیبت سے نہیں بچا۔ خود ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اس قسم کا دور گزرا ہے۔

انبیاء و مرسلین، فلاسفہ و مفکرین پر جب یہ دور آتا ہے تو تجدید ذہن اور جمع قویٰ کے لیے مکمل تنہائی اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی سنسان جنگل میں چلے گئے کسی پہاڑ پر جا بیٹھے، کسی غار میں روپوش ہو گئے۔ انجیل بتاتی ہے کہ حضرت مسیح پہاڑوں پر اکیلے چلے گئے تھے اور ہماری احادیث کہتی ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نزولِ وحی سے پہلے غارِ حرا میں کئی کئی دن معتکف رہتے تھے۔ اور ایک دفعہ تو خود مدینہ میں اسی قسم کی کوئی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مہینہ تنہائی میں گزارا تھا۔

مولانا آزاد پر بھی اس زمانے میں ایسا ہی دور گزرا۔ کوئی کام کرنے کو نہیں۔ کوئی پروگرام سامنے نہیں۔ کوئی بات سننے والا نہیں اور ہاتھ میں پیسہ بھی نہیں۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ٹہلنا شروع کر دیا، تو ٹہل ہی رہے ہیں، حالانکہ ٹہلنے کی عادت نہ تھی۔ میں اپنے کمرے سے نگرانی کرتا۔ آخر ترس آجاتا۔ پاس پہنچتا اور عرض کرتا، بس کیجئے۔ آیئے ذرا بیٹھ کر آرام کر لیں۔ خفیف سی

جھنجھلاہٹ سے فرماتے ''مولوی صاحب، آخر میں کروں تو کیا کروں''؟ کیا جواب دیتا۔ بازو تھام لیتا۔ چائے آجاتی اور ذرا دیر کے لیے بہل جاتے۔

ایک دن فرمایا ''غالب نے اپنے بارے میں کہا تھا:

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

لیکن میرا معاملہ اور بھی مشکل ہے۔ کن مشکلوں سے رات کٹتی ہے۔ صبح چار بجے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں پھر میں ہوں اور یہ پہاڑ سا دن:

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟

ان دنوں مولانا کسی سنجیدہ، ٹھوس کتاب کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں ناول اور افسانے مہیا کرتا، مگر ان میں بھی دل نہ لگتا۔ مہینوں یہی کیفیت رہی پھر دفعتاً مولانا بالکل روپوش ہو گئے۔ جب جب ملنے کی درخواست کی یہی جواب ملا، طبیعت ناساز ہے۔ پندرہ بیس دن بعد ''اعتکاف'' سے نکلے تو پھر وہی ابوالکلام تھے بلکہ پہلے سے زیادہ ذہن چٹن اور طبیعت بشاش!

قومی فنڈ

خلافت تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے غریب مسلمانوں نے قابلِ فخر جذبہ ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بے شمار روپیہ خلافت فنڈ میں دیا۔ پردہ نشین خواتین نے زیور تک اُتار کے دے دیے۔ خود لیڈروں کا اعتراف تھا کہ چھپن لاکھ جمع ہوا ہے۔

لیکن اس مالا مال فنڈ کا حشر کیا ہوا؟ ایک قلیل رقم تو ترکوں کو پہنچی۔ باقی روپیہ کو مردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اس زمانے میں خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بے دردی سے قومی روپیہ اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں۔

لیکن میری انہی آنکھوں نے ایک اور نظارہ بھی دیکھا۔ خلافت فنڈ جمع کرنے کے لیے ایک دفعہ کئی لاکھ رسیدیں چھاپی گئی تھیں۔ رسیدیں بینک نوٹوں کی شکل کی تھیں اور پبلک میں بہت مقبول ہوئی تھیں۔ حالت یہ تھی کہ کلکتہ میں آپ خلافت رسید دے کر سودا لے سکتے تھے۔ دکاندار خوشی خوشی رسیدیں لے لیتے تھے۔ گویا سرکاری نوٹ ہیں۔

رسید تھی، مولانا ہی کے پریس میں چھپی تھیں اور میں کیا بتاؤں، مولانا کو کس قدر فکر و اہتمام تھا کہ کوئی ایک رسید بھی ادھر سے اُدھر نہ ہونے پائے۔ رسیدوں پر سلسلے وار نمبر پڑے تھے۔ خود مولانا بڑی مستعدی سے نگرانی کرتے تھے اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ ایک بھی خلافت رسید، مولانا کے یہاں ناجائز طور پر استعمال نہیں ہوئی حالانکہ مولانا کو روپیہ کی اشد شدید ضرورت رہتی تھی۔ تحریک کے سلسلے میں دورہ جاری تھا۔ سفر کا خرچ کبھی قومی فنڈ سے نہیں لیتے تھے۔ قرض ادھار سے اپنے مصارف چلاتے تھے۔

خودداری

مولانا کی خودداری، ضرب المثل رہی ہے۔ نہ کبھی کوئی ایسی بات کی، جس میں ہیٹی ہو، نہ کسی کے سامنے جھکے، نہ امیروں کے، نہ لیڈروں کے، نہ پبلک کے نہ گورنمنٹ کے۔

لکھنؤ میں ایک پرائیویٹ کانفرنس ہو رہی تھی۔ مرحوم محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، خود مولانا اور دوسرے بہت سے لیڈر جمع تھے۔ اتنے میں مرحوم راجہ محمود آباد آ گئے اور سب لیڈر بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ صرف اکیلے مولانا اپنی جگہ بیٹھے رہے، راجہ صاحب لپک کر مولانا ہی کے پاس پہنچے۔ مصافحہ کیا۔ پہلو میں بیٹھ گئے، چناں چنیں کرنے لگے۔

سبھاش چندر بوس (نیتا جی) تو خیر، لڑکے تھے۔ مولانا کے دربار میں خود دیش بندھو سی۔ آر۔ داس حاضری دیتے اور کبھی کبھی ایک ایک گھنٹہ ملاقات کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے کئی دفعہ کلکتہ میں مولانا کے ساتھ دوپہر کو دعوت کھائی۔ پنڈت جی خود بھی مشرقی ذوق و تہذیب کا نمونہ تھے اور مولانا کے ساتھ ان کی احترام آمیز بے تکلفی تھی۔ مولانا کچھ اس وضع کے آدمی تھے کہ ہر ملاقاتی سے برتاؤ کی حدیں مقرر رہتی تھیں اور کیا مجال کوئی ان حدوں سے باہر نکل جائے۔

خود گاندھی جی سے مولانا کا وہ برتاؤ نہ تھا، جو مرحوم علی بھائیوں کا تھا کہ جھکے اور بچھے چلے جا رہے ہیں۔ گاندھی جی، مولانا کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ پچھلے صفحوں میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ گاندھی جی ایک شام ملنے آئے تھے اور مولانا نے یہ کہہ کر لوٹا دیا تھا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی۔

قومی تحریک کے سلسلے میں مولانا کو ملک کے لمبے دورے کرنا پڑے، بے شمار کانفرنسوں میں شریک ہوئے، مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کسی قومی ادارے سے یا کسی شخص سے ایک پیسہ بھی

لیا ہو۔ جیب خالی ہوتی، تو گھر بیٹھے رہتے یا پھر خاص احباب سے قرض لے کر سفر کرتے۔ سفر بھی فرسٹ کلاس میں ہوتا، یا سیکنڈ میں۔ کلکتہ میں کہیں جاتے، تو ٹیکسی میں، کسی اور سواری میں نہیں۔

لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم محمد اجمل خاں صاحب، مولانا کو مالی امداد دیتے تھے۔ میں اسے سچ نہیں سمجھتا۔ یہ حضرات مدد کرتے ہوتے تو مولانا پر کئی کئی سال عسرت و تنگ دستی کے کیوں گزرتے؟ پنڈت جی سے تو کبھی اس بارے میں بات چیت نہیں ہوئی لیکن حکیم صاحب مرحوم نے خود مجھ سے حیرت کے ساتھ سوال کیا تھا کہ مولانا کا خرچ کیسے چلتا ہے؟ حکیم صاحب مدد دیتے ہوتے، تو یہ سوال کیوں کرتے؟

اور سنیے پہلی جنگ عظیم میں بڑے بڑے لیڈروں کو حکومت نے نظر بند کر دیا تھا اور ان کی گزر بسر کے لیے کچھ رقمیں مقرر کر دی تھیں، لیڈروں کے خیال میں رقمیں کم تھیں اور وہ گزارہ بڑھانے کے لیے حکومت سے جھگڑتے تھے، مگر مولانا نے یہ بکی گوارا نہ کی اور حکومت سے بے نیاز رہے۔ پھر ایسا ہوا کہ پبلک نے اپنے لیڈروں کے لیے فنڈ کھولا لیکن مولانا نے اس فنڈ سے بھی کوئی پیسہ لینا منظور نہیں کیا حالانکہ مولانا کا اخبار بھی بند کر دیا گیا تھا۔ پریس بھی بند تھا اور آمدنی کا کوئی دروازہ کھلا نہ تھا۔

اور انگریزی حکومت؟ تو مولانا نے اس ظالم حکومت کے سامنے کبھی سَر نہیں جھکایا۔ الہلال پڑھیے۔ البلاغ پڑھیے۔ پیغام پڑھیے۔ قول فیصل پڑھیے۔ آپ کو خودداری کی حیرت انگیز دنیا نظر آئے گی۔

پرانے کاغذوں میں مولانا کے نام ڈپٹی کمشنر کلکتہ کا ایک خط ملا ہے۔ تاریخ یکم جولائی ۱۹۲۱ء ہے اور ترجمہ ذیل ہے:

''ڈیئر سر! شکر گزار ہوں گا، اگر آپ آج ۴ بجے شام کو ''لال بازار'' میں آکر کمشنر پولیس سے مل لیں۔ براہ عنایت معاملے کو ازحد ضروری خیال کریں''

مولانا نے اردو میں جواب لکھ کر، یاد نہیں کسے دیا اور اس نے انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ مولانا کا مسودہ اور اس کا یہ ترجمہ، دونوں میرے پاس محفوظ ہیں۔ مسودہ نیچے نقل کرتا ہوں:

''مولانا کو آپ کی چٹھی ابھی ۴ بجے ملی۔ وہ دو ہفتوں سے بیمار ہیں اور دونوں پاؤں میں زخم ہو جانے کی وجہ سے نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔ آج ۴ بجے مرزاپور پارک میں ایک جلسے کا اعلان اس امید سے کیا گیا تھا کہ اس وقت تک صحت یاب ہو جائیں گے۔ اعلان کی ذمہ داری محسوس کر کے

کسی نہ کسی طرح اس میں شریک ہونا پڑے گا لیکن وہ ملاقات کے لیے آنے کے قابل نہیں ہیں یا تو آپ ان کی صحت کا انتظار کیجئے یا پھر بذریعہ خط مقصد ملاقات سے مطلع کر دیجئے۔"

دیکھا آپ نے کلکتے کا کمشنر، جو گویا شہر کا مطلق العنان بادشاہ ہوتا تھا، ملاقات کے لیے طلب کرتا ہے اور مولانا جانے سے انکار کر دیتے ہیں مگر یہ بھی صاف صاف کہہ دیتے کہ پبلک جلسے میں ضرور جائیں گے! بڑے جگرے کے آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مولانا کے دوست

مولانا کم آمیز تھے، از حد حساس اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ اِس مزاج کے لوگ مشکل سے دوست پیدا کر سکتے ہیں پھر دنیا کے تجربے سامنے تھے اور مولانا جانتے تھے کہ سچی دوستی عنقا ہے، اسی لیے بہت محتاط ہو گئے تھے مگر احتیاط پر بھی، مجھے معلوم ہے، دوستی کے کئی دعوے داروں کے ہاتھوں بڑے بڑے نقصان اُٹھانا پڑے۔

مولانا کی ابتدائی زندگی میری آنکھوں کے سامنے نہیں گزری لیکن جن قدیم دوستوں یا ساتھیوں کا تذکرہ کرتے انہیں سُنا، ان میں سے چند نام مجھے یاد ہیں:

۱۔ شفاء الملک حکیم سید محمد صادق صاحب لکھنوی۔

۲۔ خان بہادر رضا علی صاحب وحشت۔

۳۔ آغا حشرِ کاشمیری

۴۔ مویدزادہ آغا جلال الدین۔

شفاء الملک صاحب مرحوم

مٹیا برج کے شاہی خاندان کے مشہور معالج، حکیم سید محمد قاسم علی صاحب لکھنوی کے صاحب زادے، علامہ نواب حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی کے داماد اور خود کلکتہ کے نامور طبیب تھے۔ نہایت خلیق، بردبار، متواضع، خوددار، وضع دار، خوش مزاج، روشن خیال بزرگ تھے۔ شرافت و نجابت چہرے سے عیاں، شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق، شاعری کے ہو رہتے تو چوٹی کے شاعر مانے جاتے۔ شہر کے خوش ذوق لوگ گھیرے رہتے۔ سنا ہے خود مولانا کی بھی آمد و رفت تھی۔ میں بھی حاضری دیا کرتا تھا۔

حضرت وحشت

اس قدر مشہور ہیں کہ تعارف کرانا غیر ضروری ہے نیکی و شرافت کی زندہ تصویر تھے۔ موصوف سے میری بھی علیک سلیک تھی۔

آغا حشر مرحوم

آغا حشر مرحوم کا ڈنکا تھیٹر کی دنیا میں بجا ہوا تھا اور میں اس دنیا سے اجنبی نہ تھا۔ مدتوں بعد ''ہند'' کے دفتر میں ایک صاحب ''نازل'' ہوئے مگر اس شان سے کہ ایک ہلکا سا طوفان بھی ساتھ لیے ہوئے۔ بلند و بالا قد، سرخ و سفید چہرہ، عمر کوئی ۵۵ سال، ننگے سر ململ کا کرتہ پہنے، ریشمی تہہ بند باندھے...... آتے ہی ٹوٹ پڑے۔ صرف مصافحہ نہیں معانقہ بھی...... میں ہوں آغا حشر کاشمیری!

''ارے! بائیں! آپ ہی ہیں آغا صاحب؟'' میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ زور سے ہاتھ دبایا۔ مجھے بٹھادیا۔ خود بھی بیٹھ گئے۔ کہنے لگے اب آپ سے کیا کہوں؟ تھیٹر نے مجھے مار ڈالا ہے!

عرض کیا تھیٹر کی دنیا تو مجھے آپ کا قائل کر چکی تھی پھر مولانا آزاد سے آپ کے محاسن سن کر زیارت کا مشتاق تھا۔ بڑا اکرم ہے کہ خود مشرف فرمادیا!

کہنے لگے آپ ملیح آبادی ہیں۔ لکھنوی تکلفات ختم۔ میں آپ سے مولانا آزاد کے رشتے سے نہیں ملا ہوں۔ آپ کے ''ہند'' کے رشتے سے ملا ہوں اور میں آپ کے ساتھ مولانا آزاد نہیں بن سکوں گا۔ آغا حشر ہی رہوں گا۔ پہلے سے کہہ دوں، گالیوں کا شہنشاہ بھی ہوں اور موجد و مخترع بھی لیکن آپ کے سامنے یہ توپ خانہ خاموش رہے گا۔ مولانا آزاد بڑے آدمی ہو گئے ہیں اور وہ بڑے آدمی کب نہیں تھے؟ ہماری لڑکپن کی دوستی ہے۔ لاہور، امرتسر، بمبئی میں ساتھ رہا ہے۔ عیسائی پادریوں سے خوب خوب مباحثے ہوتے تھے۔ ملیح آبادی صاحب، مجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی کہ میں حسن پرست تھا۔ آج بھی حسن پرست ہوں۔ اسی حسن پرستی نے مجھے برباد کر ڈالا مگر ابوالکلام لڑکپن میں بھی ابوالکلام تھا۔ ہماری خوب چھنتی تھی۔ میں نے ابوالکلام سے بڑھ کر ذہین آدمی دیکھا نہیں!

عرض کیا، مولانا بھی آپ کی ذہانت کے معترف ہیں۔ ہنسے اور کہنے لگے۔ ''پرانا یار ہے لیکن میں اس سے اب ملتا نہیں۔ لیڈر ہو گیا ہے اور میں کیا ہوں؟...... محض ڈراما نویس۔ بھائی، مولانا کو اس بچھڑے ہوئے بھائی کا سلام ضرور پہنچا دینا!''

بعد میں آغا صاحب سے رسم بڑھ گئی، ان کے گھر بھی جانے لگا۔ بڑے وسیع المطالعہ تھے۔ ایک دن بُدھ مت پر گفتگو چھڑ گئی۔ اس وقت اس بارے میں میرا مطالعہ سرسری تھا۔ آغا صاحب نے برجستہ ایسی تقریر کی کہ میں حیران رہ گیا۔

آغا جلال الدین

ایرانی تھے اور سید جمال الدین افغانی کے ایک رفیق۔ کلکتہ سے فارسی اخبار "حبل المتین" نکالتے تھے۔ ایران کے انقلاب میں اس اخبار کا بڑا ہاتھ تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ فارسی اور عربی میں ایسے لسان تھے کہ تعجب ہوتا تھا۔ ذہانت واحساس کا یہ حال تھا کہ روپیہ ہاتھ میں آتے ہی بتا دیتے تھے کہ کھرا ہے یا کھوٹا۔

یہ حضرات، مولانا کے قدیم احباب تھے۔ میرے زمانہ رفاقت میں کلکتہ کے جن لوگوں سے مولانا مانوس تھے، ان میں سے ہر ایک دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ مختصر حالات سنیے اور دیکھئے، مولانا کیسے کیسے لوگوں سے دلچسپی لیتے تھے!

ڈپٹی نجم الدین مرحوم

معمر بزرگ تھے۔ اسی بیاسی سے کم عمر نہ ہوگی۔ بڑے زندہ دل، بڑے غصہ ور، بڑے جوشیلے، بڑے "کفایت شعار" تھے۔ مولانا ان سے لطیف مذاق کیا کرتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں چائے اور کھانے پر مدعو رہتے تھے، مگر خود کسی کی دعوت نہیں کرتے تھے لیکن مجھے ایک دفعہ مدعو کر لیا۔ صرف دو لڑکیاں تھیں اور ایک بھتیجا، قطب الدین احمد۔ یہ صاحب خود بھی پکی عمر کے تھے۔

ڈپٹی صاحب نے میرے پہنچتے ہی اپنے بھتیجے کی طرف اشارہ کیا اور جوش وخروش سے کہنے لگے "یہ حضرت میری جان کے پیچھے پڑے ہیں۔ مجھے مار کے میری دولت پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ مگر میں مرنے والا نہیں ہوں۔ اسی نکھٹو کو مار کے مروں گا!"

ڈپٹی صاحب، بنگالی مسلمان تھے مگر اردو خوب بولتے تھے۔ چالیس برس سے پنشن لے رہے تھے۔ لڑاکا آدمی تھے۔ زمانہ ملازمت میں انگریز افسروں سے کشتم کشتا رہتی تھی، اسی لیے قبل از وقت پنشن دے دی گئی تھی۔ خلافت کمیٹی کے صدر تھے اور ایسے نڈر کہ میں نے ایسے آدمی کم ہی دیکھے ہیں۔

مولانا اِن دنوں رپن لین میں رہتے تھے۔ سامنے کے مکان میں انگلو انڈین آباد تھے۔ ان کی عورتیں نظر آتیں تو ڈپٹی صاحب بے اختیار چلا اٹھتے "لک ہیر" اور پھر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اور مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے ہاتھوں کو اس طرح جنبش دیتے، گویا سل پیس رہے ہیں پھر اردو میں کہتے "ٹھہر جاؤ۔ آزادی آرہی ہے۔ اسی طرح مسالا پیسنا پڑے گا!" عورتیں مسکراتیں اور ہنس کر بھاگ جاتیں۔

مولانا مسکرا مسکرا کے لطف اٹھاتے، بلکہ ڈپٹی صاحب کو اکساتے اور ان کا جوش وغصہ بڑھتا چلا جاتا۔ خلافت تحریک شباب پر تھی اور ڈپٹی صاحب کا جوش وخروش بھی عروج پر۔ ایک دن کمشنر پولیس نے طلب کر لیا اور دھمکی دی کہ پنشن بند کر دی جائے گی۔ ڈپٹی صاحب، خدا مغفرت کرے، خرچ کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ دھمکی سے ڈر جانا چاہیے تھا مگر ذرا نہ ڈرے اور صاف کہہ دیا، چالیس برس، پنشن کے نام سے گورنمنٹ کا دیوالہ نکالا ہے۔ اب بند کر لو گے، تو غم نہ ہوگا۔ ایک آنے کے کباب اور دو خمیری روٹیاں میرے لیے کافی ہیں۔ اور یہ غذا مجھے ملتی ہی رہے گی!

دراصل ڈپٹی صاحب اپنی جوانی میں سید جمال الدین افغانی کی چند صحبتوں میں بیٹھ چکے تھے۔ مرحوم نے وہ مکان بھی مجھے دکھایا، جہاں سید صاحب ٹھہرے تھے۔ سید جمال الدین، پارس تھے، جو لوہا بھی مس کرتا کندن بن جاتا۔ یہ سید ہی کا فیض تھا کہ ڈپٹی صاحب جیسا ممسک آدمی بھی قوم و وطن کی راہ میں اپنی گراں قدر پنشن ٹھکرا دینے پر آمادہ تھا۔ ڈپٹی صاحب کی یہی وہ ادا تھی، جس نے مولانا سے انہیں قریب کر دیا تھا۔

لیکن میں ڈپٹی صاحب کی دعوت کا ذکر کر رہا تھا۔ اپنے بھتیجے پر برستے برستے ڈپٹی صاحب بغیر کسی تمہید کے دفعتاً اتنے زور سے چیخے کہ میں اُچھل پڑا...... "دھڑ پکیا!"...... کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے؟ میں ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایک پیر فرتوت بڑھیا چڑیل سامنے کھڑی تھی! بے اختیار میری بھی چیخ بلند ہوگئی "ارے!"...... ڈپٹی صاحب نے بدستور برہمی کے ساتھ کئی عدد گالیاں دیتے ہوئے فرمایا "نہ جانے کب سے پل رہی ہے مگر نہ تمیز آئی نہ اردو ہی سمجھتی ہے!" پھر کھڑے ہوگئے۔ گھونسا تن گیا مگر بڑھیا بڑی پھرتیلی نکلی فوراً غائب اور ڈپٹی صاحب کی آواز بنگلہ زبان میں بلند ہوئی کہ کھانا حاضر کیا جائے۔

کھانا آیا۔ اب ڈپٹی صاحب کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ عرض کیا، ڈپٹی صاحب، یہ دھڑ پکیا کیا؟ ہنسے فرمایا، اس "لڑکی" کا نام ہے۔ پرلیا کی بنگالن ہے۔ میں وہاں افسر تھا۔ کال پڑا اور میں نے

اسے مول لے کر پال لیا۔ پرلیا میں ایسے نام شگون کے طور پر رکھے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کے بچے نہیں جیتے، وہ اپنی لڑکیوں کے نام اسی قسم کے رکھتے ہیں اور لڑکوں کے نام تو سن کر آپ تعجب میں پڑ جائیں گے، جیسے ''ککرمتامیاں'' یا ''سور چتامیاں!''

صبح میں نے مولانا کو یہ داستان سنائی، تو دل کھول کر ہنسے۔ فرمایا یہ ڈپٹی اس عمر میں بھی دلچسپ ہے۔

ڈپٹی صاحب کا ایک اور واقعہ میں بھول نہیں سکتا۔ الہلال کے منیجر، فضل الدین احمد نے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ صبح تڑکے ہم لوگ سو رہے تھے کہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ڈپٹی صاحب موجود۔ خیال ہوا کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے مگر موصوف نے بڑی ڈھٹائی سے فرمایا۔ ''میری آمد پر تعجب نہ کیجیے۔ میں ایک وقت کی دعوت کا قائل نہیں ہوں۔ دعوت کے معنیٰ ہیں، ناشتے سے لے کر رات تک کا کھانا!'' ڈپٹی صاحب بیٹھ گئے اور دس بجے رات ہی کو اٹھے۔ بیڑی پیا کرتے تھے، مگر فضل الدین سگار کے عادی تھے۔ ڈپٹی صاحب بھی سگاروں پر پل پڑے۔ ایک سگار ختم کرتے، تو دو اٹھاتے۔ ایک سلگاتے، دوسرا جیب میں پہنچا دیتے۔ فضل الدین سے کہنے لگے ''دعوت میں سگریٹ، سگار پینے کا نیچرل طریقہ یہی ہے!''

قطب الدین احمد

ڈپٹی صاحب کے بھتیجے تھے۔ گریجویٹ تھے۔ ٹیپو سلطان شہید کے خاندان میں شادی ہوئی تھی اور مدت تک الہلال کے منیجر رہے تھے۔ عجیب وغریب خصوصیتیں رکھتے تھے۔ یہاں صرف ان کے کھانے کا تذکرہ کروں گا۔

قطب الدین صاحب نے رات کے کھانے پر مجھے اور کمیونسٹ دوستوں کو مدعو کیا، مگر سہ پہر کو بھوک لگی۔ بیگم سے ناشتہ طلب کیا، کئی سیر کباب دعوت کے لیے تیار رکھے تھے۔ بیگم نے کہا، باورچی خانے میں جا کر کچھ کھالو۔ حضرت نے سب کباب صاف کر دئے اور کچھ بتایا بھی نہیں۔ رات کو مہمان پہنچے، تو بیگم نے کباب غائب دیکھ کر سر پیٹ لیا اور ہم لوگوں کی تواضع، بازار کے کبابیوں سے کی گئی!

اپنے بڑھاپے میں قطب الدین صاحب میرے اخبار ''ہند'' کے منیجر ہوئے۔ اخبار کا کاروبار کمپنی کی شکل میں کر دیا گیا تھا۔ طے پایا کہ کمپنی کے حصے کل بیچنے نکلیں گے۔ بڑی تاکید سے کہہ گئے

کہ چونا گلی کی پوریاں اور جلیبیاں منگا رکھیے گا مگر خیال رہے، میرا ناشتہ بقدر بادام نہیں ہوتا۔ خیر میں نے ڈیڑھ روپیہ کی پوریاں جلیبیاں منگا لیں۔ سستے دن تھے۔ ناشتہ کئی پیٹوؤں کو بھی کافی تھا۔

قطب الدین، پوریوں جلیبیوں کا ڈھیر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں تو ٹونگتا ہی رہا۔ حضرت سب کچھ اُڑا گئے۔ اب ہم چل پڑے۔ صبح کا وقت تھا۔ جہاں پہنچتے، ناشتے کے لیے اصرار ہوتا۔ میں انکار کرتا مگر موصوف ہنس ہنس کر فرماتے ''لکھنوی تکلف ہے!'' ناشتہ آ جاتا۔ چائے، انڈے، ٹوسٹ بسکٹ، پراٹھے، مٹھائی۔ آٹھ دس جگہ یہی صورت پیش آئی اور حضرت ڈکار لیے بغیر کھاتے گئے۔ بارہ بجے واپسی ہوئی۔ راستے میں خود ان کا گھر پڑتا تھا۔ کہنے لگے، گاڑی ذرا روک لی جائے۔ میرا ناشتہ پڑا برباد ہو رہا ہوگا۔ میں حیرت زدہ کہ الٰہی یہ پیٹ ہے یا دوزخ۔ موصوف اُتر پڑے اور نیچے ہی سے چلائے ''اماما! فوراً ناشتہ بھیجو!'' میں نے تعجب سے پوچھا، والدہ زندہ ہیں؟ کہنے لگے، کلکتے میں باپ، بیٹی کو اما کہہ کر پکارتا ہے اور نانا، نواسی سے ایسا فحش مذاق کرتا ہے، جس کا اور کہیں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا!

ناشتہ آ گیا۔ دو انڈے، چار ٹوسٹ اور چائے۔ یہ بھی صاف۔ اب ہم دفتر پہنچے۔ قطب الدین بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ کھانا آ گیا۔ غصہ اور تھکان سے میں نے چھوا تک نہیں۔ سب کھانا انہی کے پیٹ میں پہنچ گیا!

سہ پہر کو ہم پھر نکلے۔ یہ وقت بھی چائے اور ناشتہ کا تھا اور قطب الدین کے لیے عید! کئی جگہ ناشتہ ہوا مگر انہی کا۔ اب ہم نیو مارکیٹ کے پاس ایک حاجی صاحب کی دکان پر پہنچے۔ یہاں شربت، فرنی وغیرہ بکتی تھی اور سامنے ہی کھیری کبابوں اور پراٹھوں کی مشہور دکان تھی۔ حاجی صاحب نے اپنی دکان کی چیزوں سے خاطر کرنا چاہی مگر قطب الدین صاحب پھٹ سے بول اٹھے ''ہمارے مولانا تو کھیری کے کبابوں اور پراٹھوں کے عاشق ہیں!''

صبح سے ندیدہ پن جھیلتا چلا آ رہا تھا۔ اب ضبط نہ ہو سکا اور برس پڑا مگر چکنے گھڑے پر اثر کہاں؟ ہنسے اور حاجی صاحب سے فرمایا ''یہ ہے لکھنوی تکلف! منگایئے بھی کباب پراٹھے!'' میں جھنجھلا کر رہ گیا اور ایک ایک پلیٹ کبابوں کی اور دو دو پراٹھے سامنے آ گئے۔ مارے غصے کے میں چکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا! قطب الدین صاحب ہی سب چٹ کر گئے مگر نیت نہ بھری۔ ہنستے ہوئے حاجی صاحب سے کہنے لگے ''دیکھ لی آپ نے لکھنؤ کی آن! اور منگایئے گا تو

مولانا ضرور تناول فرمالیں گے! میں آپے سے باہر ہوگیا، مگر حاجی صاحب نے شرماشرمی پھر بھی کباب پراٹھے منگائے اوراسی دوزخ میں سماگئے!

سات بجے شام کو واپسی ہوئی۔ قطب الدین صاحب بھوک سے بے تاب تھے۔ باورچی کو دیکھتے ہی چیخ اٹھے "کھانا لاؤ!" یہ باورچی بھی عجائبات روزگار میں سے تھا۔ دوپہر کا اندھیر دیکھ چکا تھا۔ جل کر کہنے لگا "تمہارے لیے کھانا نہیں ہے!" قطب الدین صاحب ذرا کھسیانے نہ ہوئے، ہنس کر مجھ سے کہنے لگے "ہمارا ان کا مذاق ہوتا ہے!" میں نے باورچی کو ڈانٹا تو جھلا کر سب کھانا نکال لایا، میں خود بھی جلا بھنا تھا۔ بھوک غائب تھی۔ قطب الدین نے یہ سب کھانا بھی ٹھکانے لگادیا اور ڈکار لئے بغیر کمیونزم پر گہرافشانی شروع کردی!

قاضی نورالانام

معلوم ہے کہ مولانا کو بے شمار اشعار یاد تھے اور اشعار کے برمحل استعمال میں یدطولیٰ رکھتے تھے مگر یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس بارے میں قاضی نورالانام، مولانا سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ مولانا کے ذہن میں کسی شعر کا مضمون جاگا، مگر خود شعر یاد نہیں آتا، تو قاضی صاحب بلائے جاتے تھے اور مضمون سنتے ہی شعر پڑھ دیتے تھے، یا تحریر میں کوئی ایسا موقع آیا کہ مولانا مناسب حال شعر لکھنا چاہتے ہیں لیکن شعر نہیں سوجھتا، تو قاضی صاحب سے کہا جاتا تھا اور وہ برمحل شعر سنادیتے تھے۔ اسی قدر نہیں، قاضی صاحب جب تک چاہتے تھے، صرف شعر میں گفتگو جاری رکھتے تھے حالانکہ کلکتیا تھے اور شعروادب کے مرکزوں سے ہمیشہ دور رہے تھے۔

قاضی ب، مولانا کے بچپن کے ساتھی اور اپنی وضع کے انوکھے۔ رانچی میں قضاۃ کا منصب ملا تھا مگر سولہ روپیہ میں بیچ کر لوٹ آئے۔ بڑے کالے۔ بہت دبلے تھے۔ بڑھاپے میں شادی سے شوق فرمایا۔ شادی سے پہلے نہ کہیں گھر تھا، نہ کسی قسم کا سامان و اسباب، چار جوڑے کپڑے ہیں اور چار ہی شیروانیاں بھی، تو یہ سب لباس، صندوق کے بجائے جسم پر رہتا تھا اور جہاں کہیں احساس ہوتا کہ کپڑے میلے ہوگئے ہیں، وہیں اوپر کا جوڑا اتار کر چھوڑ دیتے۔ اب تین جوڑے ڈانٹے پھر رہے ہیں۔ گویا سانپ تھے۔ کینچلی اتارا کرتے تھے!

پان اور چائے کے رسیا تھے۔ اوڑیا پان کھاتے تھے یعنی گلوری تو چھوٹی سی ہوتی تھی مگر مسالا مُٹھی بھر۔ مسالے میں بے میل تمباکو، زیرہ، سونف، دھنیا اور نہ جانے اور کیا کیا الّم غلّم۔ چائے کا یہ حال تھا کہ ہر پیالی میں آدھی پیالی سے زیادہ شکر ضروری ہوتی تھی!

ایک دفعہ مرحوم شوکت علی، مولانا کے مہمان تھے۔ ڈھائی سیر رس گلے منگائے گئے۔ مولانا شوکت علی، مٹھاس کے دلدادہ تھے۔ رس گلوں کا نام سنتے ہی فرمایا، کارِ خیر میں تاخیر حرام ہے! فوراً دسترخوان بچھ گیا۔ مولانا آزاد کو مٹھاس سے رغبت نہ تھی۔ وہ تو الگ بیٹھ گئے۔ اب میں، شوکت صاحب اور قاضی صاحب رس گلوں کی ہنڈیا کو گِدھوں کی طرح گھیر کر بیٹھ گئے۔

میں تو شوکت صاحب کے مزاج سے واقف تھا۔ قاضی صاحب انجان تھے مگر مٹھاس کے کیڑے، میں نے ڈرتے ڈرتے ایک ہی دو، رس گلے نگلے، مگر قاضی صاحب کا ہاتھ اس طرح چل رہا تھا جیسے بجلی سے لگا ہوا ہتھا بڑی تیزی سے حرکت میں ہو۔ شوکت صاحب نے انتہائی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر اپنا بایاں چنگل بڑھایا اور قاضی صاحب کا کھانے والا ہاتھ گرفت میں لاکر غرّائے ''ابے کالے چیونٹے، سب تو ہی اُڑا جائے گا!'' قاضی صاحب بے بس تھے اور مولانا ہنس رہے تھے۔ ہانڈی صاف ہی کر کے شوکت صاحب نے قاضی کا ہاتھ چھوڑا۔ بے چارے قاضی کی مایوسی قابلِ دید تھی۔

قاضی صاحب، روزے، نماز سے بے زار ہی رہے۔ ایک دفعہ مسجد ناخدا (کلکتہ) میں مولانا کی تقریر تھی۔ واپسی پر جب مولانا ٹیکسی میں بیٹھے، تو فٹ پاتھ پر سے قاضی صاحب لپکے اور کوئی بات کہی۔ بات ضروری تھی مگر میں بھول گیا ہوں۔ مولانا نے خلافِ عادت بگڑ کر فرمایا ''اتنی دیر میں کیوں خبر دی؟'' قاضی نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا ''اس لیے کہ آپ مسجد میں تھے'' مولانا نے اور زیادہ جھنجلا کر کہا ''تم مسجد میں چلے آتے'' قاضی صاحب ہنس کر کہنے لگے ''آپ بھی غضب کرتے ہیں، میں اور مسجد!'' پھر ایک فارسی شعر پڑھا۔ ''مولانا نے فرمایا ''تم بھی عجیب آدمی ہو!'' قاضی صاحب نے ٹیکسی میں گھستے ہوئے کہا ''آپ ہی کی صحبت کا اثر ہے، ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے!'' اب ٹیکسی، ظرافت کا متحرک مسکن بن گئی اور دونوں صاحب بیت بازی میں مصروف ہو گئے۔

نماز کے سلسلے میں قاضی صاحب کا کفر میرے والد مرحوم نے توڑا۔ زبردستی نماز پڑھوائی اور مدت بعد ایک مجلس میں، جہاں علی بھائی وغیرہ لیڈر جمع تھے اور قاضی صاحب بھی موجود تھے، والد

نے نمایاں فخر سے کہا ''اس شخص کو میں ہی نماز پڑھوا سکا ہوں'' اس پر قاضی قہقہہ مار کے ہنسا اور زور سے چلا کر کہنے لگا ''بے شک مگر خدا کی قسم بے وضو پڑھی تھی!''...... اب مجلس کی عجیب [illegible] حالت ہوگئی لاحول کی صدائیں بلند تھیں۔ قاضی صاحب کی زبان چھپتے ہوئے شعر اُگل رہی تھی اور دو چار اصحاب دم بخود بیٹھے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے!

امام مسجد

مولانا کے ایک اور ملنے والے تھے۔ یہ کمک اسٹریٹ (کلکتہ) کی مسجد کے امام تھے۔ نام بھول گیا ہوں۔ پچاس ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور میرٹھ کے رہنے والے۔ میں نیا نیا کلکتہ آیا تھا کہ ایک دن امام صاحب پہنچے۔ گٹھیلا جسم، صاف ستھرا لباس۔ نیچی اچکن۔ سر پر قالب چڑھی مراد آبادی ٹوپی۔ شرعی پاجامہ۔ پاؤں میں جے پوری گرگابی۔ کندھے پر چار خانے کا حیدرآبادی رومال۔ بڑے ہنس مکھ، بڑے لسان۔ مل کر دل خوش ہوگیا۔ اپنی وضع میں فیشن ایبل تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔

اطلاع کی گئی۔ فوراً بلا لیے گئے۔ میں اپنے کام میں لگ گیا۔ بدرالدین اخبار پڑھنے لگے۔ چنچل فضل الدین بھی چپ کسی خیال میں غرق تھے۔ دفعتاً ایک عجیب وغریب قسم کی چیخ مولانا کے کمرے سے بلند ہوئی۔ ہمارے کان کھڑے ہوگئے۔ فوراً دوسری چیخ سنائی دی اور معاً تیسری چیخ نے تو ہمیں بدحواس کر ڈالا۔ یقین ہوگیا کہ مولانا پر کوئی آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ بے اختیار دوڑ پڑے اور زینے کی کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے مولانا کے کمرے پر پہنچے۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اس وقت ادب آداب کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ بھڑ ے دروازہ کو کھول کر ہم تینوں کے تینوں کمرے میں! مگر حیرت زدہ رہ گئے، کیونکہ بعینہ وہی چیخ پھر گونج رہی تھی...... ''مولانا، رانچی کے پپیتے!'' اور مولانا مجسم قہقہہ بنے ہوئے تھے!

ہمیں دیکھ کر مولانا نے سنجیدہ بنے بغیر فرمایا ''یہ کیا؟'' ہم کیا جواب دیتے؟ مولانا نے نظریں ہٹا کر امام صاحب پر جما دیں، گویا کہہ رہے ہیں یہ حرکت انہی بزرگ کی ہے۔ امام صاحب مسکرائے اور پھر اسی شان سے چیخے ''اور مولانا رانچی کے پپیتے''!

ہم کچھ سمجھے تو مگر سچ یہ ہے کہ کچھ نہ سمجھے۔ امام صاحب، مولانا کی دلچسپی پوری کر چکے تو نیچے اُترے۔ عرض کیا گیا، یہ چیخیں کیسی تھیں؟ مسخرے تو تھے ہی۔ قہقہہ مار کے فرمایا ''چیخیں کیسی؟ ہائے آپ کیا جانیں رانچی کے پپیتوں کی لذت!''

مولانا بہت دنوں تک امام صاحب کی چیخوں کی نقل اُتار کر ہنستے ہنساتے رہے۔ فضل الدین احمد کا کچھ حال پچھلے صفحوں میں گزر چکا ہے۔

مولانا کے مہمان

مولانا کے ہاں کبھی کبھی مہمان ٹھہرتے تھے۔ چند قابل ذکر ہیں:

ایک صاحب لدے پھندے، صوبہ بہار کے تشریف لائے۔ سر سے پاؤں تک بزعم خود شریعت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ناف تک لمبی داڑھی خضاب سے بھورائی ہوئی، سر پر لمبے لمبے چکنے پٹے کندھوں سے کھیلتے ہوئے، "شرعی" پاجامہ، نصف الساق تک جھولتا ہوا، ہاتھ میں جریب مبارک، کندھے پر چوخانے کا رومال، گھٹنوں سے نیچے تک شیروانی، فرق مبارک عمامہ سے آراستہ۔

صاحب سلامت بڑی قرأت سے کی، پھر فرمایا، بندہ بہ ایمائے غیبی اس لیے حاضر ہوا ہے کہ "آزاد صاحب" سے علمی مذاکرہ کرے۔ ان شاء اللہ العزیز، عقائد کے تمام فتور واعوجاج دور ہو جائیں گے!

اس عجیب الخلقت کے نزول کی مولانا کو خبر کی، تو فرمایا ٹھہرا لو۔ کچھ لطف رہے گا۔

موصوف ٹھہر گئے۔ ظہر کا وقت ہوا، تو نماز کو مسجد تشریف لے گئے۔ واپسی پر سوال کیا، بندے نے "آزاد صاحب" کو مسجد میں نہیں دیکھا۔ کیا بات ہے؟ میں نے جواب دیا، عدیم الفرصت ہیں۔ گھر ہی پر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ لال پیلی آنکھیں کر کے کہنے لگے مگر یہ تو "الحاد فی العمل" ہے۔ صلوۃ باجماعت کی پابندی لابدی ہے! عرض کیا، بوقت ملاقات خود مولانا سے مواخذہ کر لیجئے گا۔ تنک کر فرمایا اور خود آپ بھی مسجد میں نہ تھے۔ آپ کا عذر کیا ہے؟ میں نے برہمی سے جواب دیا، آپ کس حق سے سوال کر رہے ہیں؟ کہنے لگے: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاء امر بالمعروف ہمارا فریضہ ہے۔ احتساب سے باز رہے تو رب العالمین کو کیا جواب دیں گے!

میں نے قہقہوں میں بات اُڑا دی مگر وہ شخص ناک بھوں چڑھائے رہا۔ مغرب کے بعد جلد کھانا کھا کر کہنے لگا، رات کو واپسی دیر میں ہوگی۔ ایک خاص مقام پر ایک خاص عبادت کرنا ہے۔

رات کو کوئی دو بجے لوٹا۔ پھاٹک بند تھا۔ میں جاگ گیا۔ اُٹھ کر کھولا، تو حیرت سے دم بخود رہ گیا۔ وہ شخص سر سے پاؤں تک ننگا کھڑا تھا۔ جسم پر جابجا زخم بھی تھے۔ منہ سے ہچکیاں بھی آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی قدموں پر گر پڑا اور گڑگڑانے لگا "اب آبرو آپ کے ہاتھ ہے!" مولانا کو

اس حالت کی خبر نہ ہونے پائے!" میں نے کہا مگر ابھی چلے جاؤ اور وہ اسی وقت کپڑے پہن کر اور اسباب اٹھا کر چلا گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حضرت کی یہ گت کس بازار میں بنی تھی۔

صبح مولانا کو خبر کی تو وہ بھی تعجب میں پڑ گئے۔ پھر دیر تک اس قسم کے رنگیلے سیاروں کے واقعات سناتے رہے۔

ایک عرب مہمان آئے۔ شامی تھے اور اِس قدر بوڑھے کہ اتنا بوڑھا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ لحافوں اور توشکوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ چل نہیں سکتے تھے۔ اِدھر سے اُدھر اُٹھائے، بٹھائے، لٹائے جاتے تھے۔ نہ جانے اتنا بڑا سفر کس طرح برداشت کر سکے۔

بہرحال مولانا کے ہاں آ کر مقیم ہو گئے۔ زمانہ سخت گرمی کا تھا مگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ پنکھا کھولنے دیتے تھے نہ لحافوں سے خود باہر نکلتے تھے۔ سر سے پاؤں تک لحافوں میں غرق پڑے رہتے تھے۔ پسینے کا ایک سیلاب سا ان کے چہرے پر موجیں مارا کرتا تھا اور ایک عجیب وغریب سی بدبو سے کمرے میں ناک نہ دی جاتی تھی۔

آدمی مہذب تھے اور پڑھے لکھے۔ گفتگو دلچسپ اور شائستہ تھی۔ ایک دو روز آرام کر چکے، تو مولانا ان کے کمرے میں گئے۔ لاکھ منع کرنے بھی مصر ہوئے کہ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے مولانا نے سفر کا مقصد دریافت کیا، تو باچھیں کِھل گئیں اور لمبی تمہید کے بعد فرمایا کہ یہ تمام زحمت سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پوری کرنے کے لیے جھیلی ہے یعنی...... شادی! وطن میں کامیابی نصیب نہ ہوئی تو دل نے کہا، چلو جاوا۔ وہاں کے مسلمان، عربوں کو لڑکیاں دینا ثواب سمجھتے ہیں۔ ضرور مراد برآئے گی!

پہلے تو مولانا دیر تک حیرت میں رہے پھر عرب صاحب کی ہمت کو سراہتے ہوئے پوچھا، کیا شادی کا موقع نہیں ملا؟ عرب صاحب نے جواب دیا کیوں نہیں۔ چار عقد ہوئے مگر بیویاں مرتی گئیں۔ اب پیمانہ عمر لبریز ہے اور اِس خیال سے دل لرزتا ہے کہ رنڈوا مر گیا تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا!

مولانا کئی دن اس جوان دل بڈھے کی باتوں سے لطف اُٹھاتے رہے پھر جاوا روانہ کر دیا۔

ایک اور صاحب تشریف لائے۔ سوٹڈ بوٹڈ، چہرے پر کھچڑی فرنچ کٹ داڑھی، سر پر ترکی ٹوپی۔ ظاہر کیا، پروفیسر ہیں اور مولانا سے اسلام کے بارے میں اپنے کچھ شکوک دور کرنا چاہتے ہیں لیکن رات کو کھٹکا ہوا۔ میں تو نیچے ہی رہتا تھا۔ آنکھ کھل گئی۔ اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت، زینے پر چڑھ رہے ہیں اور مکان کے زنانے حصے میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر گھبرائے

تو مگر تھا بڑا ڈھیٹ۔ میرے کمرے میں آ بیٹھا اور کہنے لگا "مَشْی فی النَّوم" (سوتے میں چلنا) کا مرض مدت سے لاحق ہے۔ مجھے ذرا خبر نہیں، میں کیا کر رہا تھا!

خیر، ہم پھر سو گئے مگر یہ حضرت صبح سے پہلے ہی کسی وقت نکل بھاگے۔ بعد میں پولیس آئی اور معلوم ہوا کہ اشتہاری مجرم ہے اور مفرور ہے۔

اس واقعہ کے بعد مولانا سے عرض کیا کہ ہماشا کو مہمان بنانا ٹھیک نہیں۔ جواب دیا لیکن بے بسی ہے۔ ایک شخص ٹھہرنا چاہے، تو انکار کس طرح کیا جائے؟ میں نے کہا، شہر میں ہوٹل ہیں، مسافر خانے ہیں۔ مگر خاموش ہو گئے اور مہمانوں پر کوئی پابندی نہ لگی۔

ایک اور مہمان، سید محمد عمری تھے۔ سالہا سال رہے۔ ہمارے لیے ایسے ہو گئے تھے جیسے گھر کے آدمی ہیں۔

عمری صاحب، بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی، عزم و ہمت اور جدوجہد کی شاندار مثال پیش کرتی ہے۔ دمشق کے مشہور و معزز "عمری" (فاروقی) خاندان کے فرد تھے، ترکی کے شہرۂ آفاق سابق وزیر اعظم، جنرل محمود شوکت پاشا کے قریبی رشتہ دار تھے۔

خود عمری صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے والد، کل جمع گیارہ پونڈ چھوڑ مرے تھے۔ یہ اس وقت بارہ تیرہ برس کے لڑکے تھے، مگر اسی پونجی سے اسی عمر میں تجارت شروع کر دی اور جلد لکھ پتی بن گئے پھر چین گئے، پہلے ریشم کا کاروبار کیا مگر وہ ایک مقامی بغاوت میں تباہ ہو گیا پھر تمباکو اور سگریٹ کی تجارت میں لگے اور مالا مال ہو گئے مگر سیلاب آیا اور تمباکو کے گوداموں کے ساتھ کارخانہ بھی بہا لے گیا۔ اب پھر فقیر ہو گئے اور کلکتہ چلے آئے۔ یہاں ڈم ڈم سگریٹ کا عظیم الشان کارخانہ قائم کیا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ کارخانے کی پوری عمارت جو آج بھی موجود ہے، صرف چھبیس دن میں کھڑی کر دی، کارخانہ خوب چلا اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر عمری صاحب کے پاس اکتالیس لاکھ روپیہ نقد موجود تھا۔

لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ کہ عمری صاحب کی یہ تمام دولت ایک مرتبہ پھر تلف ہو گئی اور وہ پیچ تانبے کے پیسوں کے محتاج ہو گئے لیکن ہمت پہاڑ کی طرح اٹل رہی۔ برابر جدوجہد کرتے رہے اور انتقال سے پہلے جنوبی ہند میں سگار بنانے کا کارخانہ قائم کرنے میں پھر کامیاب ہو گئے۔

مولانا ان سے بہت مانوس تھے۔ روز شام سے نو بجے رات تک آپس میں ہنستے بولتے رہتے تھے۔ عمری صاحب سے مولانا کو یہ فائدہ ہوا کہ عربی کسی قدر روانی سے بولنے لگے۔

بدترین تہمت

مولانا کی پوری زندگی گواہی دے رہی ہے کہ ان میں شجاعت بدرجہ اتم موجود تھی۔ مشکلوں اور خطروں میں اعصاب پر قابو رکھتے تھے لیکن ۲۵ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مولانا بالکل گھبرا گئے اور ایسے ہو گئے، جس کا ان کے بارے میں خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہوا یہ کہ مولانا نے ایک ملازم کو، جو ان پر جاسوسی کرتا تھا، برطرف کر دیا۔ قطب الدین احمد، جن کا تذکرہ پچھلے صفحوں میں گزر چکا ہے، ان دنوں مولانا کے دشمن ہو رہے تھے۔ دشمنی کا سبب یہ بتاتے تھے کہ مولانا، کمیونزم کے مخالف ہیں، اس لیے انہیں گرا دینا چاہیے لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ مولانا سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور مولانا اس کے لیے تیار نہ تھے۔ قطب الدین نے ملازم کو پھانس لیا اور اس کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ رسالے میں مولانا پر ایک نہایت مکروہ تہمت لگائی گئی تھی۔

ڈاک میرے پاس آتی تھی، اس لیے رسالہ پہلے میری نظر سے گزرا، مولانا نے دیکھا مگر مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ میں بھی خاموش رہا اور سمجھا کہ ناپاک خرافات، ردی کی ٹوکری میں پہنچ گئی ہو گی مگر مولانا اس کے بعد سخت پریشان نظر آنے لگے۔

ان دنوں پنجاب کے ایک حضرت مولانا کے کارندے بنے ہوئے تھے۔ بڑے تیز اور چرب زبان تھے۔ ایک دن دوپہر کو کہیں باہر سے تشریف لائے اور عجیب خوف زدہ شکل بنا کر بڑی راز داری سے کہنے لگے، غضب ہو گیا۔ میں خاص ذریعہ سے قطب الدین کے گھر پہنچا۔ وہاں بہت سے آدمی جمع تھے۔ سب نقاب پوش اور مولانا کے خلاف بھیانک سازش کر رہے تھے۔ میں نے روک تھام کی تدبیر تو کی ہے۔ دیکھنا چاہیے نتیجہ کیا نکلتا ہے!

میں سب کچھ سمجھ گیا۔ بہت طیش آیا۔ اُسی وقت مولانا کے پاس پہنچا اور غصہ سے کہا، مولانا بس حد ہو گئی! اب لوگ آپ سے یہ سلوک کرنے لگے ہیں اور آپ ہیں کہ چوں نہیں کر سکتے!

افسردگی سے نگاہیں نیچی کر کے کہنے لگے، بدترین کمینوں سے سابقہ پڑ گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ عرض کیا، آپ کچھ نہ کریں۔ میں ان بدمعاشوں سے نپٹے لیتا ہوں لیکن ان پنجابی حضرت کو رخصت کر دیجیے۔ اور رخصت نہیں کر سکتے تو ان کی باتوں میں نہ آیئے۔ یہ شخص آپ کو لوٹ لے گا!

مولانا نے بڑی لجاجت سے کہا، آپ اِن شریروں کے منہ نہ لگیں۔ بات بڑھانے سے بڑھتی ہے۔ ہم خاموش رہیں گے، تو یہ خود ہی ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔

میں کیا کرتا؟ چپ ہو رہا اور کم سے کم یہ یقین ہو گیا کہ اب مولانا ہشیار ہو گئے ہیں اور پنجابی بزرگ کے دھوکے میں نہ آئیں گے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص نے مولانا سے ایک بڑی رقم اینٹھ ہی لی!

مجھ سے نہ رہا گیا اور مولانا سے پھر اُلجھ پڑا تو فرمایا، مولوی صاحب، میں مجبور تھا۔ آبرو بڑی چیز ہے۔ اس قسم کی تہمتیں آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتیں۔ لوگ بری بات، لاکھ نامعقول ہو، سنتے ہی قبول بھی کر لیتے ہیں اور پھیلا بھی دیتے ہیں۔ خدا ان کمینوں سے ہر انسان کو محفوظ رکھے!

مولانا کس طرح لکھتے تھے؟

مولانا کی ہر تحریر ایسی ہے کہ عش عش کرتے رہیے۔ اعلیٰ انشاء و ادب کا نمونہ جس کی تقلید ممکن نہیں۔ تحریر پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا سے پرے، بہت پرے سے کوئی غیبی آواز بول رہی ہے۔ مولانا کو لکھتے دیکھ کر مجھے عجیب حظ حاصل ہوتا تھا۔ ہونٹوں پر ایک خفیف سا دلفریب تبسم کھیلتا ہوتا اور انگلیوں میں قلم ناچتا ہوا کاغذ کے میدان پر بے روک دوڑا کرتا۔ لکھتے وقت چہرہ ہی نہیں، پورا سراپا دیکھنے کے لائق ہوتا۔ حسن مجسم بن جاتے تھے۔ شائد اپنی تحریر سے خود بھی لطف اُٹھاتے تھے لیکن لکھ چکتے تو اتنے چاؤ سے سنواری ہوئی تحریر پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑتے۔ سطروں پر سطریں کٹتی چلی جا رہی ہیں۔ لفظوں کا قتل عام ہو رہا ہے پھر نظر ثانی کی گئی تو پہلی نظر ثانی سے بھی طبیعت غیر مطمئن۔ اب پھر چھری چلنے اور قیمہ بنانے لگی۔

ان کے لکھے ہزاروں صفحے نقل کر چکا ہوں۔ مسودہ ایسا کٹا پھٹا ہوتا کہ بارہا خود انہی سے رجوع کرنا پڑتا۔ اور وہ بنانے لگتے ''واہ مولوی صاحب آخر آپ اتنی عمر کرتے کیا رہے؟'' ''صاف'' عبارت بھی پڑھی نہیں جاتی!''

مسودہ کسی نہ کسی طرح نقل ہو گیا مگر دوسرے دن یہ نقل بھی قیمہ بنی چلی آ رہی ہے ''ذرا صاف کر دیجئے'' بات یہ ہے کہ مولانا اپنی تحریر پر بڑی محنت کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ چن چن کر، تول تول کر بٹھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریریں ادبی اسقام و معائب سے پاک ہوتیں۔ میرے خیال میں محمد حسین آزاد مرحوم کے علاوہ ہمارے مصنفوں میں کوئی نہیں، جو مولانا کی طرح تحریر پر

محنت کرتا ہو۔ علامہ شبلی نعمانی بھی نہیں۔ علامہ کا اندازِ تحریر مولانا سے مختلف تھا۔ علامہ نہایت بلاغت سے سادہ عبارت لکھتے تھے اور عبارت معانی کے ساتھ چلتی تھی۔ اس طرز میں مہارت ہو جائے، تو معاملہ کسی قدر آسان ہو جاتا ہے لیکن محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا کا ڈھنگ دوسرا تھا۔ لفظوں کا ایک طلسم ہوتا تھا۔ ایک لفظ بھی بے محل ہو جائے تو سارا طلسم ہی ٹوٹ جائے۔ اسی لیے دونوں بزرگوں کو لفظوں کے انتخاب، لفظوں کی نشست، لفظوں کی موسیقیت کا بڑا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔

لیکن ہمارے مولانا کا معاملہ، محمد حسین آزاد سے زیادہ مشکل تھا۔ آزاد مرحوم کا دائرہ شعر و ادب ہی تک محدود تھا "دربارِ اکبری" بھی تاریخ سے زیادہ ادب کی کتاب ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے مولانا نے ادب، سیاست، مذہب، تاریخ، فلسفہ، سبھی میدانوں میں جولانیاں کی ہیں اور ہر میدان کو سر کر کے رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ایسا ہمہ گیر انشا پرداز اس ملک میں پیدا نہیں ہوا۔

اس موقعہ پر یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب ہے کہ مولانا کو ان لوگوں کی تحریروں سے کوفت ہوتی تھی، جو ان کی نقل اُتارتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "نقال کبھی انشا پرداز نہیں بن سکتا۔ آدمی اپنے ذوق و سلیقے پر رہے، تو اس کا اپنا ایک اسلوبِ تحریر بن جاتا ہے۔ یہ اسلوب قدرتی ہونے کی وجہ سے گوارا اور مقبول ہو سکتا ہے"۔

لکھنؤ کی ایک خاص صحبت

مولانا نے ایک دفعہ بیان کیا کہ جس زمانے میں ان کا قیام لکھنؤ میں تھا، تو روز صبح ایک عجیب صحبت رہا کرتی تھی۔

اکبری دروازے چوک کے باہر صبح چار بجے ایک بوڑھا شخص، چائے کا گرم سماوار اور کچھ پیالیاں لیے زمین پر بیٹھا ہوتا۔ مولانا نے فرمایا، علامہ شبلی نعمانی، مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا رسوا، خواجہ عبدالرؤف عشرت، خواجہ عزیز لکھنوی، خود میں اور کئی اور ادیب و شاعر ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے اور سماوار کے گرد فرش زمین ہی پر بیٹھ جاتے۔ چائے فروش ایک ایک پیالی سب کے لیے انڈیل کر باتیں شروع کرتا۔ باتیں کیا تھیں، منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ شاہی زمانے کے حالات بڑے حزن و کرب سے سناتا۔ واجد علی شاہ کے ایسے ایسے واقعات بیان کرتا کہ کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ قیصر باغ کی رنگ رلیاں، پادشاہ کے لطیفے، شاہی آداب، بیگموں کے دستور، شادی بیاہ کی رسمیں،

مشہور شعرا کی مجلسیں، ان کی آپس کی نوک جھونک، غرض کہ بڈھا کیا تھا، بلبل ہزار داستان تھا اور عہدِ قدیم کی بیش بہا معلومات کا خزانہ۔

ہر پیالی کی قیمت ایک روپیہ ہوتی تھی۔ خود چائے بھی بڑی لذیذ ہوتی تھی۔ یہ مجلس اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ بڈھا اپنا سامان اٹھا کر چوک کی گلیوں میں غائب ہو جاتا اور پھر دوسری صبح تک کہیں نظر نہ آتا۔

مولانا کا خیال تھا کہ یہ شخص کوئی بڑا خاندانی نواب تھا۔ زمانے کے ہاتھوں پس گیا تھا۔ یہی چائے اس کا ذریعہ معاش تھی اور زبان اس کی سفارشی دن کے اُجالے میں چھپا رہتا۔ اپنی مٹی ہوئی امارت و نجابت کو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتا۔

کفش برداری

مجھے کلکتہ آئے تھوڑے دن ہوئے تھے کہ مسجد ناخدا میں مولانا تقریر کرنے گئے میں ساتھ تھا۔ سیڑھیوں پر جوتے اُتار کر وہ تو آگے بڑھ گئے اور میں نے ان کے جوتے اٹھا لیے۔ واپسی پر جوتے قاعدے سے سامنے رکھ دیئے۔ مولانا کچھ نہیں بولے۔ ٹیکسی میں بھی دیر تک گم صم رہے۔ پھر جو گفتگو ہوئی، نیچے درج کرتا ہوں:

مولانا: مولوی صاحب، یہ آپ نے کیا کیا؟

میں: وہی جو میں نے کیا!

مولانا: مجھے سخت اذیت ہوئی۔

میں: اذیت تو ہوئی ہوگی!

مولانا: میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔

میں: آپ کو میری عزت کرنا ہی چاہیے!

مولانا: آپ کو نہیں چاہیے کہ مجھے تکلیف دیں۔

میں: چاہیے تو نہیں مگر تکلیف دینے میں مجھے لطف آتا ہے!

مولانا: آئندہ پرہیز کیجئے۔

میں: پرہیزگاری میری وضع نہیں!

مولانا نے منہ گھما کر مجھے غور سے دیکھا اور فرمایا "آپ میں شوخی بہت ہے"!

عرض کیا "جی ہاں":

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں !

مولانا: مگر آپ شعر ناموزوں پڑھتے ہیں۔

میں: یہی تو کمال ہے: مَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ!

مولانا ہنسنے لگے مگر کفش برداری کی رسم جاری رہی اور مولانا سے ہلکی سی پکڑ بھی!

مولانا اور آم

مولانا کو آم مرغوب تھے، خصوصاً ملیح آباد کے آم، فرمایا کرتے تھے، خدا نے آم، ملیح آباد کی زمین کے لیے پیدا کیا ہے اور ملیح آباد کی زمین، آم کے لیے بنائی ہے! آموں کے سلسلے میں اس قصبے کو بہت ترقی دینے کے خواہشمند تھے۔ ملیح آباد کے آموں سے اِس قدر شغف تھا کہ فرمایا، چند منتخب قسموں کے درخت دہلی کی کوٹھی میں لگ جاتے، تو اچھا ہوتا۔ یہ بات کنگ ایڈورڈ روڈ کی کوٹھی نمبر ۴ میں ہوئی اور میں نے چھ درخت منگا کر نصب کر دیے مگر افسوس، مولانا ان کے پھل نہ کھا سکے۔

ملیح آباد کے آم خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس درجہ صاحبِ ذوق ہونے پر بھی مولانا کو آم کھانا نہ آئے۔ بارہا سمجھایا، بارہا تیار کر کے دیے مگر کبھی سمجھ ہی نہ پائے کہ تیار آم کا مطلب کیا ہے!

حال کا واقعہ ہے کہ ایک دن سہ پہر کو حاضر ہوا، تو چائے پی رہے تھے اور ایک بڑا اسا مدراسی آم طشتری میں سامنے رکھا تھا۔ آم بالکل زرد تھا مگر صورت بتا رہی تھی کہ ابھی تیار نہیں ہے، عرض کیا، آپ یہ آم کھائیں گے؟ حالانکہ دہ پر نہیں آیا ہے۔ مسکرائے اور آم ہاتھ میں لے کر زور سے دابا، وہ دب گیا تو فرمانے لگے، دیکھا آپ نے بالکل تیار ہے! عرض کیا ہرگز تیار نہیں ہے اور آپ نے داب کر تو اسے قتل ہی کر ڈالا ہے۔ اب کبھی تیار نہ ہو سکے گا۔

مسکرائے، چیلنج بھری نگاہ سے دیکھ کر آم کاٹا اور قاش منہ میں رکھ لی۔ کھٹی نکلی۔ کہنے لگے، مولوی صاحب اپنی بات کی پچ میں منتر پڑھ کر آپ نے آم کھٹا کر ڈالا ہے!

عرض کیا، مولانا آم کھانا بھی ایک فن ہے اور اس فن کے ماہر ملیح آباد ہی میں مل سکتے ہیں۔ ہر آم کے بارے میں وہ جانتے ہیں کہ کب تیار ہوگا اور تیاری پر اس کی شکل کیسی ہوگی۔ یہی سبب

ہے کہ لوگ ملیح آباد جاتے ہیں اور آم کھا کر باغ باغ ہو جاتے ہیں لیکن وہی آم اپنے وطن لے جا کر کھاتے ہیں، تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملیح آباد والے، اصلی آم نہیں دیتے!

آخری مرتبہ ثمر بہشت (کھجری) کے بہت بڑھیا اور بجل دانے آگئے تھے۔ میں نے پیش کر دیئے۔ چند روز بعد سوال کیا، وہ آم کیسے تھے؟ فرمایا سب نہرو کو بھیج دیئے۔ عرض کیا۔ یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ پنڈت جی بھی آم کھانا نہیں جانتے! اس پر مسکرائے اور فرمایا، آموں کی فصل میں آپ ملیح آباد میں ایک کلاس کھول دیں اور ہم سب ''لڑکے'' اس میں بیٹھ کر آم کھانا سیکھ آئیں! عرض کیا سنجیدگی سے کہتا ہوں کہ تجویز معقول ہے۔ غور تو کیجئے، ملک ملک کے لوگ آتے ہیں۔ حکومت کے مہمان ہوتے ہیں۔ آپ حضرات انہیں آم کھلاتے ہیں اور فرماتے ہیں، یہ ہندوستان کا خاص میوہ ہے مگر خود آم کھانا نہیں جانتے۔ مہمانوں کو بھلا کیا سواد ملتا ہوگا۔ کھانا تو بعد کا معاملہ ہے، آپ حضرات کو آم کاٹنا تک نہیں آتا۔ روٹی پر مکھن لگانے والی چھری سے بھی کسی نے کبھی آم تراشے ہیں!

محمد علی اور مولانا

علی بھائیوں، مولانا محمد علی، شوکت علی سے مولانا کی چشمک تھی۔ مولانا شوکت علی نہ ذہین تھے نہ حاضر جواب، اس لیے مولانا انھیں اہمیت نہیں دیتے تھے مگر محمد علی مرحوم دوسری چیز تھے اور مولانا سے ان کی نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی ذہانت اور طباعی کے قائل تھے۔

ایک واقعہ سنیے۔ حجاز سے واپسی کے بعد علی بھائی، ابن سعود کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور خلافت کمیٹی کو اپنی رائے پر چلانا چاہتے تھے۔ اِس پر لکھنؤ میں کانفرنس ہوئی۔ پنجاب سے ابن سعود کے حامیوں کا ایک بڑا جتھا، مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کی قیادت میں آیا اور بنگال سے مولانا نے ایک طاقت ور وفد میرے ساتھ بھیجا۔ مولانا محمد علی نے پنجاب والوں کا نام رکھا ''پنجابی ٹولہ'' اور بنگال والوں کا ''بنگالی ٹولی''۔

کانفرنس کے دوران میں مولانا محمد علی نے مجھ سے کہا ''ایک عجیب و غریب آدمی قبضے میں آرہا ہے۔ اردو کا بلند پایہ ادیب و شاعر ہے اور انگریزی تو ایسی پیاری لکھتا ہے کہ پڑھ کر میں تو لوٹ پوٹ ہو گیا'' میں نے نام پوچھا، تو بہار کے ایک صاحب تھے۔

لوٹ کر مولانا سے محمد علی مرحوم کے اِس انتخاب کا تذکرہ کیا، تو بے قرار ہو گئے۔ فرمایا، ابھی تار پر روپیہ بھیجو اور بلالو۔ ایسا آدمی میرے پاس رہنا چاہیے!

یہ صاحب تشریف لائے مگر ہلکے نکلے۔ شاعر تو اچھے تھے لیکن اردو نثر میں کورے۔ انگریزی بھی ٹُسّس پُھسّی! مولانا کو بڑی نا امیدی ہوئی۔ بے تکلفی ہو جانے پر میں نے حضرت سے پوچھا کہ محمد علی مرحوم پر آپ نے کیسے رنگ جمایا؟ فرمایا ''دھوکا دیا تھا!'' مدتوں مولانا سے وابستہ رہے، مگر مولانا نے حقیقت جان جانے کے بعد انہیں ہمیشہ ''منشی'' ہی کہا اور لکھا!

عید کی نماز

کلکتہ کا میدان اپنی وسعت و رونق کے لیے مشہور ہے۔ عیدین کی نمازیں اسی میدان میں ہوا کرتی تھیں۔ اب بھی ہوتی ہیں مگر وہ بات کہاں، جو مولانا کی امامت کے زمانے میں تھی۔

نمازِ عید کے لیے مولانا جبہ ضرور پہنتے تھے اور سر پر حسین عمامہ ہوتا تھا۔ ٹھیک وقت پر پہنچتے۔ نہایت پراثر خطبہ اردو میں دیتے اور انسانوں سے بھرا ہوا میدان ان کی پُر جوش آواز سے گونجتا رہتا۔ پھر مصافحے کے لیے نمازی ہجوم کرتے۔ ہجوم بھی ایسا کہ ہر لحہ اندیشہ رہتا، کہیں لوگ، منبر ہی کو اُلٹ نہ دیں۔

معانقوں کی مصیبت الگ تھی۔ معمولی نہیں، خطرناک مصیبت۔ لوگ جوش میں بھرے ہوئے لپکتے اور چمٹ جاتے۔ یہ بات طے شدہ نہ تھی کہ ایک ٹکر چلے گی، یا دو ٹکریں، یا تین۔ ایک دفعہ سردی سخت تھی۔ ٹکریں طے نہ ہونے کی وجہ سے ایک معانقہ باز کا سر اس زور سے میری ناک سے ٹکرایا کہ نکسیر پھوٹ گئی۔ میں منبر کے قریب تھا۔ مولانا کی نظر پڑ گئی۔ کھڑے ہو گئے پانی منگایا۔ ناک دھلوائی اور لوگوں کو اِس وحشیانہ حرکت پر منع فرمائی۔

کلکتہ کی جماعت (عید) ہندوستان بھر میں مشہور تھی لیکن فرقہ پرستی کا جنون بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا کہ مولانا کی امامت کے خلاف نعرے بلند ہونے لگے اور بغیر کسی بدمزگی کے مولانا امامت سے کنارہ کش ہو گئے۔

اس واقعہ سے بڑی تکلیف پہنچی اور بہت لوگ بھی سخت رنجیدہ ہوئے۔ ہم نے اسی میدان میں الگ نماز کا سامان کیا اور پڑھی بھی، مگر بعد میں مولانا نے بلا کر نئی جماعت کھڑی کرنے سے منع کیا۔ فرمایا ''مسلمانوں میں مزید افتراق پیدا کرنا، اسلام سے بدترین دشمنی ہے'' اور ہم اپنے ارادے سے دست بردار ہو گئے۔

سہروردی فیملی

سہروردی خاندان، کلکتہ کا ایک مشہور خاندان تھا اور یہ خاندان قومی و وطنی مصالح کے مقابلے میں انگریزی اقتدار کی جو خدمات انجام دے چکا ہے، وہ بھی مشہور ہیں۔ مولانا کے پرانے مسودوں میں چند سطریں اس خاندان کی شان میں دستیاب ہوگئی ہیں۔

ترکِ موالات کی تحریک زور شور سے جاری تھی اور مسلمان انگریز کی بنائی ہوئی کونسلوں کا بائیکاٹ کر چکے تھے، مگر پیدائشی غداروں سے اندیشہ تھا کہ وطن و اسلام کی دشمن انگریزی سلطنت ہی کا ساتھ دیں گے۔ اس قسم کے مشتبہ لوگوں کی ایک پرائیویٹ کانفرنس، مولانا نے طلب کی تھی۔ کانفرنس کے بعد اخباری نمائندوں نے اس بارے میں کچھ سوال کیے تھے اور مولانا نے تحریری جواب دئے تھے "سہروردی فیملی" کے متعلق مولانا نے ذیل کا جواب لکھا:

"دونوں [۲۶] سہروردی، جو ڈاکٹر ہیں، مجھے برابر یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہماری طرف سے نا امید نہ ہو اور یہ کہ میرے دلائل قابلِ تسلیم ہیں مگر ہر شخص کی طرح میں بھی جانتا ہوں کہ وہ جائیں گے اور ایک درجن جگہوں سے وہ اپنے تئیں نامزد کرا چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قوم کو چھوڑ کر گورنمنٹ سے ملنا کوئی بُرائی ہے تو یہ ایسی برائی ہے، جو ہم ہمیشہ کرتے آئے ہیں!"

ٹائپ کے حروف

مولانا ٹائپ کی طباعت کے ہمیشہ حامی اور پتھر کی چھپائی کے مخالف رہے۔ اس سلسلے میں ان کی کوششیں سب کو معلوم ہیں۔ ٹائپ کی طباعت کو رواج دینے کا انھیں اس قدر اہتمام تھا کہ ایک بہت بڑا اقدام اُٹھانے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ جس میں بھاری مالی نقصان کا اندیشہ نہیں، یقین تھا۔ مولانا کے اس اقدام کا حال ان کے ایک مسودہ خط سے معلوم ہوگا، جو اردو میں لکھ کر مجھے دیا تھا کہ ان کی جانب سے عمر رضا کو قسطنطنیہ روانہ کردوں۔

عمر رضا میرے دوست تھے۔ جب میں قسطنطنیہ میں تھا، تو انور پاشا مرحوم کی سرپرستی میں نکلنے والے اخبار "جہانِ اسلام" کا اردو حصہ میں ایڈیٹ کرتا تھا اور ترکی و عربی حصے عمر رضا۔ مولانا کا مسودہ میں نقل کرتا ہوں:

"آئندہ ڈاک سے ایک خط، عمر رضا کو لکھیے۔ اس میں میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجیے، ترجمہ ثورۃ الہند [۲۷] کے لیے اور اس کے بعد لکھیے کہ:

ایک عرصہ سے میرا خیال ہے کہ تمام عالم اسلامی کے خط طباعت کی وحدۃ کے لیے سعی کرنا وقت کی مہمات میں سے ہے کیونکہ مقومات امت میں سے ایک اہم ترین چیز زبان اور خط کی بھی وحدۃ ہے۔ ہندوستان میں لغت ہندیہ جو عربی و فارسی و ترکی کی پیداوار ہے، بہت ترقی کر چکی ہے لیکن اب تک اس کی طباعت نستعلیق فارسی میں محدود ہے اور ٹائپ کی جگہ سنگی مطابع سے کام لیا جاتا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں الہلال ٹائپ میں نکالا لیکن وہ ٹائپ یہیں کا تیار کردہ تھا اور اس لیے خط نسخ عربی کی جگہ خط فارسی کا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ترکی کی طرح ہندوستانی کے لیے بھی ترکی کا عربی ٹائپ رائج کیا جائے اور وسیع پیمانے پر ایک مطبعہ قائم کیا جائے۔ بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ابتدا میں وہ مقبول نہ ہوگا اور خسارہ کا متحمل ہونا پڑے گا لیکن میں اس کے لیے تیار ہوں۔

جرمنی اور امریکا میں خط عربی کا لینوٹائپ اور ٹائپوگراف مشین بن گئی ہے یعنی وہ مشین، جس میں بیک وقت حرف ڈھلتا اور مرتب ہو جاتا ہے اور ہر مرتبہ نیا حرف میسر آتا ہے لیکن چونکہ ہمارا مقصد حروف عربیہ ترکیہ کی اشاعت ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ڈھالنے کی فونڈری یہاں بنائی جائے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا، اس کی اشاعت نہیں ہو سکتی۔

یہ ادارہ کسی تجارتی مقصد سے نہیں ہے۔ تجارتی فوائد اس کام میں مل سکتے ہیں جس کی ملک میں طلب ہو لیکن یہ تو ایسی چیز ہے جو یہاں مطلوب ہونے کی جگہ بلکہ غیر مقبول و مطرود ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اتحاد شعب امت اور وحدۃ مسلمین کے لیے ہندوستان کو بھی حروف عربیہ و ترکیہ کے سلسلے میں منسلک کر دیا جائے اگرچہ اِس راہ میں کتنا ہی نقصان ہو۔

پس یہ بے جا نہیں اگر میں اخوان ترکیہ سے اس میں مساعدۃ کا امیدوار ہوں اور خاص طور پر آپ کو لکھتا ہوں کہ اس بارے میں کوشش کر کے مجھے صورت حال سے مطلع کیجیے۔ اِس کام کے لیے ضروری ہے کہ آستانہ کے کارخانہ حروف سازی سے حروف ڈھالنے کے امہات حاصل کیے جائیں اور یہاں ان سے کام لیا جائے۔ میں اِس کے لیے بھی تیار ہوں کہ اگر وہاں سے کوئی ماہر فن ہندوستان آ کر اس کام کو انجام پہنچاوے تو اس کے معاوضہ و مصارف کا میں متحمل ہوں۔ پس آپ وہاں مشورہ کیجیے اور بالتفصیل لکھیے کہ اِس مقصد میں کیونکر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اس بارے میں وہاں کے بعض ارکان حکومت سے استدعا کریں لیکن بعد کو ہم نے خیال کیا کہ بہتر ہوگا آپ کے ذریعہ پہلے صورت حال معلوم کرلیں۔

پیری مریدی

معلوم ہے مولانا کے والد بہت بڑے پیر تھے مگر مولانا کو اِس دھندے سے سخت نفرت تھی۔ والد، کلکتے میں دفن ہیں۔ پہلی برسی ہوئی تو مرید مزار پر جمع ہوئے اور ہر ممکن طریقے سے زور ڈالا کہ آبائی گدی سنبھالیں اور سالانہ عرس کرتے رہیں مگر مولانا نے بڑی صفائی سے اِس پورے معاملے کی مذمت کی اور اعلان کر دیا کہ جس کا جی چاہے، میری رضا مندی کے خلاف عرس کا بندوبست کرے۔ خود میں شریک نہیں ہوں گا اور انہوں نے کیا بھی یہی بلکہ میں نے اپنے تمام زمانہ قیام میں کبھی نہیں دیکھا کہ مولانا اپنے والد کی قبر پر گئے ہوں اور یہ محض فتنے سے بچنے کے لیے اور پیری مریدی سے انتہائی نفرت کی وجہ سے۔

مولانا اِس معاملے سے اتنے بے زار تھے کہ والد کی تصنیفات کی اشاعت بھی گوارا نہیں کی۔ مطبوعہ کی بھی نہیں، غیر مطبوعہ کی بھی نہیں۔ یہ تصانیف غالباً اب بھی مولانا کے کتب خانے کی الماریوں میں بند پڑی ہوں گی، جسے وہ "انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز" (نئی دہلی) کو عطا کر چکے ہیں۔

والد کے مریدوں سے بھی مولانا بہت گھبراتے تھے۔ وہ زیارت و قدم بوسی کے لیے برابر حاضر ہوتے اور مولانا ملنے سے انکار کر دیتے۔ مدتوں یہی ہوتا رہا، آخر ہفتے میں ایک دن مقرر کر دیا گیا۔ مرید جمع ہوتے اور مولانا تقریباً ایک گھنٹہ ان میں بیٹھتے اور وعظ و نصیحت کرتے۔

لیکن انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دہلی میں مولانا کی قبر پر جو کچھ ہوتے میں نے دیکھا ہے، وہ کہیں ان کی قبر کی بھی پرستش کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو۔ اِس بارے میں مولانا کا ایک اہم و دلچسپ مضمون، کتاب کے آخر میں آپ دیکھیں گے۔

مولانا کے سسر

مولانا کے سسر، مولوی آفتاب الدین صاحب، فرشتہ صفت انسان تھے۔ وہ مولانا کے والد مولوی خیر الدین صاحب مرحوم کے مرید تھے اور خود مولانا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی مولانا کے بڑے بھائی، مولوی غلام یٰسین آہ کو بیاہی تھی، دوسری خود مولانا کے عقد میں تھی اور مولوی آفتاب الدین اپنی بیوی اور غیر شادی شدہ اولاد کے ساتھ، مولانا ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ سروے آفس میں عمر بھر ملازم رہے، مگر تنخواہ میں اضافہ کبھی منظور نہ کیا پہلے دن جو رقم مقرر ہو گئی تھی، وہ آخر تک برقرار رہی!

مولانا کے باورچی خانے کا سامان مرحوم ہی لایا کرتے تھے، مگر اس بارے میں ان کے کچھ خاص اصول تھے۔ جن سے بال برابر بھی ہٹنا گوارا نہ تھا۔ جو ترکاری ایک دن لے آتے پھر وہی آتی رہتی۔ میں دبی زبان سے کبھی کہتا کہ ایک ہی ترکاری کیوں؟ تو بڑی معصومیت سے فرماتے ''فصل کی چیز ہے''!

مولانا جب نمبر ۱۱ بالی گنج سرکلر روڈ کے مکان میں منتقل ہوئے تو احاطے کے اندر بڑا چمن بھی تھا۔ میری کم بختی، مولوی آفتاب الدین کے سامنے کہہ دیا کہ چمن کے ایک حصے میں ترکاری بوئی جا سکتی ہے۔ مولوی صاحب نے اسی دن گوبھی کی کاشت کر دی اور اب جو کھانے میں گوبھی شروع ہوئی ہے تو الاماں والحفیظ! آخر میں چیخ اٹھا اور بار بار مولوی صاحب سے کہنا شروع کیا، اس غلیظ ترکاری سے نجات دیجئے مگر ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ''فصل کی چیز ہے'' ایک بار مونگ کی دال کا دور چل گیا، تو دونوں وقت مونگ کی دال! میں ناک بھوں چڑھاتا، تو عجیب پراسرار لہجے میں کہتے ''بہت مفید ہے!''

مولوی صاحب مرحوم کیلے بھی کچے ہی لاتے تھے۔ یاد نہیں پڑتا، مولانا کے ناشتے پر کبھی پکا کیلا کھایا ہو۔ مولانا کیلے کو اٹھا کر دیکھتے اور خاموشی سے رکھ دیتے۔ میں نے بارہا مولوی صاحب سے پوچھا، آپ پکے کیلے کیوں نہیں لیتے؟ ایک ہی جواب ملا ''پکے کیلے جلد بگڑ جاتے ہیں'' میں عرض کرتا مگر اتنے کب آتے ہیں کہ کئی دن چلیں؟ روز کے روز تو کھا لیے جاتے ہیں۔ اس پر فرماتے ''مگر پکے اور کچے ایک ہی بھاؤ ملتے ہیں، پھر پکے کیوں لئے جائیں!'' مرحوم جب تک زندہ رہے، اپنے انہی اصولوں پر جمے رہے!

مولانا کے ماموں

ایک دفعہ مولانا کے ماموں، محمد قاسم صاحب مکہ معظمہ سے آئے۔ وطن مکہ ہی تھا۔ عجب نہیں، اب تک زندہ ہوں۔ تعلیم بس یوں ہی شد بد تھی مگر اہل مکہ کی طرح شائستہ اور مجلسی آدمی تھے۔ بڑی دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔

نہایت سادہ مزاج تھے۔ بھوپال میں اپنی بھانجیوں یعنی مولانا کی بہنوں کے پاس بھی مہمان رہے۔ وہاں کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے، عجیب اتفاق گیند آ کے منہ پر لگا اور سامنے کے دو تین دانت ٹوٹ گئے۔

کلکتہ میں مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور بڑی بے تکلفی ہو گئی تھی جب انہیں معلوم ہوا کہ میں پٹھان ہوں تو کہنے لگے کہ ہماری والدہ بھی پٹھان تھیں۔ صوبہ سرحد سے اپنے والد کے ساتھ ہجرت کر آئی تھیں۔ موصوف نے اپنے نانا کا نام بھی بتایا تھا، مگر میں بھول گیا ہوں۔ چونکہ مولانا کے خاندانی حالات سے دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے ان سے اس بارے میں کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔

مولانا کی بیگم کا انتقال

مولانا، احمد نگر کے قلعے میں سنت یوسفی پوری کرر ہے تھے اور کلکتہ میں ان کی بیمار بیگم ایڑیاں رگڑ رہی تھیں! افسوس یہ دنیا بھی کیسی بے رحم ہے۔ ایسے نازک، جگر پاش موقعہ پر دشمنوں کو بھی ترس آجاتا ہے لیکن ایک ''دوست'' نے ایک ''جاں نثار'' نے کیا کیا؟

ایک صاحب، جواب دنیا میں موجود نہیں ہیں، اپنے آپ کو مولانا کا سب سے بڑا فدائی ظاہر کیا کرتے تھے اور جب مولانا کلکتہ میں ہوتے تو حاضر رہتے اور مختلف خدمتیں بڑے جوش سے بجالایا کرتے۔ اب مولانا کی بپتا سے انہوں نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ لوگوں کے پاس جاتے اور بسُور بسُور کر کہتے کہ مولانا کے گھر میں فاقہ ہے! اس طرح حضرت نے بڑی رقمیں وصول کیں اور ہضم کرتے چلے گئے۔ مجھے معلوم ہوا تو انتہائی صدمہ پہنچا۔ مولانا کے مکان پر فون کیا۔ جواب ملا، کسی کو بھی اس قسم کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ کسی کا کوئی پیسہ آج تک قبول نہیں کیا گیا۔ حالات کچھ بھی ہوں، صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیے جائیں گے!

جواب، مولانا کی شان کے عین مطابق تھا۔ میں نے اخبار میں اعلان کر دیا کہ مولانا کے نام پر کسی کو کچھ نہ دیا جائے۔ مولانا کا خاندان بے نیاز ہے۔ پبلک کو دغابازوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

حیرت ہوئی کہ اس اعلان کے بعد بھی یہ قزاق صاحب بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ملتے ہی نہیں رہے بلکہ تقدس کا سکہ بھی بٹھانے کی کوشش میں لگے رہے۔ خیر سے مولوی، مولانا ہونے کے بھی مدعی تھے اور جو کچھ سب کے لیے ناجائز ہے، اپنے لیے سراسر جائز و مباح بلکہ مستحسن و مستحب یقین فرماتے تھے! البتہ سننے میں آیا ہے کہ اخبار میں اعلان نکلنے کے بعد شہر میں میری ''دہریت'' کا رونا روتے پھرتے تھے لیکن اب مر چکے ہیں۔ خدا ہم سب کے گناہ معاف فرمائے!

یہ تو معلوم تھا کہ مولانا کی بیگم بیمار ہیں مگر میں عیادت کو نہیں جاتا تھا، کیونکہ مولانا موجود نہ تھے۔ ۱۹اپریل ۴۳ء کی صبح نو دس بجے فون آیا کہ بیگم صاحبہ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ میں فوراً پہنچ گیا۔ گھر کے اُداس نظارے ہی نے سب کچھ بتا دیا۔ مجھ سے کہا گیا، بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلو۔ مجھے تامل ہوا۔ مدتوں ایک ہی گھر میں رہا تھا اور پردہ بھی نا کا تھا مگر کبھی اُچٹتی نگاہوں سے بھی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میرا پس و پیش دیکھ کر کہا گیا، بیگم صاحبہ مصر ہیں کہ تم پہنچو۔ وقت آخر ہے۔ دیر نہ کرو۔

مجبوراً جانا پڑا۔ واقعی بیمار کا آخری وقت تھا مگر نہ جانے کہاں سے قوت آ گئی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا کہنے لگیں ''آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ ان سے کہنا کہ تمہارے ہی نام پر مر رہی ہوں مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا!'' ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ کہنے لگیں ''مولانا کے لیے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں!''...... ہچکی آئی۔ اب وہاں کچھ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف ایک لاش باقی تھی:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْإِكْرَامِ.

پرآشوب زمانہ تھا۔ نیشنلسٹ مسلمان گردن زدنی قرار پا چکے تھے۔ مولانا پر تیروں کی سب سے زیادہ بوچھاڑ تھی لیکن ہوا کیا؟ کلکتے کے مسلمان سنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور جامع مسجد میں نماز کے بعد جب جنازہ اٹھا تو ان گنت انسان کندھا دے رہے تھے۔ مسلمان ہی نہیں جس ہندو اور سکھ بھائی نے سنا ساتھ ہو گیا۔ عظیم الشان جلوس قبر تک پہنچا۔ کیوں نہیں اٹھتا؟ ''عاشق'' کا جنازہ تھا، دھوم سے اُٹھنا ہی تھا!

نظر بندی سے چھوٹ کر مولانا گھر پہنچے۔ اسی وقت میں بھی حاضر ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے اور میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

مولانا کا خادم، عبداللہ

مولانا نے ''غبار خاطر'' میں اپنے خادم، عبداللہ کا تذکرہ محبت سے کیا ہے۔ کلکتہ سے جب میں دہلی آیا، تو عبداللہ کو دیکھا۔ وہ بڑے لگاؤ سے ملا اور ہاتھ چومے۔ میں حیرت سے منہ دیکھنے لگا تو اس نے کہا ''آپ نے پہچانا نہیں۔ بالی گنج میں آپ دیکھتے ہوں گے مگر اس وقت میں بچہ تھا''

واقعی عبداللہ کو میں نے پہچانا نہیں لیکن معلوم ہوا کسی مرید کا لڑکا ہے اور یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ عبداللہ ہر طرف چھایا ہوا ہے اور مولانا کے سب کام اسی سے متعلق ہیں۔

ایک دن نہ جانے کس طرح بات چل پڑی کہ میں نے مولانا سے پوچھا کہ یہاں دہلی میں آپ کے باورچی خانے کا خرچ کیا ہے؟ جواب دیا، یہی بارہ تیرہ سو! عرض کیا اور کھانے والے کتنے ہیں؟ خود ادھر ایک مدت سے دوپہر کا کھانا چھوڑ چکے تھے۔ بس کھانے والے دو تین تھے۔ دعوتوں کا معاملہ الگ تھا اور اس رقم میں ان کا خرچ داخل نہ تھا۔ عرض کیا، گھی کہاں سے آتا ہے؟ فرمایا، گھی نہیں ڈالڈا آتا ہے۔ میں چیخ اٹھا، "مولانا، یہ تو اندھیر ہے۔ دو تین آدمیوں کا کھانا وہ بھی ڈالڈا میں اور یہ خرچ" فرمایا سب کچھ عبداللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے ٹوہ لی تو پتہ چلا کہ عبداللہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے۔ لوٹ کا اندازہ اسی سے کر لیجئے کہ روز ایک مرغی کی قیمت پانچ روپیہ وصول کرتا تھا، حالانکہ روز نہیں لاتا تھا اور ایک مرغی کی یخنی تین روز مولانا کو پلاتا تھا!

پھر معلوم ہوا کہ عبداللہ نے مولانا سے ملنے والوں پر بھی ٹیکس باندھ رکھا ہے۔ روپیہ لے کر اطلاع کرتا ہے، ورنہ غائب لیکن یہ واقعہ ہے کہ عبداللہ نے مجھ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ میری اطلاع فوراً کر دیتا تھا۔ ممکن ہے ڈرتا ہو کہ مولانا سے شکایت نہ کردوں اور میں رشوت کی شکایت کرنے ہی والا تھا کہ غریب بیمار پڑ گیا اور چٹ پٹ مر گیا۔

بالکل جوان پہاڑ تھا۔ میں نے تعزیت کی، تو دیکھا آنکھوں میں آنسو مل رہے ہیں یہ دوسرا موقع تھا کہ ان آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ پہلی دفعہ بیگم کی وفات پر دوسری دفعہ عبداللہ کی موت پر اور تیسری دفعہ ایک اور موقعہ پر، جس کا تذکرہ کروں گا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ عبداللہ نے ضلع گونڈہ میں جائیدار خرید رکھی تھی اور اس کا بینک بیلنس بھی بھاری نکلا۔

عبداللہ کے بارے میں یہ جو کچھ لکھا ہے سُنا ہوا ہے۔ ذاتی علم نہیں ہے۔ حقیقت خدا جانے۔

مولانا کی وضع قطع

بے شمار آدمی، مولانا کو دیکھ چکے ہیں، مگر ہمارے بعد ایسی نسلیں آئیں گی، جنھوں نے مولانا کو نہیں دیکھا اور وہ جاننا چاہیں گی کہ مولانا کس شکل وصورت کے آدمی تھے اور ان کی وضع قطع کیا تھی؟

مولانا نہایت سرخ و سفید آدمی تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ بے حد روشن۔ گول گول نہیں، نوکیلی، چہرہ بھرا ہوا، ناک بڑی، کھڑی، یونانی وضع کی۔ پیشانی کشادہ۔ سَر نہ بہت بڑا نہ بہت چھوٹا، بالکل متناسب، سینہ قدرے تنگ۔ ہاتھ لمبے پتلے چھوٹے ہوئے۔ انگلیاں پتلی پتلی لمبی لمبی۔ ہتھیلیاں ہلکی پھلکی۔ ہاتھ ایسے نازک کہ نسوانی ہاتھوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ کمر کے نیچے کا حصہ، یعنی کولھے بھاری تھے اور سینے کے مقابلہ میں زیادہ چوڑے۔ قد دراز مگر اعتدال کے ساتھ۔ اوپر کا دھڑ نیچے کے دھڑ سے چھوٹا۔ ٹانگیں لمبی لمبی۔ شاید لوگوں نے خیال نہیں کیا، ورنہ یہ واقعہ ہے کہ مولانا بیٹھے ہوتے تو یہ سوچنا مشکل تھا کہ اتنے لمبے ہوں گے، جتنے کھڑے ہونے پر دکھائی دیتے تھے۔ بیٹھے ہوئے وہ کسی لڑکے سے کچھ ہی بڑے معلوم پڑتے تھے۔ پاؤں کے پنجے اور انگلیاں خوبصورت نہ تھیں۔

حسین تھے۔ بارعب تھے۔ ہیئت کچھ ایسی تھی کہ ہزاروں کے مجمع میں بھی ممتاز و منفرد نظر آتے تھے۔ سب آدمیوں جیسے تو تھے، مگر سب سے الگ اور نمایاں آدمی معلوم ہوتے تھے۔ بڑی وزنی پرتاثیر شخصیت کے مالک تھے۔

نظر بندی سے پہلے کلین شیو رہتے تھے۔ چہرے پر بال کم تھے۔ اس لیے بے ریش سمجھے جاتے تھے۔ نظر بندی سے باہر آئے تو منہ پر داڑھی مونچھ تھی، مگر بجتی نہ تھی۔ داڑھی کچی تھی اور مونچھیں پتلی پتلی۔ پہلی وضع ہی موزوں تھی۔ میں نے بارہا یہ بات کہی، تو تردید نہیں کی۔ مسکرا کے رہ جاتے۔ سر کے بال بہت گھنے تھے۔ آخر عمر تک جھڑے نہیں تھے۔ انگریزی وضع کے رکھتے تھے۔

بال قبل از وقت سفید ہونے لگے تھے۔ اوائل عمر میں خوشبودار کریمیں اور سینٹ کے استعمال کا یہ نتیجہ تھا۔ خود فرمایا کرتے تھے، خوشبودار روغن کالے بالوں کا دشمن ہیں۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جب بالوں میں سفیدی رینگی تو ایک مدت تک سر اور چہرے کے ایک ہی طرف کے بال سفید رہے اور دوسری طرف کے سیاہ۔ مولانا کو اپنی اس حالت کا احساس تھا۔ کبھی کبھی ہنستے اور فرماتے ''چپ ہونا اسی کو کہتے ہیں''!

مولانا کو خوشبودار ہندوستانی تیلوں اور عطروں سے نفرت تھی۔ ایک دفعہ جیل میں تیل اور عطر کا تذکرہ نکل آیا اور میں نے دونوں سے اپنی سخت بیزاری ظاہر کی، تو فرمایا مولوی صاحب، میں خوش ہوا کہ آپ میرے ہم ذوق نکلے۔ میرے لیے بھی ہندوستانی تیلوں اور عطروں کی بو، از حد تکلیف دہ رہی ہے مگر لوگوں کے خیال سے بیزاری ظاہر نہیں کرتا!'' عرض کیا، مولانا، نہ جانے

آپ کیا کہیں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ مجھے فنائل، پٹرول، کول تار کی بو، بری نہیں لگتی! میرے کندھے پر ہاتھ مار کے فرمایا "بالکل یہی حال میرا بھی ہے!"

کسی زمانے میں مولانا سوٹ پہنتے تھے مگر میں جب سے ساتھ ہوا، تنگ موری کا پائجامہ، قمیص (کرتا نہیں) شیروانی پہنتے دیکھا۔ خاص خاص موقعوں پر جُبّہ بھی کندھوں پر ڈال لیتے تھے۔ میرے زمانے میں بھی ایک مدت تک اونچی دیوار کی سیاہ گول ٹوپی پہنا کرتے تھے پھر کلپاک استعمال کرنے لگے۔ مذہبی تقریبوں میں عمامہ بھی باندھتے تھے۔ نہایت جامہ زیب تھے۔ جے پوری گرگابی پسند تھی۔ شاذ و نادر شو پہنتے۔ بوٹ اور پمپ شو پہنے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

مولانا کا "حکم"

ملکی سیاست میں "انقلاب" آیا۔ انگریزی راج اُٹھ گیا۔ مولانا وزیر بن گئے۔ دہلی میں قیام ہوا اور میری آمد و رفت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ۱۹۴۹ء ختم ہو رہا تھا کہ مولانا کلکتہ تشریف لائے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرے اور مجھے یاد کیا۔ ہمیشہ کی طرح محبت اور بے تکلفی سے ملے، مگر زندہ دلی میں نمایاں کمی تھی، افسردگی کا سبب پوچھا۔ فرمایا "افکار نے گھیر رکھا ہے۔ میری پریشانیوں کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔" عرض کیا "مولانا، ملاقات کا مقام تو آپ کا گھر ہوتا تھا یا قید خانہ، یہ گورنمنٹ ہاؤس کیسا؟ سنجیدگی سے جواب دیا "اب ہمارے لیے نیا قید خانہ گورنمنٹ ہاؤس ہے!"

کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بغیر کسی تمہید کے فرمایا میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ درخواست نہیں، حکم دوں کہ دہلی چلے آؤ!" میں حیرت زدہ ہو کر ٹکر ٹکر منہ تکنے لگا۔ دل کا راز پا گئے کہنے لگے "مولوی صاحب، ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ آپ نے ۲۰ء میں مجھ سے ایک رشتہ جوڑا تھا۔ یاد ہے؟" عرض کیا، خوب یاد ہے۔ فرمایا "تو مجھے دہلی میں آپ کی ضرورت ہے" عرض کیا، حسنِ ظن کا شکریہ، مگر اپنے اخباری کاروبار کا کیا کروں؟ کہنے لگے لڑکے کے سپرد کر دیجئے۔ مولوی صاحب یاد رکھیے کہ لڑکا جب جوان ہو جائے تو اسے پاس نہیں دور رکھنا چاہیے، یا پھر کاروبار سپرد کر کے اسے خود مختار بنا دینا چاہیے، ورنہ بغاوت کر دے گا، یا اس کے ذہنی قویٰ دبتے دبتے مردہ ہو جائیں گے اور اس ٹریجڈی کی ذمہ داری، باپ پر ہوگی" عرض کیا لیکن اگر لڑکا ناتجربہ کار ہو؟ فرمایا "تجربہ کام کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ تو سوچیے کہ جب آپ پیدا ہوئے تھے، تو کیا اخبار کا کام جانتے تھے؟ بحث فضول ہے۔ سب کچھ لڑکے کو دے دو اور خود دہلی چلے آؤ!"

عرض کیا لیکن مولانا، آپ جانتے ہیں کہ میں کمیونزم کا حامی ہوں اور آپ کی حکومت کسی اور پالیسی کی قائل ہے۔ فرمایا ''اس سے کیا ہوتا ہے''؟ عرض کیا دہلی میں میرا کام کیا ہوگا؟ فرمایا ''وہیں بتاؤں گا'' عرض کیا، یہ تو ایمان بالغیب والی بات ہوئی! فرمایا ہاں ''اس وقت میں آپ سے ایمان بالغیب ہی چاہتا ہوں''!

میں لاجواب ہو کر راضی ہو گیا۔ فرمایا، تار دوں گا، چلے آنا اور میں تار پاتے ہی چل دیا۔ صرف ایک بکس اور بچھونا ساتھ تھا۔ مولانا کی کوٹھی میں اُترا۔ ابھی تک کچھ معلوم نہ تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ صبح ملاقات ہوئی۔ خوشی سے چہرہ کھل گیا۔ فرمانے لگے ''مولوی صاحب، اس بڑھاپے میں بھی آپ دل پھینک ہیں، آپ کی یہی ادا مجھے بہت پسند ہے کہ جب جی میں آیا دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تیس برس پہلے بھی آپ لکھنؤ سے کلکتہ اسی شانِ قلندری سے آئے تھے۔ ایک زمانہ میں میرا بھی یہی حال تھا مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب آتش جواں تھا عرض کیا ''مولانا، گستاخی معاف۔ میری عمر آپ سے کم نہیں ہے'' ہنسے اور کہنے لگے ''جی ہاں، مجھے معلوم ہے کہ آپ خواجہ خضر کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں! مگر اب کچھ کام کی باتیں ہوں''

ثقافت الہند

اب مولانا نے اپنی اسکیم ظاہر کی۔ فرمایا ''اسلامی دنیا عام طور پر اور عرب دنیا خاص طور پر ہندوستان سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ ہندوستان وحشی ملک ہے۔ یہاں کے لوگ پتھر کے ٹکڑے لیتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے چھیل چھال کے بت گڑھتے اور پھر خدا کہہ کر ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ اسلامی دنیا کو قدیم ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، فلسفہ، ادب، ادیان کی کچھ خبر نہیں، اسی قدر نہیں، وہ اس ملک میں اسلامی تاریخ اور اس کی اہمیت سے بھی قطعاً بے خبر ہیں۔

عرض کیا۔ قدیم ہی نہیں، موجودہ ہندوستان سے بھی ناواقفیت عام ہے۔ جب میں مصر میں پڑھتا تھا تو لوگ تعجب کے ساتھ سوال کیا کرتے تھے، کیا تمہارے ہندوستان میں بھی ہمارے نیل جیسا کوئی دریا ہے! اور ان کا خیال تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کی پیٹھ پر پاؤں رکھ کے گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں!

فرمایا، مختصر لفظوں میں تجویز یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ثقافتی مجلس قائم کی جائے اور بیرونی خصوصاً اسلامی دنیا سے ثقافتی رشتے جوڑے جائیں۔ مجلس کا فی الحال ایک سہ ماہی معیاری عربی

رسالہ جاری ہو اور قدیم اور موجودہ ہندوستان کو ایسے پیرائے میں پیش کیا جائے کہ وہ سمجھے اور احترام کرے مگر رسالے کو سیاست اور سیاسی پروپیگنڈے سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

یہ سن کر میری تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ سناٹے میں پڑ گیا۔ فرمایا، چپ کیوں ہو؟ عرض کیا، یہ جو کچھ آپ نے کہا ہے، میرے بس سے باہر ہے۔ مدتیں ہو گئیں کہ عربی کا ایک لفظ نہیں لکھا۔ بالکل بھول چکا ہوں۔ پھر قدیم ہندوستان کا بھی کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ ساری عمر سیاسیات میں گزری ہے۔ اب اس جنجال میں کیسے پھنسوں؟ بوڑھے طوطے بھی کہیں پڑھے ہیں!

ہنسے اور کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کلکتے سے یوں ہی آپ کو بھگا لایا ہوں؟ آپ یہ سب کر سکتے ہیں۔ کریں گے اور کریں گے۔ دو تین مہینے بہت ہیں۔ کتابیں مہیا کر دی جائیں گی۔ مطالعہ میں ڈوب جائیے۔ پھر ہم نپٹ لیں گے۔"

مولانا دلوں اور دماغوں کے "بیٹری" نکلے۔ واقعی تین مہینے کے اندر ہی میں نئے کام کے لیے فٹ ہو گیا۔ مسرت ظاہر کی، تو میں نے کہا، آپ کو ولی اللہ کہوں؟ فرمایا "جی نہیں لیکن اپنی مدح فرمانا ہو تو بخوشی سنوں گا"!

لطیفہ

میں وزیر کی کوٹھی میں مہمان تھا۔ کوٹھی آرائشوں سے آراستہ اور آسائشوں سے بھرپور مگر میں دیہقانی، دیہقانی ہی نہیں، اکھڑ پٹھان بھی۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ کوٹھی کی ہر آسائش کاٹنے کھاتی تھی۔ ہر آرائش آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ طبیعت اس زندگی کی نہ عادی تھی نہ اسے پسند کرتی تھی، مگر جھیل سکتا تھا لیکن ایک ایسی آفت کا بھی سامنا تھا، جسے جھیلنا ممکن نہ ہو سکا۔

یہ آفت تھی مولانا کے چپراسیوں کی۔ پڑھ رہا ہوں، لکھ رہا ہوں، سوچ رہا ہوں، لیٹ گیا ہوں مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد چپراسی صاحب کھڑے ہیں...... "کوئی حکم؟" عاجز آ کر مولانا سے عرض کیا کہ مجھے کوٹھی سے کہیں دور بہا دیجئے۔ تشویش کے لہجے میں فرمایا "کیوں، کوئی تکلیف ہے؟" عرض کیا، تکلیف؟ آپ کے چپراسیوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ کہنے لگے، کیا شکایت ہے؟ عرض کیا۔ ہر وقت موکلوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے پوچھ رہے ہیں، کوئی حکم؟

مسکرائے، عرض کیا، اجازت ہو تو کچھ کہوں؟ فرمایا ہاں ہاں آپ کو جیسے امیر حمزہ کی داستان یاد ہے! عرض کیا، کہتے ہیں کہ عامل کے قبضے میں جب موکل آ جاتے ہیں۔ تو اسے چین لینے نہیں

دیتے۔ ہر وقت کہتے رہتے ہیں کام بتاؤ اور ہر کام چشم زدن میں انجام دے کر پھر یہی رٹ لگائے رہتے ہیں۔ دن بھر تو عامل انھیں کسی نہ کسی طرح الجھائے رکھتا ہے مگر رات کو بھی سونے نہیں دیتے۔ اس پر عامل یہ کرتا ہے کہ آنگن میں بانس گاڑ دیتا ہے اور موکلوں سے کہتا ہے کہ صبح تک چڑھتے اترتے رہو۔ اس طرح عامل کو اطمینان سے سونے کا موقع مل جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ نہ میں عامل ہوں، نہ آپ کے چپراسی جنات۔ نجات کی صورت یہی ہے کہ اپنی کوٹھی سے دور کوئی کوٹھڑی، کوئی کمرہ دلا دیجئے، ورنہ یہاں گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاؤں گا!

خوب تفریح رہی۔ آخر چند روز بعد شیر شاہ میس میں میرے لیے انتظام ہو گیا۔

مصری سفیر

اب ''انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز'' قائم ہو گئی اور ''ثقافت الہند'' کے نام سے عربی رسالے کا اجرا طے پا گیا۔ مولانا نے فرمایا۔ عرب سفیروں سے ملو اور پہلے پرچے کے لیے ان کے پیغام حاصل کرو۔ خود ہی اسماعیل کامل بک سفیر مصر کا نام لیا کہ پہلے اسی سے ملو، سب سے زیادہ معمر اور بااثر ہے۔

لوگوں سے ملنا جلنا میرے لیے مصیبت ہے مگر تیار ہونا پڑا۔ سفیر سے فون پر وقت مقرر ہو گیا۔ اب میری غلطی یا سفیر کا لاأبالی پن کہ جب میں دولت خانے پر پہنچا تو رکھائی سے کہنے لگا، ایک گھنٹہ پہلے آ گئے ہو۔ واقعی نائٹ ڈریس میں تھا۔ میں نے کہا، تو اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے پہنچ گیا ہوں۔ تیس برس سے مصری قہوے کو ترس رہا ہوں۔ خوش ہو گیا۔ اسی لباس میں بیٹھ گیا۔ ادھر سے قہوے کے دور چلے اِدھر سے میری تعریفیں۔ خوشی سے پھول گیا۔

پھر ملاقات کا سبب پوچھا۔ ثقافت الہند کا تذکرہ سنا، تو بہت ہنسا اور کہنے لگا ''ہندیوں کو عربی سے کیا مناسبت؟ آخر جگ ہنسائی کی ضرورت؟'' عرض کیا، رسالہ عربی زبان و ادب کی خدمت کے لیے نہیں نکالا جا رہا اس کا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ عرب ملکوں کو قدیم اور موجودہ ہندوستان سے روشناس کیا جائے۔ رسالے کی زبان غیر فصیح سہی، مگر عربوں کی سمجھ میں آ ہی جائے گی۔

آدمی معقول تھا مگر قائل نہیں ہوا اور پیغام دینے سے انکار کر دیا لیکن جب رسالے کے ابتدائی فرمے اس کے پاس پہنچے، تو اپنی پہلی گفتگو کی معذرت کی اور بہت اچھا پیغام دے کر ہنستے ہوئے کہنے لگا ''تم نے مجھے دھوکا دیا۔ عربوں سے لکھواتے ہو اور تعریف اپنی چاہتے ہو'' پھر جب

حقیقت حال بتائی گئی تو بہت خوش ہوا۔ مولانا نے یہ واقعہ سنا تو فرمانے لگے "عرب بڑے مغرور ہوتے ہیں۔ جلد ہندوستان کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے"۔

آل انڈیا ریڈیو

"ثقافت الہند" کامیابی سے چل رہا تھا اور میرے تمام وقت پر چھایا ہوا تھا کہ عرب ممالک کے حالات نے پلٹ کھایا اور بین الاقوامی دنیا میں ان کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ ہندوستان، عرب ملکوں سے بے پرواہ نہیں رہ سکتا تھا، مگر عرب ملک ہندوستان سے حسن ظن نہیں رکھتے تھے۔ ضرورت تھی کہ غلط فہمیاں دور ہوں اور تفاہم کی راہیں کھلیں۔ یہی سوچ کر مولانا نے زور ڈالا کہ آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبے پر بھی وقت صرف کروں۔

حالت یہ تھی کہ عربی شعبے میں تمام کام کرنے والے عرب تھے: مصری، شامی، لبنانی، عراقی، سعودی، اردنی۔ یہ لوگ ہندوستان کی پالیسی سمجھتے تھے، نہ ہندوستان سے کوئی ہمدردی رکھتے تھے، بلکہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو ہندوستان سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص نے ہندوستان کے خلاف نہایت زہریلی کتاب لکھی مگر شروع کے ایک دو صفحوں میں پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی تعریف کر کے کتاب، پنڈت نہرو کے سامنے پیش کر دی کہ حکومت ہند اسے اپنے خرچ سے شائع کرے۔ پنڈت جی نے کتاب، مولانا کی خدمت میں بھیج دی اور مولانا نے مجھے حکم دیا کہ پڑھوں اور اپنی رائے لکھ دوں۔ پڑھنے پر کتاب کی حقیقت کھلی، مگر وہ عرب اس سے پہلے ہی رخصت لے کر ہندوستان سے جا چکا تھا۔

مولانا کا اصرار جاری رہا۔ میرا کوئی عذر بھی مقبول نہ ہوا اور بغیر کسی درخواست کے مجھے ایڈوائزر بنا دیا گیا۔ اسی زمانے میں شعبے کے عراقی سپروائزر نے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا اور جب منظور نہ ہوا تو یہ سمجھ کر اس کی جگہ لینے کی کسی میں صلاحیت نہیں، استعفا پیش کر دیا۔ اب مولانا پھر مصر ہوئے کہ یہ ذمہ داری بھی اُٹھالوں۔ میں نے جو شرطیں پیش کیں، قبول کر لی گئیں اور وسیع اختیارات کے ساتھ مجھے سپروائزر بھی بنا دیا گیا۔

اِس زمانے میں انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ کے محکمے بھی مولانا کی وزارت تعلیم سے تھے اور انتہائی مصروفیتوں کے باوجود میرے شعبے کے معاملات پر پوری توجہ سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ میری ایک تجویز یہ بھی تھی کہ عربی داں ہندوستانیوں کو ٹریننگ کے لیے مصر بھیجا جائے اور عربی شعبے

میں انہی سے کام لیا جائے۔ نیز مصری قاریوں کے بجائے ہندوستانی قاری تلاوت کریں۔ مولانا نے اس تجویز سے بھی اتفاق کیا اور گھٹتے گھٹتے شعبے میں صرف تین عرب رہ گئے۔ بہت سے ہندوستانی قاری بھی کھپ گئے اور شعبے نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ مولانا مطمئن ہو گئے۔

مولانا کے آنسو!

۵۴ء میں ایک دن دفعتاً معلوم ہوا کہ کینسر میں مبتلا ہوں اور مجھے بلا تاخیر بمبئی کے ٹاٹا میموریل ہاسپٹل سے رجوع کرنا چاہیے۔ مولانا نے سنا تو کیا بتاؤں ان کی کیا حالت ہو گئی۔ دیر تک چپ سناٹے میں رہے۔ انتہائی قلق بشرے سے عیاں تھا، مگر رخصت کرتے ہوئے بتکلف مسکرائے اور فرمایا ''عہدِ رفاقت یاد رکھیے گا!'' علاج کامیاب رہا۔ دو مہینے بعد واپسی ہوئی تو میں بہت کمزور تھا۔ آٹھ ہزار یونٹ ڈیپ اکس ریز، جسم میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس کا ناقابلِ بیان ردِ فعل جاری تھا۔ زبان کا ذائقہ سلب ہو چکا تھا۔ کھٹے میٹھے، نمکین کا احساس مٹ گیا تھا۔ کھانا پینا موقوف تھا اور فاقوں پر فاقے چل رہے تھے۔ مجھے دیکھا۔ زور سے ہاتھ دبایا ا ر آنکھیں ڈبڈبا آئیں یہ تیسرا موقعہ تھا کہ مولانا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے!

ایک سال بعد پھر تکلیف شروع ہوئی اور خیال کیا گیا کہ مرض لوٹ آیا ہے۔ بڑی تشویش کے ساتھ فوراً بمبئی چلے جانے کا حکم دیا۔ عرض کیا، یہاں کام بہت ہے اور وہاں ہاسپٹل میں معائنے اور علاج میں دیر لگاتے ہیں۔ فرمایا، آپ جائیے تو۔ بمبئی پہنچا، تو معلوم ہوا کہ چیف منسٹر کو میرے بارے میں پہلے سے اطلاع پہنچ چکی ہے۔ ہاسپٹل میں فوراً معائنہ ہو گیا۔ مرض باقی نہیں تھا۔ واپس آ کر حاضری دی اور یہ بھی عرض کیا کہ جو کوئی پوچھتا ہے کہ ڈاکٹر نے کیا کہا، تو کہہ دیتا ہوں ڈاکٹر نے کہا ہے ''اب علاج کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ زندگی چھ مہینے اور ہے!'' خلافِ معمول ہنس پڑے، مگر فوراً عجیب لہجے میں فرمایا ''مولوی صاحب، ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے!''

ایک تکرار

دہلی میں پہلی ہی ملاقات کے موقعہ پر مولانا نے فرمایا تھا ''مولوی صاحب، جانتا ہوں کہ آپ نے روپیہ پیسے سے گویا بیر باندھ رکھا ہے لیکن اب یہ نہیں چلے گی۔ آپ کو ہر ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا اور بینک میں جمع کرنا ہوگا۔ پاس بک مجھے برابر دکھاتے رہیے گا''

میں نے حامی تو بھرلی مگر جانتا تھا، میں کہاں اور یہ وبال کہاں لیکن مولانا بھول جانا تو جانتے ہی نہ تھے۔ جب ملاقات ہوتی، پاس بک طلب کرتے اور میں عرض کرتا، لانا بھول گیا ہوں۔ جب بار بار یہی ہوا، تو جھنجھلانے بھی لگے۔ فرماتے "آپ کی یہ بھول میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ کیوں نہیں کہتے پاس بک آپ کو ملی ہی نہیں!" عرض کرتا، مولانا، یقین فرمایئے کہ پاس بک میرے پاس موجود ہے۔ فرماتے "تو پھر یہاں تک آتی کیوں نہیں؟ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"! ایک دفعہ اسی کم بخت پاس بک کی وجہ سے خفا ہو گئے۔ منہ پھول گیا۔ بے اختیار میری زبان سے نکل گیا:

اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں!

ہنس پڑے اور فرمایا "مولوی صاحب، آپ کی بھلائی کے پیش نظر یہ سب کہتا ہوں۔ سوچیے تو، ایک دن تو ئی جواب دیے جائیں گے۔ اس وقت کیا دوسروں کے دست نگر بننے کی ذلت گوارا کرلیں گے؟ لیکن یہ تو کہیے شعروشاعری سے دلچسپی کب سے شروع ہوگئی۔ میرے علم میں تو آپ ایک مصرعہ بھی موزوں پڑھ نہیں سکتے تھے" عرض کیا "بحمد اللہ اب بھی وہی حال ہے دراصل مجھے یقین تھا کہ یہ ناہنجار پاس بک کسی دن رنگ لائے گی اور آپ کا عتاب نازل ہوگا۔ میں لاجواب ہوں گا۔ کوئی عذر پیش نہ کرسکوں گا۔ سوچا، چلو غالب سے مشورہ کریں۔ شاید مخلصی کی کوئی صورت ان کے پاس ہو۔ دیوان کھولا تو اس مصرعے پر نگاہ ٹھہر گئی"! مسکرائے اور فرمایا: "مولوی صاحب، آپ کتنے ہی باتونی ہوں، مگر مجھے جل نہ سکیں گے۔ آپ کو پاس بک لانا ہوگی، ورنہ چپراسی نازل ہو جائے گا اور پاس بک آپ سے اگلوا لائے گا!" آخر تک یہ تکرار چلتی رہی۔

علم وادب کی سرپرستی

مولانا، اہل علم کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محلی کلکتہ میں مولانا سے ملنے آگئے، تو مولانا ان سے ایسے احترام سے پیش آئے کہ صرف مجھے نہیں، خود فرنگی محلی مولانا کو بھی تعجب ہوا اور انہوں نے منفعل ہو کر کہا۔ میں اس قدر عزت کا مستحق نہیں ہوں۔ اس پر مولانا نے فرمایا آپ کا خاندان علم کا مرکز رہا ہے اور میرا دل اس خاندان کے لیے عزت واحترام سے معمور ہے! پھر مولانا، بحرالعلوم اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم کے کمالات کا تذکرہ کرتے رہے۔

وزارت کے زمانے میں مولانا کو ایک یہ فکر بھی پریشان رکھتی تھی کہ اہل علم وادب کی معیشت کا کوئی ایسا سامان ہو جائے کہ وہ مالی مشکلات سے نجات پا کر اپنے اپنے میدانوں میں

بڑھتے رہیں۔ بہت لوگوں کے سرکاری وظیفے مقرر ہو چکے تھے، مگر مولانا اسے کافی نہیں سمجھتے تھے۔ان کے سامنے ایک ایسی مفصل اسکیم آ چکی تھی کہ اہل علم وادب ہر طرح مطمئن و بے فکر ہو جاتے مگر افسوس......!

وقت ملاقات

آخری ایام تھے۔ایک دن ملاقات کے لیے حاضر ہوا، تو نہ جانے کیوں خلاف دستور سیکریٹری صاحب سوال کر بیٹھے ''آپ ملاقات کا وقت مقرر کرا چکے ہیں؟'' عرض کیا، نہیں لیکن ایک سلپ عنایت کیجئے۔سلپ پر میں نے لکھ دیا:

منحصر وقت مقرر پہ ملاقات ہوئی
آج یہ آپ کی جانب سے نئی بات ہوئی!

سلپ گئی اور فوراً طلبی ہوئی۔فرمایا، آپ جس وقت چاہیں، آئیں۔وقت مقرر کرنے کی نہ پہلے کبھی ضرورت ہوئی نہ اب ہے بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ جلد جلد ملیں اور زیادہ سے زیادہ دیر تک میرے پاس رہیں، مگر آپ کی مصروفیتوں کی وجہ سے کبھی کہا نہیں،

عرض کیا، آپ کی مصروفیتیں مجھ سے کہیں زیادہ ہیں۔پھر یہ خوف بھی ہے کہ بار بار حاضری دوں گا، تو لوگ کہیں گے، وزیر کی چاپلوسی میں لگا ہوا ہے لیکن ایک خیال مدت سے ذہن میں ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ ہفتہ میں دو تین گھنٹے آپ مجھے دیں۔موضوع کی قید نہیں۔آپ جس قسم کی گفتگو چاہیں کریں اور میں لکھتا جاؤں۔اس طرح تھوڑے دنوں میں ایک دلچسپ کتاب بغیر محنت کے تیار ہو جائے گی۔

مولانا نے تجویز پسند کی، مگر عمل کی مہلت ہی نہ ملی۔

مولانا اور فنون لطیفہ

مولانا کو علم وادب کے ساتھ فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی، فن مصوری سے تو خاص لگاؤ تھا۔آرٹ کے اعلیٰ نمونے پرکھنے اور مصوری کی باریکیاں سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔بعض قدیم تصویروں کی ان حل گتھیاں مولانا نے جس آسانی اور وضاحت کے ساتھ سلجھا دیں، اس پر حیرت ہوتی ہے۔

"ثقافة الهند" میں قدیم آرٹ کی بعض نادر تصویریں بھی شائع کی گئیں اور ان پر مولانا کے نوٹ پڑھنے کے لائق ہیں۔ یہ نوٹ خود مولانا نے اردو میں لکھ کر مجھے دیئے اور ان کا ترجمہ "ثقافة الهند" میں شائع ہوا۔ اب مولانا کے قلم سے لکھے ہوئے اردو نوٹ ملاحظہ کیجئے اور مولانا کی بصیرت کی داد دیجئے۔

بابر کی مسکراہٹ

یہ تصویر ایک گروپ کے مرقع سے لی گئی ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ تصویر مرزا عبدالصمد شیریں رقم کے کمال فن کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ عبدالصمد کو ہندوستان کے عہد مغلیہ کی مصوری کے ابتدائی معلموں میں تصور کرنا چاہیے۔ اسے سلطان ہمایوں، ایران سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔

"مرقع کپڑے پر بنایا گیا ہے اور اس میں تیمور سے لے کر اکبر تک تمام سلاطین تیموریہ کو ایک مجلس میں مجتمع کر دیا گیا ہے۔ بابر، ہمایوں سے کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے، جس کی وجہ سے ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمایاں ہوگئی ہے۔ اس مسکراہٹ کو جس فطری طریقے سے مصور نے دکھایا ہے، وہ اس کے کمال فن پر دلالت کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے تمام ماہرین مصوری نے اس تصویر کی خوبی پر اتفاق کیا ہے۔[۲۸]"

شہنشاہ جہانگیر

مغل عہد کے فن مصوری کا یہ ایک نہایت شاندار نمونہ ہے۔ اس میں جہانگیر کو حالت سفر میں دکھایا گیا ہے۔ سامنے اس کے والد، شہنشاہ اکبر کا مقبرہ ہے اور وہ گھوڑے پر سوار اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہے۔ اس کے جلو میں اعیان و امراء ہیں اور عقب میں ایک فوجی دستہ ہے۔ اس کے سامنے ایک نوجوان سرنگے عجز وانکسار کی حالت میں کھڑا ہے اور نوجوان کے پیچھے ایک شخص ایسی ہیئت میں نمایاں ہے گویا وہ نوجوان کو بہ حیثیت مجرم اور قیدی کے پیش کر رہا ہو۔ مرقع میں جن جن آدمیوں کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، سب حقیقی ہیں، یعنی جو آدمی اس موقع پر جس وضع ولباس میں موجود تھے، انھیں اسی طرح مصور نے نمایاں کیا ہے۔

اکبر کا مقبرہ آگرہ سے چھیس میل کے فاصلے پر قریہ اسکندرہ میں واقع ہے۔ پس یہ تصویر کسی ایسے موقع کی ہے جب جہانگیر آگرہ سے نکل کر اکبر کے مقبرے پر پہنچا تھا۔

لیکن یہ موقع کون سا تھا؟ جہانگیر نے اپنی تزک، یعنی یومیات میں دو موقعوں کا ذکر کیا ہے، جب وہ اپنے والد کی قبر کی زیارت کے لیے گیا تھا لیکن ان دونوں موقعوں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں بیان کیا ہے، جب کوئی مجرم اس کے آگے پیش کیا گیا ہو۔ پہلی مرتبہ وہ جوشِ محبت میں پیدل گیا تھا، اس لیے اسے گھوڑے پر سوار ہونے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ دوسری مرتبہ بلاشبہ سوار گیا تھا لیکن مقبرے کی عمارت کے معائنے کے لیے گیا تھا۔ وہاں اور کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

یہ تصویر گزشتہ اسی برس کے اندر مختلف مصور کتابوں اور البموں میں شائع ہو چکی ہے لیکن ابھی تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ مصور کس موقعہ کو نمایاں کر رہا ہے اور تصویر کا مطلب کیا ہے؟ تصویر کی اصلی کاپی برٹش میوزیم میں ہے۔

حال میں (مولانا) ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک مضمون میں اس تصویر کا معمہ حل کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس تصویر کا مطلب حل کرنے میں دقت اس لیے پیش آئی کہ فرض کر لیا گیا، جہانگیر جب اکبر کے مقبرے کی زیارت کے لیے گیا ہے، اس وقت کا منظر اس میں دکھایا گیا ہے اور چونکہ وہ زیارت کے لیے صرف دو مرتبہ گیا ہے اور دونوں موقعوں پر کسی مجرم کی گرفتاری کا واقعہ پیش نہیں آیا ہے، اس لیے تصویر معمہ بن کر رہ گئی ہے اور اس کا مطلب حل نہیں ہوا۔ دراصل اس تصویر کا تعلق اس موقع سے ہے جب جہانگیر کی تخت نشینی کے پہلے سال اس کا لڑکا خسرو بقصد بغاوت قلعہ آگرہ سے نکل کر پنجاب کی طرف بھاگا ہے اور جہانگیر اس کے تعاقب میں نکلا ہے۔

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے:

ذوالحجہ یک شنبہ کی رات خسرو قلعہ سے نکلا اور تین سو پچاس سواروں کے ساتھ جنھیں اس نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا، کسی جانب روانہ ہو گیا۔ پہلے میں نے شیخ فرید بخشی بیگی کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا، پھر صبح کے وقت متوکلاً علی اللہ بغیر کسی خاص سرو سامان کے خود بھی روانہ ہو گیا جب میں سکندرہ پہنچا، تو میں نے چاہا کہ والد بزرگوار کی روحانیت سے استمداد چاہوں چنانچہ ان کے روضۂ منورہ پر حاضر ہوا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ مرزا حسن پسر میرزا شاہ رخ کو پکڑے ہوئے قریہ سکندرہ سے لائے اور عرض کیا کہ یہ بھی خسرو کی ہمراہی کا فیصلہ کر چکا تھا اور اس کے پیچھے روانہ ہونے والا تھا۔ جب یہ بات ہمیں معلوم ہوئی تو ہم نے اسے روک لیا۔ میں نے مرزا حسن سے پرسش کی، تو وہ انکار کی جرأت نہ کر سکا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ باندھ کر اسے ایک ہاتھی پر سوار کیا جائے۔

جہانگیر کی اس تصریح نے اس تصویر کا پورا مطلب حل کر دیا۔ مصور نے اس موقع کی تصویر کھینچی ہے جب جہانگیر اکبر کے مقبرے کے سامنے پہنچا ہے اور کچھ لوگ مرزا حسن کو پکڑے ہوئے لائے ہیں۔ جہانگیر نے گھوڑے کی لگام روک لی اور صورت حال دریافت کی۔ مرزا حسن سر جھکائے کھڑا ہے، اور اس کو گرفتار کرنے والا اس کے پیچھے ہے۔ مرزا حسن کی حالت بتلا رہی ہے کہ اسے بے خبری کی حالت میں اچانک گرفتار کیا ہے۔ سَر برہنہ ہے، گویا اس کی بھی مہلت نہ ملی کہ سر پر پگڑی رکھ لیتا۔

جہانگیر نے لکھا ہے کہ میں نے حکم دیا کہ اسے دست بستہ ہاتھی پر سوار کیا جائے چنانچہ ایک ہاتھی لایا گیا اور وہ سامنے کھڑا ہے۔

تصویر کی جزئیات کو جس درجہ نظر انتقاد سے دیکھا جائے، اس کی خوبیاں پوری طرح آشکار ہیں۔ باکمال مصور نے موقعہ اور محل کی ہر بات ملحوظ رکھی ہے اور اسے پوری صحت و دیانت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ تصویر پر مصور کا نام نہیں ہے لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ یہ جہانگیر کے خاص مصور، میرزا ابوالحسن کے قلم سے نکلی ہے، جسے جہانگیر نے نادرۃ الزماں کا خطاب دیا تھا۔

جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ جب بارہ سال کے واقعات قلم بند ہو گئے، تو میں نے حکم دیا کہ انھیں ایک جلد کی صورت دے دی جائے اور مصوروں سے کہا گیا کہ اس کے اہم واقعات کی تصویریں تیار کر کے اس میں جا بجا لگا دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر بھی دراصل تزک جہانگیری کے کسی شاہی نسخے کا جز تھی، جو اصل سے الگ ہو کر منتشر ہو گئی[۲۹]۔

شاہجہاں کا دربار

''آج ہم ہندوستان کے قدیم فن مصوری کا ایک اور شاندار نمونہ شائع کرتے ہیں۔ اس میں مصور نے شاہجہان کے اس دربار کی تصویر کھینچی ہے، جو ایرانی سفارت کے پیش ہونے کے موقع پر منعقد ہوا تھا''۔

شاہجہاں تخت پر متمکن ہے۔ اس کے سامنے اس کے دولڑکے دارا شکوہ اور مُراد کھڑے ہیں اور ان کے پیچھے ان کا اتالیق کھڑا ہے۔ نیچے دونوں طرف ارکان دولت کی بالمقابل صفیں کھڑی ہیں۔ بائیں جانب ایرانی سفیر کھڑا ہے اور ہاتھ سر تک اُٹھائے سلام کر رہا ہے۔ بائیں جانب کی صف کے پیچھے ایرانی سفارت کے دوسرے ارکان طرح طرح کے تحفے ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں۔

سامنے درباری کٹہرے کے باہر دو گھوڑے نمایاں ہیں، جو ایرانی سفارت عراق کے تحائف میں لائی تھی"۔ جو بات قابل غور ہے، وہ تصویر کی جزئیات و دقائق ہیں، جنھیں مصور نے پوری نگرانی کے ساتھ نمایاں کیا ہے، حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے، اشخاص کی وضع قطع اور لباس کی کوئی جزئی سے جزئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جو پوری صحت اور واقعیت کے ساتھ مصور کے قلم نے نمایاں نہ کر دی ہو۔ اشخاص کے سروں پر عمامے ایک وضع اور ایک قسم کے کپڑے کے نہیں ہیں لیکن ہر عمامے کی خاص نوعیت اور کپڑے کی ساخت پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس کا پورا اندازہ سرسری نگاہ سے نہیں ہو سکتا۔ خردبین گلاس سے دیکھا جائے تو مصور کے قلم کا حیرت انگیز کمال نمایاں ہو۔ جن عماموں پر موتیوں کی لڑی بندھی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ایک موتی کو نمایاں کیا ہے۔

تختِ شاہی کے نیچے سنگ مرمر کی جو کرسی ہے، اس کی سطح پر چند تصویریں سنگ ساز نے کھودی تھیں۔ اوپر ایک ترازو کی تصویر تھی، جو میزان عدل کے قیام کا اظہار کرتی تھی۔ ترازو کے نیچے دو بزرگ انسان آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ایک کرہ۔ ان کے نیچے دریا ہے اور دریا کے کنارے ایک شیر اور گائے مِل جُل کر پانی پی رہے ہیں۔ یہ تصویر حکومت کے کمال عدل اور امن کی مرموز علامت ہے، یعنی شیر کو جرأت نہ رہی کہ گائے پر حملہ کرے اور گائے کو شیر سے ڈر نہ رہا کہ اس کے سائے سے بھاگے۔

مصور نے کس خوبی سے ان تصاویر کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ چونکہ یہ سنگ مرمر کی سطح پر کندہ تھیں، اس لیے انہیں نسبتاً مدھم رنگ سے کھینچا گیا ہے، تاکہ صاف نظر آ جائے کہ کندہ تصویر کی یہ تصویر ہے۔[۴۳]

مولانا اور فلسفہ

مولانا کی شخصیت، جامع کمالات تھی۔ دوسری حیثیتوں کے علاوہ وہ فلسفی بھی تھے اور فلسفے میں انہماک رکھتے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے حکومت ہند کی جانب سے ایک بورڈ مصنفوں کا بٹھایا تھا تاکہ انگریزی میں ایک نئی تاریخ فلسفہ ایسی لکھی جائے جس میں مغربی فلسفے کے ساتھ مشرقی فلسفے کو بھی اس کی واجبی جگہ دی جائے اور جب کتاب تیار ہو گئی تو مولانا نے اس پر مقدمہ لکھا اور مقدمہ کا عربی ترجمہ، میں نے ثقافت الہند میں چھاپا۔ اردو میں لکھا ہوا مولانا کا مقدمہ میرے

پاس موجود ہے۔اس میں فلسفے کی جو تعریف کی ہے، قابل دید ہے۔صحیفہ کائنات کے دوگم شدہ ورق اوران کی جستجو کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

ایک فارسی شاعر نے کائنات کو ایسی پرانی کتاب سے تشبیہ دی ہے جس کا پہلا اور آخری ورق کھو گیا ہے۔اب نہ تو یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ یہ کتاب شروع کس طرح ہوئی تھی، نہ یہ کہ ختم کس طرح ہوگی:

از آغاز و انجام جہاں بے خبریم
اول وآخر ایں کہنہ کتاب افتاد ست!

انسان نے جب سے ہوش وخرد کی آنکھیں کھولی ہیں، وہ اس جستجو میں ہے کہ ان کھوئے ہوئے اوراق کا سراغ لگائے۔فلسفہ اسی جستجو اور جستجو کے نتائج کا نام ہے۔ایک فلسفی، فلسفہ کی تعریف کرتا ہوا جو حقیقت کئی صفحوں پر بیان کرتا وہ اس شاعر نے ایک مصرعہ کے اندر سمیٹ دی ہے۔

ان کھوئے ہوئے اوراق کی جستجو سے مقصود درحقیقت زندگی اور کائنات کی حقیقت کی جستجو ہے۔انسانی دماغ نے جوں ہی سوچنا شروع کیا، یہ دوسوال خود بخود اس کے اندر اُٹھنے لگے: اس کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اسے اپنے چاروں طرف جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ نہیں معلوم کتنے عرصے تک اس کا دماغ اس جستجو میں ہر طرف بھٹکتا رہا۔بالآخر ایک وقت آیا، جب اس کے قدم نے جستجو کی راہیں معین کر لیں اور ایک نظم وترتیب کے ساتھ غور وفکر کی کڑیاں جوڑتا ہوا قدم اُٹھانے لگا۔یہ منظم نظر وفکر (سسٹیمیٹک اسپیکیولیشن) کی ابتدا تھی جس دن وہ اس منزل پر پہنچا، وہی دن فلسفے کی پیدائش کا پہلا دن تھا اور اسی دن سے فلسفہ کی تاریخ کی داستان شروع ہوتی ہے۔

آخری ایام

آخر تک وہی سج دھج تھی، وہی آن بان، وہی رکھ رکھاؤ، وہی نپے تلے انداز وہی مقرر طریقے لیکن چہرے پر فکروں کی ایک گھٹا سی چھائی دکھائی دیتی۔مسکراتو دیتے تھے، مگر بشاشت اور زندہ دلی میں بڑی کمی آگئی تھی۔میرا ماتھا ٹھنکتا اور ڈرتے ڈرتے عرض کرتا، مولانا، آخر یہ کیا حالت ہے؟ کچھ تو بتائیے کیا پریشانی ہے؟ سنجیدگی وافسردگی سے جواب دیتے ''کیا بتاؤں''؟

ملاقات کا بہترین وقت، صبح تڑکے ہوتا، یا ڈھائی تین بجے بعد دوپہر۔ میں زیادہ تر صبح ہی جاتا۔ آخری دنوں کی ہر ملاقات دل میں چٹکیاں لیتی اور ذہن پر بوجھ سا بن جاتی۔

دن گزرتے گئے۔ ۱۴ فروری ۱۹۵۸ء کو انڈین کونسل کا اجلاس ہوا۔ شاندار اجلاس تھا۔ گزرگاہ کے قریب میری کرسی تھی۔ مولانا کونسل کے صدر تھے۔ ڈائس پر سے مجھے دیکھ لیا۔ انگریزی میں چھپا ہوا خطبہ تقسیم ہو چکا تھا، مگر مولانا نے حسب عادت اردو میں زبانی تقریر ارشاد فرمائی۔ اجلاس کے بعد جانے لگے، تو سب کی طرح میں بھی کھڑا تھا۔ سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا، تو خفیف سی مسکراہٹ نے ہونٹ چومے اور بالکل پرانی وضع سے آنکھ کا اشارہ مارا۔ آج تک اس اشارے کا مطلب سمجھ میں نہ آیا، حالانکہ ان کے سبھی اشارے ہمیشہ سمجھ لیا کرتا تھا۔

ثقافت الہند کی خدمات

قدرتی طور پر مولانا کو اپنی صدارتی تقریر میں ثقافت الہند کا تذکرہ کرنا ہی تھا۔ پہلے انہوں نے بتایا کہ ملکی تقسیم اور فرقہ وارانہ خونریزی کی وجہ سے اسلامی ملک ہندوستان کے بارے میں کیسی کیسی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے تھے حتیٰ کہ ۱۹۴۹ء میں جب مرحوم سید حسین، مصر میں ہندوستان کے پہلے سفیر بن کر گئے، تو اخباروں نے یقین نہیں کیا اور لکھا کہ وہ پاکستان کے پہلے سفیر ہیں! لیکن انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے قیام اور ''ثقافت الہند'' کی اشاعت کے بعد اسلامی ملکوں کے تعصبات اور غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

مولانا نے فرمایا:

کونسل نے اپنا سہ ماہی رسالہ ''ثقافت الہند'' جاری کیا اور رسالے کے مضامین نے مسلم دنیا پر برقی لہروں کا سا اثر پیدا کیا۔ مسلم دنیا، ہندوستان کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگی۔ مصر، عراق، سیریا اور ایران کے پرچوں اور رسالوں نے اس رسالے کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی اور اس کے مضامین نقل یا ترجمہ کر لیے۔ ان ملکوں کے نامور اہل قلم اور مصنفوں نے رسالے کو اور اس کی خدمات کو سراہا۔ رسالے کے بعض مضامین تو اس قدر مقبول ہوئے کہ عراق کی ایک سوسائٹی نے انھیں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ایران میں بھی یہ مضامین فارسی میں ترجمہ ہوئے اور کتاب کی شکل میں چھاپے گئے۔ انگلینڈ، فرانس اور اٹلی کے مشہور مستشرقوں نے رسالے کے بعض مضامین کا اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا۔

خدا حافظ

اجلاس کے بعد حاضری دی اور عرض کیا، ثقافت الہند کے لیے آپ کے کلماتِ شکریہ ادا کرنا کیا میرے لیے ضروری ہے؟ جواب نہیں دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، مگر بجھے بجھے تھے۔ شگفتہ نہ ہوئے۔ رخصت ہونا چاہا، تو فرمایا "اچھا خدا حافظ" حالانکہ پہلے کبھی اس طرح رخصت نہیں کیا تھا۔ دل میں کھٹک تو پیدا ہوئی، مگر میں تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ مولانا مر بھی سکتے ہیں نادانی سہی مگر خدا شاہد ہے ایسے حادثے کا گمان ہی نہیں ہوا۔ ہاں یہ ڈر ضرور رہتا تھا کہ بیمار نہ ہو جائیں۔ گر نہ پڑیں۔

گرے تو وہ کئی دفعہ۔ الہ آباد اسٹیشن پر ایک دفعہ۔ کلکتہ میں دو تین دفعہ۔ خود دہلی میں بھی اپنی کوٹھی میں گرے تھے۔ ہوا یہ کہ نئے نئے آئے تھے اور کوٹھی کی اونچ نیچ سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ رات کو کوئی نو بجے چاہا کہ اُتر کر چمن میں جائیں۔ چمن کی طرف ان کے خاص کمرے میں زینہ موجود نہ تھا۔ پاؤں نیچے بڑھاتے ہی گر پڑے اور بڑی چوٹ آئی۔ اسی وقت ہم انہیں ورِیا گنج کے ایک علاج خانے میں اُٹھا لے گئے۔ رات بھر وہاں رہے۔ صبح ہاسپٹل میں معائنہ ہوا اور گھر لوٹ آئے۔ چوٹ کا علاج چوٹ سے زیادہ دردناک ہوتا ہے مگر مولانا نے بڑے جیوٹ سے تکلیفیں برداشت کیں اور اُف تک نہ کی۔

مولانا کے بار بار گر پڑنے کا سبب یہ تھا کہ ورزش سے بے نیازی نے اوپر کا دھڑ بھاری کر دیا تھا اور ٹانگیں لاغر ہو کر بوجھ سنبھالنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ بارہا ضد کی گئی کہ چلیں پھریں مگر دو چار دن کے بعد پھر بیٹھ جاتے۔ ہنستے اور کہتے "مولوی صاحب، آدمی کو اتنا بھی مجتی نہیں ہونا چاہیے!" آخر دنیا سے رخصتی بھی گر پڑنے ہی سے ہوئی۔

۱۵ فروری کو جامع مسجد (دہلی) کے میدان میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ پنڈت نہرو نے افتتاح کیا۔ مولانا بھی تشریف لائے تھے، میں دور مجمع عام میں بیٹھا تھا۔ وضع یہ نہیں تھی کہ مولانا کے ساتھ لگا لگا پھروں اور یہی وضع مولانا کو پسند تھی۔

اس کانفرنس میں مولانا کی تقریر، آخری تقریر ثابت ہوئی۔ پنڈت نہرو جب تقریر کر رہے تھے، تو مولانا کے کندھوں میں جنبش ہو رہی تھی اور میں ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دوست سے کہہ رہا تھا کہ دیکھیے بے چینی۔ خود تقریر کے لیے پر تول رہے ہیں۔ معلوم نہ تھا کہ جنت میں جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔

بے ہوشی

۱۹ فروری ۱۹۵۸ء کی صبح غسل خانے تشریف لے گئے۔ ناگاہ فالج کا حملہ ہوا اور وہیں گر گئے، مگر مجھے خبر نہ تھی۔ رات کو سیکریٹری صاحب نے فون پر اطلاع دی اور یہ بھی کہا کہ بے ہوش ہیں۔ فوراً کوٹھی پہنچا۔ ہر چند اصرار کیا گیا کہ چل کر دیکھ لو، مگر میں مولانا کو اس حال میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

بیماری کی مکمل تفصیلات، اخباروں میں آ چکی ہیں۔ مجھے کچھ لکھنا نہیں لیکن یہ بات غلط مشہور ہوگئی ہے کہ ہوش بھی آ گیا تھا۔ بولے بھی تھے اور پنڈت جی کو خدا حافظ کہا تھا۔ گرنے کے بعد ہوش آیا ہی نہیں۔ کبھی کبھی کراہتے تو تھے، مگر بولے قطعاً نہیں۔ یہ میں نے ان کے خادم خاص سے سنا ہے!

میرے لیے بڑی مشکل تھی۔ ریڈیو کے عربی پروگرام کی فکر تھی۔ مولانا کے بارے میں پورے ایک ہفتہ کا پروگرام ٹھیک رکھنا تھا۔ اب کبھی مولانا کی کوٹھی پر ہوں، کبھی ریڈیو آفس میں، کبھی اپنے گھر پر، کوٹھی کا فون اس قدر مشغول تھا کہ میں اس سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا۔ اور مجبوراً اپنی قیام گاہ جانا پڑتا تھا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ اس جاڑے میں بھی رات بھر پسینوں پر پسینے چھوٹنے لگے۔ کئی کئی دفعہ کپڑے بدلتا مگر تر ہو جاتے۔ آخری رات بہت دیر تک کوٹھی پر رہا اور جب ڈاکٹر بدھان چندر رائے نے معائنے کے بعد بتایا کہ حالت قابل اطمینان ہے، تو میں ریڈیو کو ہدایات دینے کے لیے اپنی قیام گاہ واپس آیا۔ ابھی تک یقین تھا کہ سب خیریت رہے گی، مگر ریڈیو میں تاکید کر دی کہ کوئی خبر ملے تو اطلاع دینا۔

سوا دو بجے ریڈیو سے فون آیا کہ ان ہونی ہوگئی! سکتے میں پڑ گیا، پسینے سے شرابور کوٹھی پہنچا۔ خود کوٹھی رو رہی تھی۔ لوگ کمرے میں زبردستی گھسیٹ لے گئے۔ آخری دیدار تھا۔ پلنگ پر چپ بے خبر "سو رہے" تھے۔ دل پکار اٹھا............ "مولانا!" وہاں جواب کہاں؟ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پرچھائیں پھیلی ہوئی تھی۔ افسوس!......

کوئی نالاں، کوئی گریاں، کوئی بسمل ہو گیا
اس کے اُٹھتے ہی دگرگوں رنگِ محفل ہو گیا

(مولانا آزادؔ)

دوست کہتے ہیں، کب تک روؤ گے؟ مگر دوستو!

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

مولانا چلے گئے، تو دہلی میں میرا رہنا بھی بے معنی ہو گیا اور میں سب کچھ چھوڑ کر نکل بھاگا:

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید؟
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو!

مولانا کا مزار

دہلی میں مولانا کی قبر پر جو کچھ ہوتے دیکھا ہے، اس سے تکلیف بھی ہے اور اندیشہ بھی کہ لوگ کہیں مولانا کی قبر کو بھی ''مزار'' اور بدعات و خرافات کا مرکز نہ بنا دیں۔ چڑھاوے چڑھانے لگیں۔ نذریں گزارنے لگیں۔ منتیں ماننے لگیں۔ عرس کرنے لگیں۔ طبلے کی تھاپ پر قوالیاں ہونے لگیں۔

مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا کو زندگی میں بڑے بڑے دُکھ جھیلنا پڑے۔ اب مولانا ہم میں موجود نہیں ہیں اور خدا مسلمانوں کو معاف نہیں کرے گا اگر قبر پر بدعتیں جاری کر کے مولانا کی روح پر ظلم و ستم ڈھایا گیا۔ مولانا، عمر بھر قبر پرستی اور متعلقہ بدعات کے سخت مخالف رہے، لہٰذا ان کی قبر کو ان اعمالِ سیّئہ سے بچانا چاہیے۔

نجدیوں نے جب حجاز پر قبضہ کیا۔ قبروں پر کی عمارتیں ڈھا دیں اور بدعتی اعمال سے لوگوں کو روکا تو ہندوستان کے قبوری مسلمانوں نے بڑا واویلا مچایا تھا۔ فرنگی محل (لکھنؤ) اس ہیجان کی قیادت کر رہا تھا۔ اس بارے میں مرحوم و مغفور مولانا عبدالباری اور مدرسہ فرنگی محل کے پرنسپل نے قبروں پر کی عمارتوں اور بدعتوں کی تائید میں مضامین لکھے تھے۔ مولانا آزاد نے ان حضرات کی تردید میں تیز و تند مضامین تحریر کیے اور وہ اخباروں میں میرے نام سے شائع ہوئے۔ میں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ کسی کی تحریر اپنی طرف منسوب کروں۔ اس موقع پر بھی سخت انکار کیا، مگر مولانا کے سامنے میری کچھ نہ چلی اور اس شرط سے میں راضی ہو گیا کہ جو کوئی ان مضامین کا تذکرہ کرے گا، اس سے کہہ دوں گا کہ مضامین میرے نہیں، مولانا کے ہیں۔ مضامین چھپ رہے تھے کہ کانپور میں کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے اجلاس ہوئے اور سب کو معلوم ہو گیا کہ مضامین کا مصنف کون ہے۔

یہ سلسلہ مضامین میرے پاس محفوظ نہیں رہا لیکن خوش قسمتی سے ایک مضمون کا بڑا حصہ خود مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذوں میں مل گیا ہے۔ اسے یہاں نقل کرتا ہوں۔ مسلمان غور کریں کہ قبروں سے متعلق بدعات کو مولانا کس نظر نفرت سے دیکھتے تھے۔

فتنہ قبور پر مولانا کا مضمون

مولانا لکھتے ہیں:

حقیقت حال یہ ہے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا، تو دنیا شرک اور بُت پرستی میں غرق تھی اور من جملہ اقسام شرک کے، ایک بڑی مہلک قسم یہ تھی کہ بزرگ اور مقدس انسانوں کی محبت و احترام کے غلط استعمال کی وجہ سے لوگوں نے ان کی اور ان کے آثار کی پرستش شروع کردی تھی۔ کتنی ہی قوموں میں بت پرستی کا دروازہ اِسی آثار پرستی سے کھلا، ابتداً میں یہ ہوا کہ بزرگ اور مقدس انسان نے دنیا سے انتقال کیا۔ اس کی محبت وارادت کی وجہ سے اس کی یا اس کے آثار وتبرکات کی لوگوں نے عزت وعظمت کرنا شروع کردی، عزت نے کچھ دنوں کے بعد اجلال وتعظیم کی شکل اختیار کی۔ اجلال وتعظیم، پرستش وتعبد کا ذریعہ بن گئی۔ جیسا کہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے سورۂ نوح کی تفسیر میں بسند صحیح فرمایا: انسانی پرستش کا اولین دروازہ یہی معاملہ ہے۔ اسلام دین آخری تھا، اِس لیے وہ ان تمام راہوں کو قطعاً بند کردینا چاہتا تھا، جو آگے چل کر شرک کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اِس لیے اس نے اِس طرح کی تمام باتیں روک دیں اور صرف روکی ہی نہیں بلکہ ان کے منع میں اِس قدر شدت واہتمام کیا کہ جس بات میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مشابہت یا وجہ اشتباہ پائی، اس کا فوراً سدّ اللذریعہ انسداد کردیا۔

پوری تفصیل اِس کی اس وقت آئے گی جب علوم وتحقیقات فرنگی محل کے نظارہ وتماشہ کے بعد اصل موضوع پر فرصت التفات ملے گی۔ یہاں صرف اِس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ بزرگوں کے آثار کی محبت وتعظیم کا افراط بھی منجملہ ذرائع شرک وتعبد غیر اللہ تھا۔ اس لیے اسلام نے اس کی روک میں بھی اہتمام بلیغ کیا اور اوائل میں مسلمانوں نے بوجہ قرب عہد جاہلیت جب کبھی کوئی ایسی بات کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سخت غضب ناک ہوئے اور بلا استثنا یہی حال خلفائے راشدین اور عہد صحابہ کا رہا۔

لیکن چونکہ یہ معاملہ نہایت نازک تھا۔ محبوب و مطاع کی محبت و تعظیم اور مبغوض و مطرود سے بغض و استکراہ طبیعت انسانی کا قدرتی مقتضا ہے اور نوع انسانی کے لیے راہ عمل کی سب سے بڑی آزمائش اسی میں ہے کہ فطری امیال و جذبات میں عدل و اعتدال ملحوظ رکھا جائے، نیز چونکہ اسلام سے پیشتر تمام قومیں انبیاء و اکابر کے قبور و آثار کو پرستش گاہ بنا چکی تھیں اور نسلاً بعد نسل اس بات کی عادت والفت، طبائع میں راسخ ہو چکی تھی۔ اس لیے اگرچہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معجزانہ قوت اصلاح و انقلاب سے توحید کامل اور دین اللہ الخالص پر لوگوں کو مستقیم کر دیا تھا، تاہم بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ لوگ جذبات عقیدت و محبت سے بے اختیار ہو کر کوئی ایسی بات کر بیٹھتے تھے جس سے بزرگوں کے آثار، منسوبات کو زیارت گاہ بنانے کی راہ کبھی نہ کبھی نکل سکتی تھی یا حد شرع سے متجاوز تعظیم و اجلال موصل الی الشرک کے ظہور کا اس میں امکان تھا لیکن عہد صحابہ میں اسلام کی روح علم و عمل پژمردہ نہیں ہوئی تھی اور اس کا سلطان و نفوذ دلوں پر حاوی تھا، اس لیے عامۃ الناس کے جذبات بھی ضبط و حدود شرع سے متجاوز نہیں ہو سکتے تھے اور جب کبھی کوئی ایسی بات کسی سے سرزد ہوتی تھی، تو ولاۃ امور فوراً اس کی روک تھام کر دیتے تھے۔ عوام کے یہ جذبات تعظیم و اجلال ہر حال میں قابل رد و منع نہیں ہوتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی ایسی بات کی جاتی جو فی نفسہ تو حد شرع سے متجاوز نہیں ہوتی تھی لیکن چونکہ اس کا امکان تھا کہ آگے چل کر یہی بات، حد شرع سے متجاوز تعظیم و اجلال کا ذریعہ بن جائے اور صحابہ کو معلوم تھا کہ گزشتہ اقوام خصوصاً اہل کتاب کے مبتلائے شرک ہونے کی راہ بھی ابتداء میں ایسی ہی باتوں سے کھلی تھی، اس لیے وہ فوراً چونک اٹھتے اور ایسی باتوں کو بھی بڑے زور اور اصرار سے سد الذریعہ روک دیتے تھے۔

من جملہ اِس طرح کے واقعات کے وہ دو واقعے بھی ہیں، جن کا کچھ عجب طرح کی تحریف و تخبیط کے ساتھ مولانا[۱۳] نے ذکر کیا ہے۔ پہلا واقعہ شجر بیعت رضوان کا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام سے بیعت جہاد لی، تو وہ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ اِس لیے وہ بیعت، درخت والی بیعت کے نام سے اس وقت مشہور ہو گئی تھی۔ سورۂ فتح میں اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (۱۸:۴۸)

یعنی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا جبکہ وہ ایک درخت کے نیچے تیرے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔

یہ درخت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت تک موجود تھا لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام و بیعت کی وجہ سے اِس جگہ کو متبرک سمجھنے لگے اور بہ نیت تبرک اس کا قصد کرتے اور اس کے نیچے نماز پڑھتے ہیں تو انہوں نے حکم دیا کہ اسے جڑ سے کٹوا کر پھینک دیا جائے تا کہ اس کا اور اس جگہ کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے چنانچہ امام احمد اور طبرانی نے عیسیٰ بن یونس سے روایت کی ہے کہ:

اَمَر عُمر بقطع الشجرة التی بویع تحتها النبی صلی الله علیه وسلم فقطعها لئن الناس کا نوایذهبون فیصلوّن تحتها فخاف علیهم الفتنة .

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ وہ درخت اُکھاڑ دیا جائے، جس کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی تھی۔ کیونکہ لوگ وہاں جانے لگے تھے اور اس کے نیچے نماز پڑھتے تھے، پس انہیں فتنہ کا خوف ہوا، اِس لیے اسے کٹوا دیا۔ (انتہیٰ) اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اِس درخت کے باقی نہ رکھنے میں یہ مصلحت تھی کہ آگے چل کر مسلمانوں کے لیے فتنے کا موجب نہ ہو جائے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انتساب کی وجہ سے لوگ اس کی تعظیم و اجلال نہ شروع کر دیں۔

اِس روایت سے معلوم ہوا کہ:

ا۔ بیعت رضوان والا واقعہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی عظیم الشان واقعہ تھا۔ یہ درخت اِس واقعہ کی یادگار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اِس درخت کا ذکر کیا تھا اور اِس طرح قیامت تک کے لیے اس کا تذکار، تاہم جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اِس انتساب کی وجہ سے اس نے عوام کی نظروں میں خصوصیت حاصل کر لی ہے اور لوگ تبرک کے خیال سے اس کے نیچے آتے اور اس کا قصد کرتے ہیں، اسے کٹوا دیا اور تمام مجمع صحابہ رضی اللہ عنہا نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور جیسا کہ اصول میں طے پا چکا ہے اس سے صحابہ رضی اللہ عنہا کا اِس عمل پر اجماع تقریری ثابت ہو گیا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہا کا زمانہ بعد کا

زمانہ فساد نہ تھا جب کہ سلاطین و امراء قوت و استبداد سے اپنی باتیں منوا لیتے تھے اور علمائے دنیا خاموش رہ جاتے تھے۔ وہ کوئی غلط عمل خاموشی کے ساتھ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

۲۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اِس باب میں شرعاً جو حالت مخدوش ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے مقامات کی زیارت کا لوگ قصد و اہتمام کرنے لگیں۔ قصد و اہتمام سے مقصود یہ ہے کہ مقدس انتساب کی وجہ سے اسے ایک مقدس مقام یقین کر کے خاص اس کی زیارت کے لیے لوگ جائیں اور سمجھیں کہ اس سے انہیں ثواب اور برکت حاصل ہوگی لیکن اگر اس حد تک معاملہ نہیں پہنچا ہے اور لوگ ایک مقام کو محض ایک یادگار کی حیثیت سے پہچانتے ہیں اور اِس پہچان کی وجہ سے ان میں صاحبِ یادگار کی محبت و عزت کے جذبات بھی حرکت میں آتے ہیں اور جب کبھی اس پر گزر ہو جائے تو اسے دیکھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں، تو اِس حد تک کوئی مضائقہ نہیں۔ شریعت ایسی یادگاروں کی مخالف نہیں ہے۔ چنانچہ آگے چل کر واضح ہوگا کہ یہ درخت اِس حیثیت سے برسوں تک معروف رہا مگر صحابہ رضی اللہ عنہا کو کٹوانے پر توجہ نہ ہوئی کیونکہ تعظیم و تبرک کا معاملہ حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہوا تھا لیکن جوں ہی متجاوز ہوا، فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکے اور حکم دیا جڑ سے کٹوا کر زمین اس طرح صاف کر دو کہ آئندہ یہ جگہ لوگوں کو ڈھونڈنے سے نہ ملے۔

۳۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ معاملہ شریعت کی نظروں میں کس درجہ اہم ہے؟ اور ذرائع و وسائل کے انسداد میں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو کہ اسرار شرع کے محرم راز تھے، کس درجہ اہتمام بلیغ تھا؟ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت ان بدع و رسوم کا مسلمانوں کو وہم و گمان بھی نہیں گزرا تھا جو بعد کو غیر اقوام کے اختلاط و اتباع سے ان میں پھیلے۔ لوگوں نے اس درخت کے پاس کوئی عمارت یا گنبد نہیں بنایا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کی جگہ گھیر کر اسے سنگ مرمر سے نہیں پاٹ دیا تھا۔ چاندی کا کوئی کٹہرا نہ تھا زرکار اور منقش چادر وہاں نہیں ڈالی گئی تھی۔ پھول نہیں چڑھائے جاتے تھے گلاب سے دھو کر اس کا پانی بطور تبرک کے نہیں بٹتا تھا۔ جھاڑ فانوس اور بخور دانیاں وہاں نہ تھیں۔ لوگ آ کر اسے بوسہ نہیں دیتے تھے۔ رجعت قہقری کر کے واپس نہیں ہوتے تھے۔ ہاتھ باندھ کر تعبد و ابتہال اور خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ ایک دربار شاہی اور معبد کی طرح وہاں سر و سامان درست نہیں کیا تھا۔ پھر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگ اپنی تکلیفوں اور

احتیاجوں میں اس کی منتیں نہیں مانا کرتے تھے۔ چڑھاوے اور نذرانے نہیں چڑھاتے تھے۔کوئی خاص دن ان کی زیارت کا مقرر کر کے (جسے اصطلاح رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عید کرنا کہا گیا ہے) وہاں مثل موسم حج کے اجتماع نہیں ہوتا تھا اور لوگ اپنے حوائج کی طلب نہیں کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ ایک عظیم واقعہ اور ایک عظیم و مقدس انسان کی یادگار سمجھ کر لوگ بہ نیت تبرک و ثواب اس کا قصد کرتے اور وہاں جا کر بجائے مدع و رسوم اور خرافات کے نماز پڑھتے، جو افضل العبادات و اعمال ہے لیکن چونکہ اس بات میں بھی اس کے زیارت گاہ بن جانے کا دروازہ کھلتا تھا اور ایسے مقامات کا خصوصیت کے ساتھ قصد و اہتمام کرنا ہی ہر طرح کی خرابیوں کی بنیاد تھا، اس لیے صحابہ کرام نے سداً للذریعہ فوراً اس کا انسداد کر دیا پھر خدارا وہ دل جن پر تقلید آبا اور الفت رسوم نے ابھی اس درجہ قبضہ نہیں کیا ہے کہ فوراً ایمان و شرع بکلی مجوب ہو جائے، انصاف کریں کہ اگر آج صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین وہ تمام باتیں دیکھتے، جو یادگاروں اور قبروں پر کی جا رہی ہیں تو ان کا کیا حال ہوتا اور وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا بقا گوارا کر سکتے؟

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو برائی جس درجہ قوی و عام ہوتی ہے، اتنی قوت اور شدت کے ساتھ اس کا دروازہ بھی بند کرنا پڑتا ہے۔ برائیوں کے اصلاح و انسداد میں شارع کے تمام احکام و اعمال میں یہ اصل عظیم نظر آئے گی۔ چونکہ محبت اور تعظیم کا معاملہ انسانی قلب کے لیے نہایت نازک واقعہ ہوا ہے اور کوئی قوم راہ توحید و دین الخالص سے نہیں بھٹکی مگر محبت اور تعظیم کی بے اعتدالی سے، اس لیے اسلام اور شارع اسلام نے اس کے انسداد کے لیے بھی کمال شدت و اہتمام کیا اور ایک چھوٹا سا سوراخ بھی کہیں کھلا نظر آیا تو فوراً اسے بند کیا۔ یہی حال صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کا تھا۔

۴۔ اس معاملے میں اکثر معاملات کی طرح دو چیزوں کا مقابلہ تھا، ایک طرف فائدہ تھا۔ دوسری طرف نقصان تھا۔ فائدہ یہ تھا کہ کسی اہم اور مقدس معاملے کی یادگار کا باقی رہنا مفید ہے۔ یہ ہمیشہ آنے والی قوموں کو اس کی یاد دلاتا ہے اور ان کے جذبات و عواطف کے لیے عبرت و تذکرہ کا موجب ہوتا ہے۔ یہ درخت تاریخ اسلام کے ایک عظیم الشان واقعہ کی یادگار تھا، جس نے فی الحقیقت فتح مکہ کی راہ کھولی، جو بانیٔ اسلام کی آخری فتح عظیم اور کاروبار دین کی تکمیل تھی۔ ایسی یادگار کا قائم رہنا، اسلامی فتح عظیم کے ایک بنیادی واقعہ کے تذکار کا باقی

رکھنا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایک نقصان تھا یعنی لوگوں نے فرطِ اعتقاد و تعظیم سے اس کی خصوصیت کے ساتھ زیارت شروع کر دی تھی۔ وہاں جانے اور نماز پڑھنے میں غیر معمولی اہتمام کرنے لگے تھے۔ اگر یہ حالت گوارا کر لی جاتی تو ایک بہت بڑے شرعی نقصان یعنی غیر شرعی زیارت گاہ کے بن جانے اور لوگوں کے شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کا دروازہ کھل جاتا۔ اب ضروری ہوا کہ فائدہ اور نقصان دونوں کو تولا جائے اور دیکھا جائے ۔باقی رکھنے کا فائدہ زیادہ ہے یا نقصان؟ ساتھ ہی اس اصل پر بھی غور کیا جائے کہ اگر کسی معاملے میں فائدہ اور نقصان، دونوں کا پہلو ہو تو رعایت دفع مضرت کی مقدم ہے یا جلب منفعت کی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو کہ حقائق شرع کے نکتہ شناس تھے اس کا فیصلہ کرنے میں کچھ دشواری پیش نہ آئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس درخت کے رکھنے میں فائدہ سے زیادہ نقصان ہے۔ نیز نقصان کا دفع کرنا فائدے کی تحصیل پر مقدم ہے۔ بس بلا تامل کٹوا دیا۔ ایسے ہی احکام و اعمال سے فقہائے امت نے یہ اصلِ عظیم مستنبط کی کہ دفع مضرت، جلب منفعت پر مقدم ہے۔

۵۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگوں کی تعظیم و احترام کا ایسے امور و معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور معیار اس باب میں وہ ہونا چاہیے جو خود ان کی تعلیم سے قرار دیا گیا ہو اور شریعت نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہو، نہ کہ وہ اوہام و وساوس جو بہ اسم احترام اکابر ہم نے اپنے جی سے گڑھ لیے ہیں۔ غور کرو! مسلمانوں کے لیے اس دنیا میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مقدس و مبارک سے بڑھ کر مستحق تعظیم و احترام کون وجود ہو سکتا ہے۔ جس کی تعظیم خدا نے ہر مسلمان پر بحکم وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ فرض کر دی ہے اور جن کی بے احترامی کا ارادہ کرنا بھی ایک مسلمان کے لیے بدترین کفر ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین خصوصاً خلفاء راشدین سے بڑھ کر اس وجود اقدس کی تعظیم کرنے والی اور کون سی جماعت علی وجہ الارض ہو سکتی ہے؟ انہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کی آوازِ خلقی طور پر اونچی تھی۔ بات کرتے تو معلوم ہوتا پکار رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور چیخ کر بات کر بیٹھے۔ ایک روایت کے بموجب اس رفعِ صوت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ اس پر سورہ الحجرات کی یہ آیت اتری:

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ ۔
کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ (۴۹:۲)

راوی کہتے ہیں جس دن یہ آیت اُتری، اس کے بعد سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حال ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بات کرتے اِس قدر آہستہ اور نرمی سے گویا کوئی راز کی بات کان میں کہی جارہی ہے۔ صحیح بخاری میں بروایت ابن ابی ملیکہ ہے:

اذا حدّث النبی بحدیث حدّثه کمافی السرار و لم یسمعه‘
حتیٰ یستفهمه.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرمانے کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ مسجد نبوی میں جاتے تو قبر مطہر کے قرب کی وجہ سے بسبب کمال تعظیم وادب منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ آدمی کو وہاں پکار کر بات کرتے دیکھتے تو سخت غضب ناک ہوتے اور فرماتے:

ترفعون اصواتکم فی مسجد رسول الله ؟

بایں ہمہ انہی حضرت نے جب دیکھا کہ اِس تاریخی درخت کی لوگوں نے بالقصد واہتمام زیارت کرنی شروع کر دی ہے اور بہ نیت تبرک وہاں جا کر نماز پڑھتے ہیں تو انہوں نے اس بات کی ذرا بھی پروانہ کی کہ یہ درخت اس ذات گرامی کی طرف منسوب ہے اور اس کی ٹہنیوں اور پتوں کے نیچے وہ ایک مرتبہ جلوس فرما ہو چکے ہیں اور اس لیے اس کا اُکھاڑ پھینکنا ان کی نسبت کی بے احترامی ہوگی بلکہ بلا تامل اُکھاڑ ڈالنے کا حکم دے دیا اور تمام صحابہ میں سے کسی نے بھی اِس پر اعتراض نہیں کیا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا ادب واحترام کے خلاف نہیں ہے بلکہ ادب واحترام کا عین مقتضا ہے۔ بزرگوں کی سچی تعظیم یہ نہیں ہے کہ ان کی یا ان منسوبات کی پرستش کی جائے یا ایسی باتیں کی جائیں جو پرستش کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ایسا کرنا تعظیم کی جگہ بے احترامی ہے اور اس کا ازالہ مقتضائے تعظیم ومحبت ہے نہ کہ اس کا ابقاء۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام وغیرہم انبیاء کرام کے مجسمے خانہ کعبہ میں توڑے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست مبارک سے تڑوائے۔ یہ ان انبیاء علیہم السلام کی تعظیم تھی، بے احترامی نہ تھی۔

پھر جب خود حضرت سرور عالم وشہنشاہ کونین کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کے لیے مانع ازالہ نہ ہوئی تو بتلاؤ ان سے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے کون ہے اور کس کی نسبت اور یادگاریں ہوسکتی ہیں؟

۶۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس مقام اور چیز کی نسبت ایسا خطرہ لاحق ہو جائے، بہتر ہے کہ اسے اس طرح معدوم کر دیا جائے کہ اس کا نام ونشان باقی نہ رہے اور آگے چل کر اگر گمراہ طبائع اس کا کھوج لگانا چاہیں اور زیارت گاہ بنانی چاہیں، تو اس کا کوئی موقع باقی نہ رہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگرچہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ لوگوں کو روک دیں یا اور کوئی ایسی بات روک تھام کی مع بقائے شجر کر دیں لیکن آپ نے یہ نہیں کیا بلکہ جڑ سے اکھڑوا کر زمین صاف کر دی تاکہ اس موضع اور درخت کا نام ونشان ہی باقی نہ رہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا ہی حضرت دانیال علیہ السلام کی حنوط (ممی) کی ہوئی نعش کی تدفین میں کیا تھا جبکہ وہ تستر سے برآمد ہوئی تھی اور کوئی علامت قبر کی باقی نہیں چھوڑی تھی۔

۷۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اگر لوگوں نے کسی ایسی یادگار پر عمارت بنا کر اسے ایک مستحکم اور دائمی زیارت گاہ بنا دیا ہو اور قصد واہتمام کے ساتھ لوگ اس کی زیارت کرتے ہوں تو بدرجہ اولیٰ اس کا گرا دینا بھی ضروری ہوگا، کیونکہ درخت کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے لوگوں نے بہ نیت تعظیم واجلال بنایا ہو۔ ایک خودرو چیز تھی جو بیعت رضوان سے نہیں معلوم کتنے برس پہلے سے موجود تھی، تاہم اسے اکھڑوا دیا گیا، پس جب درخت کے ساتھ ایسا کیا، جس کی بنا بہ نیت تعظیم وزیارت نہیں تھی تو اگر لوگوں نے بالقصد کوئی عمارت اسی غرض سے کھڑی کی ہو، تو اس کا انہدام تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگا، کیونکہ وہ خاص اسی غرض سے بنائی گئی ہے اور اپنی تعمیر ہی میں خلاف شرع اور موجب فتنہ ہے۔

لطیفہ

اس کے بعد مولانا نے سرخی لکھی ہے "لطیفہ" اور عجیب ظرافت وطنز سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

یہاں ایک لطیفہ اہل ذوق کے تفنن طبع کے لیے لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا عبدالباری نے لکھنؤ میں ایک جلسہ امیر ابن سعود کے خلاف منعقد کیا تھا اور اس میں اپنی ایک تحریر پڑھوائی تھی۔ اس میں گنبدوں کے لیے لکھتے ہیں گنبد مقابر پر سے اتارے جاسکتے ہیں مگر ادب وتعظیم کے ساتھ۔

اِس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ شور وغل ہے، گنبد اتارنے پر نہیں ہے کیونکہ وہ تو اتارے جاسکتے ہیں، اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ ادب وتعظیم کے ساتھ نہیں اتارے گئے۔ اول تو اِس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انہدام عمارت میں "ادب وتعظیم" کی رعایت سے حضرت کا مقصود کیا ہے؟

اگر عمارت ڈھائی جائے گی، تو ڈھائی ہی جائے گی خواہ کتنا ہی ادب و تعظیم ملحوظ ہو۔ بہر حال یہ تو نہ ہوگا کہ گلاب چھڑک کے یا پھولوں کی چھڑی چھوکر گرائی جائے۔ پھاوڑا اور کدال ہی چلانا پڑے گا اور جو کچھ ہوگا وہ ہدم و انہدام اور شکست و تخریب ہوگی۔ تعمیر و تکوین نہ ہوگی پھر اِس انہدام و تخریب میں طریق ادب و تعظیم اور شیوہ بے ادبی و بے احترامی کی تفریق کیونکر کی جائے اور اِس کا معیار و ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ مزید بر آں یہ نہیں معلوم کہ یہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت رضوان والا درخت جڑ سے کٹوا دیا، تو بقاعدہ جدیدہ فقہیہ فرنگی محل "ادب و تعظیم" کے ساتھ لوگوں نے اس پر پھاوڑا اچلایا تھا یا بے احترامی کے ساتھ؟ یقیناً یہ کسی روایت میں نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا ہو کہ با قاعدہ وضو کر کے اور تسبیح ہاتھ میں لے کر اور بخور دانی سلگا کر یا گلاب اور کیوڑہ چھڑکتے ہوئے درخت کاٹا جائے؟

آگے چل کر لکھتے ہیں:

اب ملاحظہ ہو حضرت کے علم و دیانت کا کیا حال ہے؟ ایک ایسے صاف اور قطعی الدلالت واقعہ کو جو ان کے خلاف از سرتا پا حجت پر حجت اور برہان پر برہان ہے، کس تعجب انگیز جرأت و بے باکی کے ساتھ توڑا مڑوڑا جا رہا ہے پھر بجائے اس کے کہ خود اس کا جواب دیں، خود ہی اپنے جی سے ایک بات گڑھ کر اور اسے مسلم الثبوت قرار دے کر ہم سے سوال کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درخت تو اکھڑوا دیا لیکن مآثر کی عمارتیں کیوں نہیں منہدم کرائیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ گویا ان کے عہد میں مآثر پر عمارت و مساجدِ زیارات کا ہونا ایک ایسا معلوم و محقق واقعہ ہے کہ اس کے لیے کسی اثبات کی ضرورت نہیں صرف ہم جیسے ناواقفوں کو یہ سمجھا دینا باقی رہ گیا ہے کہ انہیں منہدم کیوں نہیں کیا گیا اِس پر غور کرلیں: **سبحانک ھذا بھتان عظیم**۔

حقیقت یہ ہے کہ شیوع جہل اور فقدان امتیاز حق و باطل کی حد ہوگئی کہ ایسی صریح غلط بات کھلے بندوں نہ صرف بیان کی جا رہی ہے بلکہ اس سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ ہم اہل علم کے فہم و استدلال کی غلطی ظاہر کر سکتے ہیں لیکن یکسر غلط بیانی کے جواب میں بجز اس کے کہ سر پیٹ لیں اور کیا کر سکتے ہیں؟ میں کہتا ہوں پہلے خدارا! یہ تو ثابت کر دیجئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مآثر متبرکہ پر عمارتیں اور مسجدیں بنائی گئی تھیں اور لوگ بالقصد و اہتمام ان کی زیارت کیا کرتے تھے، اس کے بعد ہم سے سوال کیجئے گا کہ حضرت عمرؓ نے یہ کیوں نہیں گرائیں؟ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایسی عمارتیں تھیں ہی نہیں، تو گراتے کیسے؟ ہوا کو گراتے؟ عمارت کا اس نیت

سے تو گرانا بہت بڑی بات ہے، اِس کا تو صحابہ کو وہم و گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے تو یہ تک گوارا نہیں کیا کہ ایک درخت کا وجود بھی باقی رہے جو اِس نیت سے اگایا نہیں گیا تھا بلکہ پہلے سے موجود تھا اور صرف یہ ہوا تھا کہ بوجہ ایک مقدس انتساب کے عوام اس کے نیچے خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنے لگے تھے جب یہ صاف اور واضح عمل صحابہ کا موجود ہے تو اب دنیا کی کس سمجھ بوجھ میں اس سے ایسی اشیاء کا انہدام وانسداد ثابت نہیں ہوتا اور یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ بھلا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی چیزیں باقی کیوں چھوڑ دیں؟ یہ کیا عقل وبصیرت کا قتل عام ہے۔ آخر کوئی بتلائے انہوں نے باقی کہاں چھوڑیں؟ ایک درخت سے اِس طرح کا کھٹکا ہوا تھا، اسے جڑ سے اکھڑوا پھنکوایا۔ خدارا معتقدین اور مریدین مولانا صاحب انصاف کریں کہ ایسے جہل وکوری کے ساتھ انسان کیا کرے؟ کپڑے پھاڑ ڈالے یا در و دیوار سے سر ٹکرائے؟

اگر مولانا صاحب کا طریق اثبات واستدلال یہی ہے تو پھر شریعت کا خدا حافظ اور علم وعقل کو ہمیشہ کے لیے الوداع:

چشم اگر این است ، ابروایں ، و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش وتقویٰ ، الوداع اے عقل ودیں!

اگر چند دن تک اور سلسلہ بحث وتحریر جاری رہا تو عجب نہیں کل کو مولانا بہ کمال ثقاہت و سنجیدگی ہم سے یہ سوال بھی کر بیٹھیں کہ کیوں جناب اگر آثر و مقابر پر چراغاں کرنا، چادریں چڑھانا، گلاب سے غسل دینا، سالانہ عرس کرنا، عرس میں ڈھولک اور سارنگی کے ساتھ قوالوں خصوصاً محلّہ فرنگی محل کے زنانوں اور امارِدو متشبہین کا کنگھی چوٹی اور سرمہ کاجل سے آراستہ اور گلبدن اور بنارسی سے پیراستہ ہو کر حاضر ہونا اور تھرک تھرک کر اور مٹک مٹک کر گانا اور میرا عالم تواجد و تراقص میں آ کر اپنا عمامہ سیاہ تبرعاً عطا کو دینا مستحسن ومشروع نہیں ہے، جو میں بحمد اللہ ہر سال کیا کرتا ہوں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود اپنے "تشدد" کے کیوں یہ تمام اعمال مسنونہ و ماثورہ اپنے عہد میں بند نہیں کر دیے، فرمایئے اگر ایسا ہوا تو پھر ہم بدبختوں کے پاس جواب کیا ہوگا؟ بجز اس کے کہ اپنا سر پیٹ لیں اور بن پڑے تو کسی گوشے میں جا کر اسلام اور مسلمانوں کے مصائب پر ماتم کریں:

بکینا علیٰ الذنوب زمانا فالآن نبکی علی الاسلام :

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی القلب اسلام و ایمان!

حواشی

۱ فروری ۱۹۲۰ء میں ٹاون ہال کلکتہ میں منعقد ہوئی۔

۲ نواب علی حسن خان صاحب آف بھوپال

۳ اسی احمد زکریا کو، جو اس وقت اتنا مغرور تھا، بعد میں جوتیاں چٹخاتے میں نے خود دیکھا!

۴ مرحوم، مولانا کے سالے تھے۔

۵ ترکی حکومت نے جاری کیا تھا تا کہ انگریزی مقبوضات خصوصاً ہندوستان میں انقلاب برپا کیا جائے۔

۶ موصوف، ندوۃ العلماء کے خلاف "جدوہ" تحریک کے ایک بڑے لیڈر تھے۔ ندوہ کی مخالفت میں سفر کرتے ہوئے ریل سے کٹ کر فوت ہو گئے۔

۷ مولانا خدمت کے لفظ کو خذمت ذال، سے بولا کرتے تھے۔

۸ میں مصر میں چار سال رہا۔

۹ یہ جہاز پہلی جنگ کے دوران میں کناڈا سے آیا اور بج بج میں رُکا۔ مسافر ہندوستانی انقلابی تھے۔ انگریزوں نے گرفتار کرنا چاہا تو وہ لڑے۔ بابا گردت سنگھ ان کے لیڈر تھے۔

۱۰ موصوف بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ مولانا مدنی مرحوم کے ساتھی۔ کانکی ناڑہ میں قیام تھا اور مسلمانوں کے لیے بہت مفید تھے۔

۱۱ مولانا نے کبھی مجھے نہیں بتایا کہ انگریزی انہوں نے کس طرح سیکھی۔

۱۲ مولانا ملیح آبادی مرحوم، مولانا آزادؒ کی رفاقت میں ان کا اصرار پر ۱۹۴۹ء میں کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گئے تھے اور ۱۹۵۸ء تک دہلی میں رہے۔ مولانا آزادؒ کے انتقال پر کلکتہ واپس چلے آئے تھے۔ (احمد سعید ملیح آبادی)۔

۱۳ مصر والوں کے جیسے دیوتا ہیں، ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لیے بھی بنا دو۔

۱۴ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے دین پسند کر لیا۔

۱۵ خبردار اپنے دیوتاؤں سے دست بردار نہ ہونا، نہ وُدّ سے نہ سُواع سے نہ یغوث و یعوق اور نسر سے۔

۱۶۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے دوست یا بھائی سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھکے؟ فرمایا۔ نہیں۔ عرض کیا اس سے معانقہ کرے اور چومے؟ فرمایا نہیں۔ عرض کیا اس کا ہاتھ تھامے اور مصافحہ کرے؟ فرمایا۔ ہاں۔

۱۷۔ یہ حالات ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۸۔ ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی''

۱۹۔ ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کے رکن انور پاشا وغیرہ۔

۲۰۔ مصنفہ ڈاکٹر اقبال مرحوم۔

۲۱۔ مؤتمر اسلامی (مکہ) میں میری شرکت طے ہو چکی تھی۔

۲۲۔ اردو میں عربی، فارسی الفاظ کی بھرمار کا میں اس وقت بھی مخالف تھا، اب بھی ہوں۔

۲۳۔ عطف سے پہلے کا ما غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۲۴۔ معین الدین مرحوم مولانا کی سالی کا لڑکا۔ بڑا ہونہار اور صالح نوجوان تھا۔

۲۵۔ دیکھیے ''آزاد کی کہانی'' از ملیح آبادی۔

۲۶۔ مسٹر حسین شہید سہروردی کے چچا: سر عبداللہ سہروردی اور ڈاکٹر سر حسان سہروردی۔

۲۷۔ مولانا نے عدالت میں جو بیان دیا تھا (قول فیصل) اس کا عربی میں ترجمہ میں نے کیا اور مصر میں چھپا۔ عمر رضا نے اسی ترجمے کو ترکی زبان میں منتقل کر کے شائع کیا۔

۲۸۔ ثقافت الہند، ص ۱۴، جون ۱۹۹۱ء

۲۹۔ ثقافت الہند، ص ۶۳، جون ۱۹۹۱ء

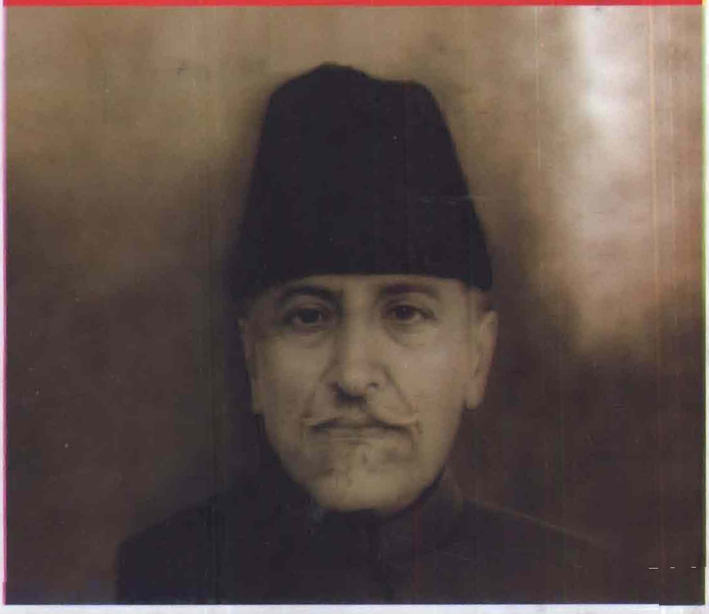
۳۰۔ ثقافت الہند، ص ۱۱۷، جون ۱۹۹۱ء

۳۱۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی (مرحوم)

ذکرِ آزادؒ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رفاقت میں (۳۸) اڑتیس سال

عبدالرزاق ملیح آبادی



مکتبۂ جمال

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Mob. 0300-8834610 Tel .042-7232731

maktaba_jamal@email.com/maktabajamal@yahoo.co.uk